یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔ تعلیمات اسلامی اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامان اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ سرمایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم۔ خلافت بنی امیہ

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت جلد چہارم۔ خلافت ہسپانیہ۔ تاریخ ملت حصہ پنجم خلافت عباسیہ اول۔

۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات۔ حکمائے اسلام کے تابناک کارنامے (کامل) تاریخ ملت حصہ ششم خلافت عباسیہ دوم۔ بصائر

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ۔ تدوین قرآن۔ اسلام کا نظام مساجد۔ اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم۔ خلافت عثمانیہ۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے) کتابت حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ تاریخ ملت جلد نہم تاریخ صقلیہ

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام۔ تاریخ ادبیات ایران۔ تاریخ علم فقہ۔ تاریخ ملت حصہ دہم۔ سلاطین ہند اول۔ تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی۔

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد سوم۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات۔

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم۔ صدیق اکبرؓ۔ تاریخ ملت حصہ یازدہم۔ سلاطین ہند دوم۔ انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد۔

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ تاریخ گجرات۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ مکاتیب سرور کونینؐ۔

جلد ۱۰۷	جمادی الثانی و رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق جنوری و فروری ۱۹۹۱ء	شمارہ ۱-۲

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

بالآخر وہ منحوس گھڑی آہی گئی جس کا خوف و دہشت کے ملے جلے اثرات کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی انتظار تھا۔ کویت پر عراقی قبضہ کا بہانہ بنا کر امریکہ کی قیادت میں مغربی اور بعض عرب و ایشیاء کے ممالک کی مشترکہ فوجوں نے عراق پر حملہ کر دیا۔ ان سطور کی تحریر کے وقت تک اس لگاتار حملہ کو دوسرا ہفتہ ہو چکا ہے۔ دونوں طرف سے زبردست ہوائی ذرائع سے بھیانک بمباری ہو رہی ہے۔ امریکہ اور اس کے ساتھی ملکوں نے پہلے ہی جو حملہ کیا تھا وہ اس قدر زبردست تھا کہ دنیا والے اسے سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ ڈھائی ہزار ہوائی جہازوں کی اڑانوں سے تقریباً ۱۸ ہزار ٹن گولہ بارود سے بھرے بم عراق کے فوجی ٹھکانوں کو تہس نہس کرنے کے لیے پھینکے گئے۔ اب تک ایک معتبر اخباری رپورٹ کے مطابق ۱۲ ہزار ہوائی حملے عراق پر ہو چکے ہیں۔ امریکہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے ہوائی حملوں کے ذریعہ عراق کی ہوائی طاقت کو کچل ڈالا ہے لیکن اس کے بعد جب عراق کی طرف سے جوابی حملے کیے گئے اور سعودی عرب و اسرائیل کے علاقوں میں عراقی میزائلوں نے قہر ڈھایا تو امریکہ کے اس دعویٰ کا کھوکھلا پن سامنے آگیا۔ اور دنیا کے لوگ یہ دیکھ کر دنگ ہی رہ گئے کہ جس امریکہ کے بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور سودیت روس

بدحالی وخستہ وکمزوری کے سامنے آنے کے بعد اس خیال میں زیادہ وزن پیدا ہوگیا تھا کہ امریکہ کے آگے اب کوئی دوسرا ملک نہیں ٹھہر سکے گا۔ عراق ابھی تک امریکہ اور اس کی ساتھی فوجوں کے آگے ڈٹا ہوا ہے۔ اور پوری جانفشانی کے ساتھ مقابلہ کر رہا ہے۔ اس نے جدید ساز وسامان سے لیس امریکی و برطانوی ہوائی جہازوں کے کئی پائلٹوں کو زندہ گرفتار کر کے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ انہیں دنیا کے سامنے پیش بھی کر دیا ہے۔ عراق نے امریکہ کے ان دعوؤں کی بھی دھجیاں ہوا میں بکھیر دی ہیں کہ اس نے عراق کی ۹۰ فیصدی ہوائی طاقت ہی کو ختم کر دیا ہے۔ اسرائیل پر جب عراق کی مزائلیں گریں تو امریکہ کا جھوٹ سامنے آگیا۔ امریکہ کے اسرائیل کو دیے گئے تمام دفاعی ساز وسامان کی موجودگی میں اسرائیل پر عراق کے کامیاب حملوں نے امریکہ کا جو بھرم تھا اس نے ختم کر دیا ہے اور اب امریکہ کے بارے میں عوام الناس کی رائے ہے کہ ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا

---

۲ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق نے کویت پر یہ الزام لگا کر کہ وہ اس کی سرحدوں کے کنوؤں سے تیل چوری کر رہا ہے، قبضہ کر لیا۔ اس پر تمام دنیا میں عراق کے خلاف واویلا مچنا شروع ہو گیا۔ سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں عراق کی اس کارروائی کی مذمت کی گئی۔ اس کے بعد لگاتار عراق پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ کسی طرح کویت خالی کر دے اس کی ناکہ بندی بھی کر دی گئی۔ تمام ملکوں نے ایک زبان ہو کر عراق کا اقتصادی بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ بھی کیا مگر عراق

اس کے باوجود کویت پر اپنے قبضہ کو ہٹانے کے لیے ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اس نے ان سب باتوں کے جواب میں ۸ ؍اگست ۱۹۹۰ء کو کویت کو عراق کا ایک صوبہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عراق کا کویت پر قبضہ کو فلسطین کے مسئلہ سے بھی منسلک کر دیا۔ کویت پر اس طرح عراق کے غاصبانہ قبضہ سے تمام دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اور عراق جب بھاری دباؤ میں آ گیا تو اس نے کہا کہ اگر اسرائیل عربوں سے چھینے گئے علاقے خالی کر دے اور مسئلہ فلسطین حل کر دیا جائے تو وہ بھی کویت خالی کرنے میں پس و پیش نہیں کرے گا۔ لیکن اس کا مغربی اقوام پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ صرف یہی کہتی رہیں کہ عراق کویت خالی کرے، بلا شرط۔

خلیجی جنگ کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر ہم عقل و دانش اور سمجھ کے دروازے بند کر کے صرف جذبات ہی کے سہارے اظہارِ خیال کریں تو ہم بلا مبالغہ یہ کہیں گے کہ عراق کے صدر صدام حسین نے جو کام کیا ہے وہ عالم اسلام کی خواہشات کے عین مطابق ہے۔ صدام حسین مردِ آہن ہی نہیں مردِ مومن ہیں۔ انھوں نے امریکہ اور اس کی حلیف طاقتوں سے لڑائی مول لے کر ایک سچے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اپنی بات پر اڑے رہ کر ایک مومن مسلمان ہونے کا حق انھوں نے منوا لیا ہے۔ جو کام سارے عرب ممالک مل کر نہ کر سکے وہ انھوں نے اپنے اکیلے بل بوتے پر کر دکھایا ہے۔ عرب ممالک ایک اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کی بجائے اس سے ہمیشہ پٹتے ہی رہے ہیں اور عراق کے صدر صدام حسین نے مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس کی ناجائز اولاد اسرائیل کو سبق سکھانے کے لیے میدانِ عمل

میں کود پڑنے کا عزم مصمم کر ڈالا مسلم دنیا کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی طرح کا ایک جاں باز مردِ مجاہد صدام حسین کی صورت میں مل گیا

لیکن سنجیدگی اور عقل و دانش کے میدان میں جب کوئی بیٹھا ہوگا تو ایسے مسئلہ کے ہر پہلو پر باریکی سے غور و خوض کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا گا اور پھر اسے خالی جذبات ہی کی ڈوری کو پکڑ کے کسی مسئلہ پر اظہار خیال کرنا غیر مناسب بات معلوم دے گی۔ جذبات کے ساتھ ہوش اور عقل و دانش کی بھی بات سوچنی ہوگی اور عقل و ہوش و سمجھ کی رسی کو پکڑے رکھ کر اظہار خیال کرنا ضروری ہوگا۔ چنانچہ جب عقل و ہوش کے آئینے میں سوچتے ہیں تو ہمیں خلیجی جنگ اور عراق کے صدر صدام حسین کے بارے میں ہمارے دماغ میں ہزاروں دوسرے خیالات ہی پرورش کے ساتھ ایک یہ بھی خیال پرورش پانے لگتا ہے کہ کہیں مغربی طاقتوں کے کھیل میں عراق کے صدر صدام حسین ہی تو خود کوئی رول ادا کرنے کے باعث تو نہیں بن رہے ہیں۔ اس خیال کی مضبوطی کے لیے ہی ہمارے پاس ڈھیر سارے ماضی کے واقعات کے پلندے بکھرے پڑے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطینی مسلمانوں سے زمینیں چھین کر مسلم عربوں کے درمیان یہودیوں کے لیے اسرائیل نام کا ملک قائم کرنے میں برطانیہ امریکہ و فرانس اور سوویت روس پیش پیش تھے۔ ان سب کے پیش نظر اسلام کے پھیلاؤ کو روکنا ان ملکوں کے تیل کے ذخائر اپنے قبضہ و تحویل میں رکھنا اور اسلامی طاقت پر ضرب کاری لگانا اصل مقصد تھا۔ ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۳ء کی چاروں جنگوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی ملکوں کے ساتھ سوویت روس کا بھی نظریہ اسرائیل کے ذریعہ

اسلامی دولت و طاقت کو محدود بلکہ صاف لفظوں میں عضو معطل کر کے رکھ دیتا ہے۔ ۱۹۷۳ء کی عرب و اسرائیل جنگ کے بعد مصر، شام، سعودی عرب سمیت سارے چھوٹے بڑے عرب ممالک نے امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ مصر نے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ کر کے سنائی کا اپنا علاقہ اسرائیل سے واپس لے لیا۔ اب کوئی عرب ملک اسرائیل کے لیے چیلنج نہ رہا تھا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں اسرائیل کے خلاف کمر کس کر میدان میں دکھائی دینے والا آیت اللہ خمینی کی رہنمائی میں ایران ابھرا اور اس نے مغربی طاقتوں کو للکارا۔ اسلامی انقلاب کا زور و شور سے نعرہ بلند کر کے اسرائیل کے وجود کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ لیکن زیادہ وقت گذرا نہیں کہ ہم نے دیکھا کہ امریکہ کی شہہ پر عراق نے ایران سے لڑائی مول لے لی۔ آٹھ سال سے بھی زیادہ عرصہ تک عراق و ایران آپس میں نبرد آزما رہے اور اس طرح دونوں ہی کی طاقت آپس کی لڑائی میں برباد ہو کر رہی۔ اسرائیل اس درمیان میں اپنے کو محفوظ سمجھتے ہوئے آرام و چین کی نیند سوتا رہا۔ لیکن تب ہی موقع غنیمت جان کر اسرائیل نے عراق کی پیٹھ میں ایک خنجر گھونپ دیا۔ عراق کا ایٹمی ری ایکٹر اس نے پل بھر میں برق رفتاری کے ساتھ تباہ کر دیا۔ ایران کو عراق نے تباہ کیا اور عراق کی جو طاقت تھی اسے اسرائیل نے تباہ کر دیا۔ یہ امریکی چال و سازش کا ایک حصہ ہے۔ اسے کسی بھی مسلم طاقت کو کسی بھی طرح پنپنے دیکھنا گوارہ نہیں ہے مغربی مغربی طاقتوں کے لیے عیسائیت کے لیے اسلامی سرزمین کی بیخ کنی ضروری تھی۔ کیونکہ اسلامی ممالک کے پاس تیل کی دولت کی ریل پیل تھی۔ ان ملکوں میں بھی اس دولت نے اپنا کمال رکھانا شروع کر دیا تھا۔ جہاں مذہب کو نکال کر باہر پھینک دیا گیا تھا سوویت روس اور چین جیسے ملکوں میں مساجد کی

بحالی اور اسلامی تبلیغ و نشر و اشاعت کے مراکز کے قیام ہماری اس بات کی تصدیق کرتے ہیں مغربی طاقتوں (جن کا مذہب عیسائیت ہے) کے لیے یہ چیز کیسے قابل قبول ہوسکتی ہے۔ ان کی چال شاید یہ ہو کہ عراق اپنی کسی نادانی یا غلطی کی وجہ سے اپنی رہی سہی طاقت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور اس کے ساتھ عالم اسلام میں اتحاد و اتفاق کا شیرازہ بکھر جائے اور یہ اسلامی ممالک آپس میں لڑ بھڑ کر اپنے کو تباہ کرلیں۔ (ایران و عراق کی آپسی جنگ ان کے لیے مثال ہے) اور پھر برسوں اپنی تباہی و بربادی ہی کو درست کرنے میں لگے رہیں۔ اسلامی نشر و اشاعت و تبلیغ وغیرہ کے کاموں کے کرنے کی طرف انھیں اپنی بربادی کے آگے وقت ہی نہ مل سکے اور نہ ہی ذرائع و اسباب ہی میسر ہوں اور اس درمیان میں دنیا میں عیسائیت کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع مہیا ہو جائے اور اسلام رفتہ رفتہ قصۂ پارینہ بن جائے۔

اگر یہ بات درست نہیں ہے کہ عراق اور اس کے صدر صدام حسین مغربی طاقتوں کی کسی درپردہ سازش کا کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہے ہیں اور ہماری دعا ہے کہ یہ بات درست ہی نہ ہو تب بھی ہم اتنا ضرور کہنے کی جسارت کریں گے کہ عراق نے کویت پر قبضہ کر کے کوئی اچھی بات نہیں کی ہے۔ اور اگر اس نے عراق کی توسیع پسندی کے خیال سے قبضہ کر ہی لیا تھا تو مغربی طاقتوں کے تیور دیکھ کر اسے اپنی کسی دوسری شرط کو منوا کر آسانی اور باعزت طریقہ سے کویت خالی کر دینا چاہیئے تھا اور پھر مغربی طاقتوں کی ناانصافی و بےایمانی کا جواب دینے اور ناجائز اور غصب کیے ہوئے عربوں کے علاقے اور فلسطینیوں کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے اسرائیل

پر حملہ کرنا چاہئے تھا۔ اس سے تمام مسلم ممالک اس کے ساتھ ہوتے اور وہ دنیا میں الگ تھلگ ہو کر نہ رہ جاتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی طاقت اس کے اپنے بھائیوں جیسے سعودی عربیہ، ترکی یا مصر و شام وغیرہ پر حملے کرنے کی صورت میں صرف ہونے سے بچ جاتی۔ دیگر سعودی عرب کو اپنی سرزمین پر امریکہ، برطانیہ، فرانس کی فوجیں بلانے کی ہمت نہ ہوتی اور نہ کوئی مجبوری۔ اور کم از کم کوئی مسلم طاقت کسی دوسری مسلم طاقت پر حملہ آور ہونے کا باعث تو نہ ہوتی ــــ آج خلیجی جنگ کی خبروں میں جب ہمیں یہ خبر پڑھنے کو ملتی ہے کہ عراق نے سعودی عربیہ کے شہروں ریاض و ظہران پر زبردست و کامیاب میزائلی حملہ کیا تو ہمارا دل کانپ اٹھتا ہے اور دماغ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ موقع خوشی کا ہے یا ماتم کا۔ دونوں صورتیں ہمارے سامنے ہیں۔ اور دونوں ہی میں ہم مسلمانوں کے لیے شرم و ندامت سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

کیا کوئی بھی مسلمان سعودی عرب پر حملہ برداشت کر سکتا ہے۔ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس پاک سرزمین اور اس پر رہنے والوں کو برا کہنے والا بھی گنہ گار ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ سعودی عربیہ کی حفاظت و بقا فرما اور اس کے بادشاہ شاہ فہد کو ہمت و استقلال عطا کر، ان کی مدد فرما ان کو اس بلائے ناگہانی سے نجات دلا اور وہاں کے باشندوں کو مغربی طاقتوں کے فتنہ و شر سے بہر حال محفوظ فرما، اور جن طاقتوں کا سعودی عربیہ پر ناجائز نظر و عزم ہے انھیں ناکام و نامراد فرما۔ آمین ــ!

یہ افسوس کا مقام ہے کہ برطانیہ و امریکہ کی چالیں و سازشیں مسلم ممالک

کے اتحاد کو منتشر کرنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے عراق، فلسطین، سعودی عرب، شام، اردن، لبنان اور یمن ترکی کی سلطنت عثمانیہ کے صوبے تھے۔ ۷۵ سال پہلے سارے عرب ملک ایک تھے۔ پہلی عظیم میں ترکی کی شکست اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد برطانیہ و فرانس نے ان کو اپنے ماتحت لے لیا۔ مسلم حکمراں ہی کے ذریعہ خلافت کا خاتمہ ہوا۔

مغربی طاقتیں اپنی اس حکمت عملی میں کامیاب ہی ہیں کہ مسلمانوں کا شیرازہ خود مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے بکھر جائے۔ آج جو یہودی اسرائیل نام کا ملک دنیا کے نقشے میں دکھائی دے رہا ہے وہ ان کی اسی حکمت عملی کے نتیجہ کے تحت وجود میں آیا ہے۔ ہمارے لیے افسوس کا مقام ہے کہ ہماری کمزوری کا فائدہ ان اسلام دشمن طاقتیں پوری ملت اسلامیہ کی بربادی سے اٹھانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایمانداری اور اصول پسندی کا سبق کوئی مغربی ممالک سے سیکھے انھیں تازہ خلیجی جنگ کے بعد اپنے اس خیال کو دماغ سے نکال دینا ہوگا۔ کوئی اندھیرے میں بے ایمانی یا چوری چھپے غلط کام کرتا ہے مگر کھلم کھلا اور دن کے اجالے میں اس ڈھٹائی اور بے ایمانی کی مثال شاید ہی کہیں دوسری جگہ مشرقی ملک میں دکھائی دے۔

برطانیہ کے وزیر اعظم بالفور نے ہٹلر کے ذریعہ یہودیوں کے قتل عام کے بعد ان کے لیے ایک الگ ملک بنانے کا اعلان کیا تھا۔ ارادہ یہ ظاہر کیا کہ فلسطین کا بٹوارہ کیا جائے گا۔ حالانکہ یہودیوں کی ہمدردی میں انگریز لوگ

اتنے ہی پیش پیش تھے تو اپنے ملک کا علاقہ دے کر ان کے لیے صحیح ہمدردی
درتری ادا کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن انھوں نے یہودیوں کی ہمدردی سے کیا
لینا دینا تھا۔ ان کا تو مقصد عربوں کی کمر توڑنا تھا اسلام کو زک پہنچانی تھی،
برطانیہ نے بڑی چالاکی ومکاری کے ساتھ اسرائیل نام کا ملک فلسطینیوں
سے چھین کر قائم کردیا۔ فلسطینی دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر آج تک مجبور
ہیں۔ برطانیہ اور اس کی ہمنوا طاقتوں کی یہ بے انصافی و بے ایمانی آج تک
قائم ہے اور اس پر کسی نے دھیان دینے کی ضرورت تک نہ محسوس کی۔

فلسطینیوں کے ان کے جائز حق سے محروم رکھنے کے لیے ان پر ہر طرح
کے ظلم وستم اسرائیل کے ذریعہ ان مغربی طاقتوں نے روا رکھے ہوئے ہیں۔
اسرائیل کو ہر طرح کے سازوسامان وایٹمی بم تک سے لیس کر کے طاقت ور
بنادیا گیا اس لیے کہ مظلوم فلسطینی اگر اپنا جائز حق مانگیں تو انھیں اس
طاقت سے کچل دیا جائے۔ لیکن اگر عراق کویت کو اپنا ایک صوبہ سمجھ کر، کہہ کر
اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے تو تمام مغربی طاقتوں کا ایمان وانصاف اُبل اُبل
کر چیخنے چلانے لگتا ہے کہ عراق نے یہ بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اسے مار ڈالو ختم
کردو۔ لیکن جب عراق یہ کہتا ہے کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ ۱۹۶۷ء
سے اسرائیل جو عربوں کا علاقہ غصب اور فلسطینیوں کو ان کے جائز حق اور
ملک سے محروم کیے بیٹھا ہے اسے بھی تو دیکھو تو کسی بھی مغربی ملک کے پاس
ایمان وانصاف نام کی چیز ہوتی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ عراق کے خلاف تو
امریکہ وبرطانیہ، فرانس، جاپان سے لے کر سوویت روس تک میدان عمل
میں انتہائی سرعت کے ساتھ کود پڑے اور ان کے ساتھ انصاف
اور سب کو مساوی حق دلانے کا راگ الاپنے والی سیکورٹی کونسل بھی آناً فاناً

حرکت میں آگئی لیکن فلسطینی یا مظلوم عربوں کے حقوق کے لیے کسی انصاف کی ذرا سی بھی کوئی جنبش بھی نہیں دکھائی دی۔ کیا بیسویں صدی میں انصاف ایمان، قانون کے معنی اس طرح کے رہ گئے ہیں۔؟

خلیجی جنگ میں عراق کے صحیح یا غلط ہونے کا کوئی بھی صحیح خیال قائم کرنا کسی انسانی سوچ کے بس سے باہر ہے۔ امریکہ کے صدر جارج بش کسی وقت امریکہ کی جاسوسی جماعت سی آئی اے کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ سی۔ آئی۔ اے کی گرفت ہر ملک … امریکی خیال کے موافق کرنے میں روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اور اس جنگ میں سی۔ آئی۔ اے کے ہاتھ ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کہنا مشکل ہے۔ لیکن ہم اس خلیجی جنگ میں قدرت کی طاقت کا جو نظارہ دیکھ رہے ہیں وہ اس بھرپور مادی ساز وسامان کی دنیا میں چونکا دینے والا ہے۔ عراق اکیلا ہے جو اس وقت ان تمام مغربی طاقتوں سے لڑ رہا ہے۔ مغربی طاقتوں امریکہ، برطانیہ، فرانس کے پاس جدید ٹکنالوجی کے تمام ہتھیار و وسائل موجود ہیں۔ اور وہ عراق کے خلاف ان کو ہر طرح پوری شدت کے ساتھ استعمال میں لا رہے ہیں مگر اس کے باوجود وہ کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں ـــ ایک امریکی جنرل تھامس کیلی نے کہا ہے کہ عراق میں موسم کی خرابی کی وجہ سے بادل چھائے ہوئے تھے جس سے صاف صاف نوٹ لینا ممکن نہ ہو سکا۔ جس بھرپور طاقت کے ساتھ عراق پر ان مغربی طاقتوں نے یلغار کی ہے اس کا تقاضہ تھا کہ عراق پہلے ہی دن مٹی کا ڈھیر ہو جاتا اور وہ ان طاقتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا۔ لیکن یہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور عراق آج کے ۹ویں روز بھی بفضل تعالیٰ صحیح وسلامت ہے اور ان طاقتوں

کے ہر حملہ کا منہ توڑ و کامیاب جواب دے رہا ہے۔ وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے کرم سے اس کی اہمیت برقرار، عزم جواں، حوصلہ بلند ہے۔ مگر ہم مسلمانوں کے لیے اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا ایمان و یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ اللہ کے سامنے دنیاوی طاقت کیا معنی رکھتی ہے۔ نظام قدرت کے آگے دنیاوی نظام کی بساط ہی کیا ہے، اس کی طاقت کے آگے سب ہی بے بس ہیں۔ اگر امریکن حقائق و ایمان کی زبان سمجھتے ہوتے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ سمجھتے تو وہ اسے موسم کی خرابی نہ کہہ کر عراق جیسے چھوٹے و اکیلے ملک کے لیے اللہ کی غیبی مدد ہی سمجھتے۔ مگر دنیاوی ساز و سامان پر تکیہ کرنے والوں کی نظر خدائی طاقت کو کہاں دیکھ اور سمجھ پاتی ہے۔ خدا کی طاقت کے آگے عراق کا اکیلا ہونا یا مغربی طاقتوں کی کثیر تعداد و جدید ساز و سامان کی بھرپوری کیا بس چل سکتا ہے۔

اس خلیجی جنگ کا انجام کیا ہوگا یہ قدرت کو معلوم ہے لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ہم اللہ ربّ العزت کی مدد ہمیشہ ہی مظلوم اور حق پرستوں کے ساتھ رہی ہے۔ بے ایمانی، ناانصافی کی عمر زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے اور بے ایمانی عروج پر پہنچ کر حق و باطل میں تمیز کرنے سے قاصر اور وہ اپنے غرور و تکبّر میں بدمست ہو جاتی ہے تو پھر قرآنی آیت "قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" کی تفسیر حقانی انسانی دل و دماغ کے بند ہوتے کھول دیتی ہے۔

ایک ضروری اعلان

کچھ عرصہ سے ماہانہ "برہان" دہلی وقت پر شائع نہ ہوسکا۔ ایک مہینہ اور کبھی ڈیڑھ مہینہ تاخیر سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس تعوق کی وجہ لیتھو پریس کی کمی ہے۔ آفسیٹ کے آگے لیتھو پریس اکثر ختم ہوچکے ہیں اور جو باقی ہیں ان پر کام کی اس قدر زیادتی ہے کہ وہ 'برہان' وقت پر چھاپ کر نہ دے سکے۔ کچھ دفتری مصروفیات کی زیادتی بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ دفتری کارکنان اس کمی کو دور کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں۔ 'برہان' کو آفسیٹ پر بھی نکالنے اور شائع کرنے کا خیال ہے۔ لیکن فی الحال زیرِ نظر شمارہ ہم تعوق کو دور کرنے کے نقطۂ نظر سے ماہ جنوری اور ماہ فروری ۱۹۹۱ء کا مشترک چھاپ رہے ہیں۔ لہذا زیرِ نظر 'برہان' کے نظرات بھی ماہ جنوری کے ساتھ ماہ فروری ۹۱ء کے بھی سمجھ کر مطالعہ فرمائیں۔

حضرت قبلہ ابا جان مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن اس وقت نامساعد حالات میں سخت مجبوری کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کرنا پڑا جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

انشاء اللہ آئندہ 'برہان' ماہ بہ ماہ پابندی سے شائع ہوکر ناظرین کرام کی خدمت میں پہنچتا رہے گا۔

(ادارہ)

وفات حسرت آیات :-

علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر غم و رنج کے ساتھ سنی گئی کہ برِّ صغیر میں دینی علوم کے فروغ کے لیئے زبردست مساعی جمیلہ انجام دینے والی عظیم شخصیت حضرت مولانا محمد تقی امینی ۲۳ر جنوری ۱۹۹۱ء کو طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

مرحوم بڑے پایہ کے عالم دین تھے۔ ان کی علمی و دینی کتابیں اسلامی لائبریریوں کی زینت ہیں۔ تقریباً ۴۰ گراں قدر کتابیں تصنیف فرمائیں جن کا عربی و انگریزی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

حضرت مولینا محمد تقی امینی صاحب مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے جاں نثار و شیدائی تھے اور حضرت مفتی صاحب رح کو ملت اسلامیہ ہند کے لیے ایک انمول نعمت کہا کرتے تھے۔

ندوۃ المصنفین کے ادارے سے مولینا محمد تقی امینی کی کئی دینی و علمی اور تحقیقی کتابیں بڑے ادب و اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔ ندوۃ المصنفین دہلی کے معیار کا آپ کے دل میں بڑا پاس تھا۔

ایسی باکمال عالم دین شخصیت کے انتقالِ پر ملال پر ادارہ ندوۃ المصنفین اور ادارہ برہان کو ذاتی دلی رنج و غم ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین) مولینا محمد تقی امینی نے ۶۵ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

انکی آخری تصنیف 'حکمت القرآن' ادارہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہو رہی ہے اسکے بعد مرحوم علالت اور دیگر وجوہات کی بناء پر تصنیفی کام انجام نہ دے سکے ان کی ذات سے علمی و دینی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی ہے •

قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین

از قلم پروفیسر سید وحید اشرف، صدر شعبۂ عربی، فارسی، اردو
دانشگاہ مدراس

برہان مئی، جون کے شمارے میں دو قسطوں میں ایک مضمون زیر عنوان "ھل کنت الا بشراً رسولا" (×) نظر سے گزرا۔ مضمون پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ مضمون پروفیسر عنوان چشتی کے کسی مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ دو یا چند دانشوروں کے درمیان جب کوئی علمی مباحثہ ہو تو اس سے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں اور علم و فکر کے نئے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ تحقیق کے لیے نئی راہیں کھلتی ہیں جس سے حقیقت تک رسائی میں مدد ملتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ مباحثہ کا مقصد اظہار تفاخر نہیں بلکہ حقیقت کی تلاش ہو۔ اس میں کسی کو فاتح اور دوسرے کو مفتوح ہونے کا احساس بھی نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ تحقیق میں بڑے بڑے عالموں سے بھی لغزش ممکن ہے۔ حضرت شیخ شرف الدین یحیٰی منیری (م سنہ ۷۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ اگر تحقیق کے

(×) یہ عنوان برہان مئی جون کے شمارے میں ہے۔ حالانکہ اس عنوان کی ترکیب غور طلب ہے۔ (سید وحید اشرف)

لیے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ محقق سے ہرگز لغزش نہ ہونا چاہیئے تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جائے گا وہ کہتے ہیں کہ تحقیق میں صوفیہ سے بھی غلطی ممکن ہے۔

زیر نظر مضمون کا مقصد نہ کسی کا دفاع ہے اور نہ کسی کا جواب بلکہ اس کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس بحث میں جو امور ابھی محتاج دلیل ہیں اور جو گوشے نظر سے مخفی ہیں وہ نمایاں ہو جائیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ برہان میں مئی اور جون کے شمارے کے مضمون نگار اس موضوع پر دوبارہ بھرپور روشنی ڈال کر مجلہ برہان کے ذریعہ سب کو علم وہدایت سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیں گے۔

برہان میں مضمون کی دونوں قسطوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر عنوان چشتی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو عام بشریت سے ممتاز سمجھتے ہیں اور وہ آپ کو نور مجسم کہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں خود آپ کو نور کہا گیا ہے۔ (پروفیسر عنوان چشتی کا مضمون ہماری نظر کے سامنے نہیں ہے) لیکن مضمون نگار کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مجسم ہونے سے انکار ہے۔ وہ آپؐ کی بشریت کو دوسروں کی بشریت سے ممتاز نہیں سمجھتے اور اس لیے قرآن میں آپ کے لیے جو لفظ نور آیا ہے اس کی تاویل کرتے ہیں اپنے مضمون میں انھوں نے تین امور کو موضوع بحث بنایا ہے، ایک بشریت رسول، دوسرے علم غیب اور تیسرے کیا رسول اکرم نور مجسم ہیں۔

بشریت کے ثبوت میں مضمون نگار نے قرآن کی وہ آیات نقل کی ہیں جن میں رسول کے بشر ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں بعض ایسی بھی ہیں جن میں بشر کی مزید وضاحت مثلکم کہہ کر کی گئی ہے (قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ)۔ اس بحث میں چند ضروری وضاحت طلب امور پر کوئی

روشنی ڈالی نہیں گئی ہے۔ جن کو حل کیے بغیر علمی طور پر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔
اول یہ کہ مضمون نگار کو خود اعتراف ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سبھی مومنین اور کفار بھی بشر ہی سمجھتے تھے۔ اس کا ثبوت بھی خود قرآن میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں آپ کو خدا کی طرف سے یہ حکم دیا جانا کہ آپ کہہ دیں کہ میں بشر ہوں بالکل غیر فطری اور غیر ضروری ہے۔ اگر میں اپنے ہم جنس لوگوں سے اپنا تعارف اس طرح کراؤں کہ اے لوگو! میں بشر ہوں تو لوگ مجھے دیوانہ کہیں گے۔ یہ تو وہی کہہ سکتا ہے کہ جس کے اوصاف مافوق البشر ہوں اس لیے غلط فہمی کے ازالہ کے لیے وہ کہے کہ میں بشر ہوں مافوق البشر نہیں ہوں۔ لیکن اس سبب سے یہ بشریت بھی عام بشریت سے ممتاز ہو جاتی ہے۔
ہماری زبان کا یہ محاورہ ہے کہ کبھی کبھی ایک انسان خود اپنے کو اس طرح کہتا ہے کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی گناہ یا خطا کر سکتا ہے اور نبی کی بشریت خطا و گناہ سے پاک ہے۔
دوسرے یہ کہ تمام آیات میں بشر لفظ ہے لیکن بعض آیات میں مثلکم بھی لگایا ہے یعنی تمہاری طرح۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ یہ خطاب کفار سے کیا گیا ہے۔ اس لیے اب یہاں مثلکم کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔؟
تیسرے یہ کہ مضمون نگار نے بشر، آدمی، انسان کو یہ کہہ کر ایک کر دیا کہ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان لفظوں کا اطلاق ایک نوع کی مخلوق پر ہوتا ہے لیکن ان میں سے ہر لفظ کی معنویت جدا جدا ہے۔ اسمائے صفات ایک ذات کے لیے ہوں پھر بھی ان اسماء کی معنویت میں فرق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر بھی ہے اور حکیم۔ یہ دونوں اسمائے صفات معنی کے اعتبار سے جدا جدا ہیں اگرچہ ان کا اطلاق ایک ہی ذات پر ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن کی آیات میں رسول کے لیے صرف لفظ بشر کیوں استعمال ہوا ہے انسان یا ولد آدم کیوں نہیں استعمال ہوا۔؟

میں یہاں اس امر کی طرف بھی متوجہ کرتا چلوں کہ بشر لفظ بشرہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں ظاہر جلد۔ اس کے مقابلہ میں ادمہ ہے جس کے معنی ہیں باطن جلد۔ یعنی انسان کی ظاہری جلد سے ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ بشر ہے یعنی اولاد آدم سے ہے۔ المنجد میں اگرچہ صرف ظاہر جلد لکھا ہے لیکن یہ لفظ صرف انسان کی ظاہر جلد کے لیے مخصوص ہے غالباً امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں اس کی تصریح کردی ہے۔ (جو اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے)۔ تاہم یہ بات بدیہی ہے کہ بشرہ نوع بشر ہی کی ظاہری جلد کو کہتے ہیں۔ انسان کو آدمی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہے اگر حضرت آدم کا نام سادم ہوتا تو ہم سادمی کہلاتے۔ اسی طرح لفظ انسان کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انسان کو بشر کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ ظاہر جلد سے پہچان لیا جاتا ہے کہ وہ نسل آدم سے یعنی آدمی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام مترادفات میں سے رسول کے لیے صرف لفظ بشر کا استعمال کیا معنویت رکھتا ہے۔؟

مضمون نگار نے دوسری بحث علم غیب رسول پر کی ہے۔ اور علم غیب رسول سے انکار کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہے۔ لیکن مضمون نگار نے ان آیات سے قطعی صرفِ نظر کر لیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ خدا جسے چاہے علم غیب عطا کرے۔ ان آیات کی موجودگی میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب علم غیب صرف خدا کی صفت ہے تو خدا خود کیوں فرماتا ہے کہ وہ جیسے چاہے علم غیب عطا کر دے۔

دوسرے یہ کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال موجود ہیں جن سے غیب دانی کا اظہار ہوتا ہے۔ قرآن ہی میں خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول موجود ہے کہ جو کچھ تم اپنے گھروں میں جمع رکھتے ہو وہ سب میں بتاتا ہوں (سورۂ آل عمران)

یہی نہیں بلکہ اسلام کے بڑے بڑے جلیل القدر علماء مثلاً عبدالقادر جیلانی، مولانا جلال الدین رومی، سید اشرف جہانگیر سمنانی، خواجہ شیرازی، حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور سیکڑوں بزرگان دین کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر غیب کا علم ظاہر ہوتا تھا۔ اسلام کے اجلۂ علماء کی تحقیقات و انکشافات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے سامنے بھی قرآن تھا اور وہ قرآن پر عام لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ عامل اور پیرو سنت تھے۔ اس لیے علم غیب پر بحث کرنے کے لیے ان امور کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی بحث تشفی بخش نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور بندہ اپنی ذات اور اپنی تمام صفات میں خدا کا محتاج ہے یعنی بندہ کی ذات اور ہر صفت، خدا کی عطا سے ہے۔

مضمون نگار کی تیسری بحث کا موضوع یہ ہے کہ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نور مجسم ہیں مضمون نگار نے اس سے انکار کیا اور قرآن کی آیت کی تاویل کی ہے۔ اس بحث میں ان کا طریقۂ کار یہ ہے کہ انھوں نے نور کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے اور کتب لغت اور بعض اہل علم کے اقوال کو پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے نور کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے ان کے پاس سوائے اٹکل کے کوئی وسیلہ نہ تھا۔ ان سے استناد کرنا درست نہیں ہے۔ موجودات کے بارے میں اگرچہ آج انسان

کا علم بہت بڑھ چکا ہے۔ پھر بھی ابھی بہت ناقص ہے۔ موجودات کے بارے میں قرآن میں جگہ جگہ کچھ اشارے ملتے ہیں جو بہت غور طلب ہیں۔ صوفیائے اسلام نے موجودات کے بارے میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ لیکن ان کی تحقیق کا طریقہ سائنسی طریقہ سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے تزکیۂ نفس کرو اور دل کی آنکھ کھولو تو تم پر وہ چیزیں ظاہر ہو جائیں گی جو غیب میں ہیں۔ ان کا علم یا کشفی ہے یا نظری ہے یا کلامی ہے یا ان تینوں کو شامل ہے موجودات کے بارے میں صوفیہ نے جو کچھ کہا ہے آج سائنس اپنے تجربات سے ان کی تصدیق کر رہی ہے لیکن ابھی صوفیہ کی بہت سی تحقیقات یا ان کے مکشوفات کی تصدیق سائنس کے ذریعہ ہونا باقی ہے۔ انھیں موجودات میں ایک شے نور ہے۔ خدا خود نور ہے جس کی کُنہ کو عقل سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ نور مخلوق بھی ہے۔ اس لیے نور اور نور میں فرق بھی ہے۔ خالق اور مخلوق میں فرق ہونا ضرور ہے۔

یہ موجودات کیا ہیں۔؟ اس کا جواب مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ یہاں تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن اب تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ مادّہ ایک ظاہری شکل ہے اور حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے مادّہ کا وجود نہیں ہے۔ مادّہ مجسم انرجی ہے اور انرجی غیر مادّی ہے روشنی آواز اور حرارت یہ سب انرجی ہیں ایک انرجی کو دوسری انرجی میں بدلا جا سکتا ہے مثلاً روشنی کو آواز میں اور آواز کو روشنی میں بدل سکتے ہیں۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر شے کا ایک جزو لا یتجزّیٰ ہوتا ہے اور اسی اجزائے لا یتجزّیٰ سے متشکل ہوتی ہے۔ لیکن سائنس نے ایٹم کو تحلیل کر کے دکھایا کہ جسے لا یتجزّیٰ سمجھتے تھے اسے بھی تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ تحلیل ہونے پر صرف

حرارت بن جاتا ہے۔ ایٹم بم کے ٹوٹنے سے یہی حرارت پیدا ہوتی ہے جو تباہی مچاتی ہے۔

اب جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر شئے مجسّم انرجی ہے تو خواہ وہ جمادات ہوں، حیوانات ہوں، نباتات ہوں، ہوا، پانی، انسان، ہر ایک مجسم انرجی ہے خواہ ان کا وجود توالد و تناسل کے ذریعہ ہوا ہو یا کسی اور ذریعہ سے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے رسولؐ کے جسم کی انرجی لطیف ترین نور ہے اور آپ نور مجسّم ہیں کیونکہ نور بھی انرجی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ انرجی اور انرجی میں فرق ہے۔ روشنی کو دیکھ سکتے ہیں، سُن نہیں سکتے اس روشنی سے مراد وہ روشنی ہے جو دیکھی جا سکتی ہے۔ نور کی لطافت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ہر ایک کو نظر نہ آئے۔ مثلاً فرشتے نوری ہیں مگر ہر ایک کو نظر نہیں آتے۔ آواز کو سُن سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے۔ حرارت کو محسوس کر سکتے ہیں سُن اور دیکھ نہیں سکتے اسی طرح ایک مادّہ کی انرجی اور دوسرے مادہ کی انرجی میں فرق ہو سکتا ہے اس ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک بوتل میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بھر دیجئے اور دوسرے میں آکسیجن گیس بھر دیجئے۔ دونوں کو ہوا کہیں گے۔ یعنی کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی ہوا ہے اور آکسیجن بھی ہوا ہے۔ اب کاربن ڈائی آکسائیڈ میں ایک زندہ کیڑا ڈال دیجئے وہ اس میں مر جائیگا۔ ایک نیم جاں کیڑے کو آکسیجن گیس میں ڈال دیجئے اس میں تازگی آجائے گی۔ دونوں ہوا ہیں لیکن دونوں میں یہ تضاد کہ ایک دوسرے کے بالکل برعکس۔ اب اگر ہم قرآن کی آیات پر غور کریں کہ مشرکین کو زندہ نہ کہو یہ چلتے پھرتے مردہ ہیں تو یہ اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مشرکین جس انرجی سے بنے ہیں اس میں موت کی خاصیت ہے جیسے کاربن ڈائی آکسائیڈ۔

کاربن ڈائی آکسائیڈ کے صاف کرنے کا قدرتی اور سائنسی طریقہ بھی ہے۔ اسی طرح انسان اپنے نفس کی گندگی کو صاف کر سکتا ہے۔ اور اس کا ذریعہ ہے ایمان اور اطاعت الٰہی، پیروی سنت اور ذکر الٰہی۔ چنانچہ صوفیہ کے تجربات میں ملتا ہے کہ ذکر کے ذریعہ جب انھوں نے مکمل تزکیۂ نفس کر لیا تو ان کا جسم نورانی ہو گیا یعنی وہ بھی نور مجسم ہو گئے۔ سید اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی حدود ۸۲۹ھ) نے چشم دید واقعہ بیان کیا ہے کہ سید جلال بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے حجرے میں ذکر کر رہے تھے۔ دوران ذکر ان کا جسم نور بن کر پھیلتا گیا اور پورا حجرہ نور سے بھر گیا۔ اور جسم غائب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ نور سمٹنا شروع ہوا۔ اور جسم بن گیا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن عقل کہتی ہے اگر ہمارے جسم کی انرجی میں کوئی گندگی ہے تو اس کے صاف ہونے کا طریقہ مذہب کو بتانا چاہیے اور صرف اسلام ایسا مذہب ہے جو یہ طریقہ بتاتا ہے۔ قرآن نے اطاعت الٰہی، پیروی سنت اور ذکر الٰہی کو ہی تزکیہ کا طریقہ بتایا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدمی سنت کی پیروی کر کے اور ذکر الٰہی کے ذریعہ اپنا جسم نورانی بنا سکتا ہے تو رسول کے نورِ مجسم ہونے کی کیا تخصیص باقی رہ گئی جس کا ذکر قرآن میں ہے۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہا جا چکا ہے کہ انرجی اور انرجی میں فرق ہے۔ اسی طرح نور اور نور میں فرق ہے۔ سورج کی روشنی، چاند کی روشنی، موم کی روشنی اور دوسری روشنیوں میں فرق ظاہر ہے۔ ایک نور دوسرے نور کے مقابلے میں زیادہ بسیط ہو سکتا ہے اور یقیناً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور عام مخلوقات کے نور سے زیادہ بسیط ہے۔ اور یہ واقعہ معراج سے

بھی ثابت ہے۔
مضمون نگار نے نور کی تعریف کر کے ایک اشکال پیدا کیا ہے لیکن اشکال کا سبب یہ ہے کہ مضمون نگار نے نور کی تحقیق میں غلط استناد کیا ہے۔ اور یہ غلطی بدیہی ہے۔ مضمون نگار نے ایک قول یہ پیش کیا ہے کہ نور وہ ہے جس پر نگاہ نہ ٹھہر سکے اور پھر سوال کیا ہے کہ کیا قرآن پر جس کو نور کہا گیا ہے نگاہ نہیں ٹھہرتی ؟ یہاں مضمون نگار سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا کاغذ کا نام قرآن ہے ؟ یا روشنائی کا نام قرآن ہے ؟ یا حروف کی شکلوں کا نام قرآن ہے۔؟ پھر حافظ قرآن کے سینے میں جو قرآن محفوظ ہے اس میں نہ کاغذ ہے نہ سیاہی اور نہ حروف، تو وہ کیا ہے۔؟ اس سے ظاہر ہے کہ مضمون نگار نے نور کی جس تعریف کو سند قرار دیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ اور قرآن کے نور ہدایت ہونے میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہو سکتا یعنی یہ ایک کتاب ہدایت ہے۔
اب فرض کیجیے کہ نور کی حقیقت ہمیں نہیں معلوم۔ سائنس کے انکشافات اب ہوئے ہیں۔ صوفیہ کے مشاہدات روحانی تجربات پر مبنی ہیں جس کے لیے دل کی آنکھ کھولنا شرط ہے۔ ان حالات میں ہمارے رسولؐ کے بارے میں خدا نے جو فرمادیا کہ آپ نور ہیں (قد جاکم من اللہ نور) تو کیا ہمیں اس کی تائید بغیر کسی تاویل کے نہ کرنی چاہیئے ؟ اگر ہم رسول کو نور مجسم مان لیں تو اس سے ایمان میں کون سی بدعقیدگی پیدا ہوتی ہے ؟ جب کہ خدا نے خود ہی آپ کو نور کہا ہے تو اس کی تاویل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ بغیر ضروری علم کے تاویل میں گمراہی کا امکان نہایت قوی ہے۔ آیا عقل کی اس گمراہی سے بچنا بہتر ہے یا خدا کے قول کی تائید کر کے رسول کو

کو نور مجسم اور نور ہدایت مان لینا بہتر ہے۔ ۹ رسول کا ہادی ہونا اظہر من الشمس ہے یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہدایت بھی ہیں اور نور مجسّم بھی۔

یہاں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ میں پروفیسر عنوان چشتی کا دفاع کر رہا ہوں لیکن میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے۔ ہاں میں نے اپنے عقیدہ کا اظہار کردیا ہے اور اس کی توجیہ بھی پیش کردی ہے لیکن ساتھ ہی اس توجیہہ میں سوال بھی ہے تاکہ مضمون نگار اپنے مضمون میں ان سوالات کو داخل کرلیں۔ اور اپنے جواب سے ہمیں ہدایت حاصل کرنے کا موقع فراہم کریں۔ پروفیسر عنوان چشتی کا مضمون میرے پیش نظر نہیں ہے لیکن اگر وہ بشریت رسول کے قائل ہیں اور اس بشریت کو عام بشریت سے ممتاز سمجھتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نور مجسم بھی مانتے ہیں تو ان کا ایمان قرآن کے قول کے بالکل مطابق ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اُن کے طرز استدلال میں کوئی کمزوری واقع ہوگئی ہو جس کے بارے میں اس وقت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ طرز استدلال میں کوئی کمزوری ہونا اور بات ہے، اصل چیز حق بات کا اظہار کرنا ہے۔ البتہ ایک عالم قرآن سے یہ توقع کی جانی چاہیئے کہ قرآنی موضوعات پر اس کا طرز استدلال قوی ہو اور کمزوریوں سے زیادہ سے زیادہ پاک ہو۔　　　　(ختم شد)

اسلام میں جنگ و صلح کے اصول و مبادی

امتیاز احمد اعظمی، ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسابقت اور مقابلہ آرائی بنی آدم کی فطری شئی ہے۔ اور نفسا یہ ایک پسندیدہ اور محبوب شئی ہے۔ انسانی ترقی کا دارو مدار اس پر ہے لیکن مسابقت کا جذبہ انسان کو غلط راہ پر بھی ڈال دیتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ خود تو سب کچھ بننے اور شاہ اعظم ہونے کی خواہش و کوشش کرتا ہے لیکن دوسروں کو ذلت و پستی کی حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے کی مال و دولت اور جاہ و حشمت اس کی آنکھ میں کنکری کے مانند چبھتی ہے اس کی ترقی و بلندی اسے راس نہیں آتی ہے۔ سماج و معاشرہ میں اس کا بلند مقام و مرتبہ اور اس کے اندر بغض و نفرت کے بیج ڈال دیتا ہے۔ اس طرح جارحیت اور ظلم و تعدی کا آغاز ہوتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر، اور ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ آور

ہوتا ہے، ایک قوم دوسری قوم کو اس کے تہذیب و تمدن، علم و ثقافت اور اس کے تشخص و امتیاز کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے اور اس کے لیئے وہ ہر جارحیت اور شرمناک حرکات کر گذرتی ہے۔ اور اس کا آغاز آدم کی پہلی اولاد ہی سے ہوا جب قابیل کی قربانی وچڑھاوا خدا کی نظر میں قبول ہوگیا، اور ہابیل اس مقبولیت سے محروم رہا تو اس کی انا کو ٹھیس پہنچی اور اس کی شان انانیت نے اس کو اپنے بھائی قابیل کے قتل تک پہونچا دیا۔

اسلام ایک امن و آشتی اور صلح و سلامتی کی شمع ہے۔ معاشرے و سماج میں ظلم و ستم کے وہ سخت خلاف ہے۔ جنگ وحرب کا وہ بالکل قائل ہی نہیں ہے کسی پر دست درازی اور اس کی حق تلفی اور اپنی شان وشوکت کی نمائش کے لئے بلا وجہ اس کو اس کے کلچر و تہذیب سے دور کرنا اسلام کی نظر میں نہایت معیوب چیز ہے۔ ہاں وہ اپنے دفاع کا قائل ہے اور اس کے لئے ہر ممکن تیاری کا حکم دیتا ہے۔

وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال ۶۰) یعنی جہاں تک ہوسکے قوت و طاقت فراہم کرکے اور گھوڑوں کی تیاری سے ان کے لیئے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر خوف طاری رہے۔

گویا اسلام جنگ کرنے کے لیئے خود پیش قدمی نہیں کرتا اور نہ اپنے ماننے والوں کو بلا وجہ کسی ملک و قوم سے جنگ مول لینے کو کو کہتا ہے بلکہ وہ اس ملک و قوم سے جنگ کرنے اور مقابلہ میں آنے کو کہتا ہے جو اسلام پر جارحانہ کارروائی کرے اور اسلام کے

ماننے والوں کو ان کے اخلاق و نظریات، حریت و استقلال اور سلامتی سے دور کرنا چاہیے" وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ " یعنی فی سبیل اللہ ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے لڑتے ہیں"۔ کفر و اسلام کی یہ جنگ و جدال اس وقت تک جاری رہے گی جب تک عدل و انصاف نہ قائم ہو جائے اور انسانی روح سکون کی سانس نہ لے لے ظلم و تعدی، اور فتنہ و فساد ختم ہو جائے۔ " وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ " اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔

اسلامی اور غیر اسلامی جنگوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ اسلامی جنگ عدل و انصاف کو قائم کرنے، ظلم و تعدی کو ختم کرنے مظلوموں کی مدد کرنے، اور حاکم و محکوم کے غلط نظریہ کو ختم کرنے اپنے تہذیب و کلچر، اخلاق و تمدن، اور آزادی و استقلال کی دفاع کرنے کے لیے ہوتی ہے، جبکہ غیر اسلامی جنگیں ظلم و تعدی، دوسروں پر دست درازی، اپنی شان انانیت کی برتری، اور دوسری قوموں کو غلام و محکوم بنانے کے لئے ہوتی ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ "فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ " یعنی جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو اس کے جواب میں تمہارا ردِ عمل اسی قدر ہونا چاہئے جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہے"

اسلام ظلم و ستم کو روکنے اور مظلوموں کی مدد کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی پوری اجازت دیتا ہے، چاہے وہ ظلم و استبداد زمین کے کسی علاقہ میں ہو رہا ہو اور ستم رسیدہ لوگ کسی ملک و وطن

سے تعلق رکھتے ہوں۔ واضح طور پر کہا گیا۔ "وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا" یعنی تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ظلم و تشدد سے نجات دلانے کی خاطر نہیں لڑتے، جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار، ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار بنا۔"

عدل و انصاف کے قیام اور امن وسلامتی کی بقا کے لئے اسلام تلوار اٹھانے اور مقابلہ آرا ہونے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی میدانِ کارزار میں بھی وہ عدل و انصاف کا حامی ہے۔ جنگ کرنے اور بدلہ لینے میں حدود اسلامی اور جنگی اصول کا خیال رکھنا ہوگا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ" یعنی جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو۔ مگر زیادتی نہ کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جنگ کے دوران نعشوں کا مُثلہ کرنا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا خون کرنا اسلام کی نظر میں سخت ناپسندیدہ چیز ہے اس لئے یہاں تک کہا ہے کہ دشمن کی جائداد، باغات کے پھلوں اور کھیتوں کی فصلوں کو تباہ و برباد نہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک جنگی

مہم پر بھیجتے ہوئے فوجیوں کو ہدایت کی:۔

"لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر مثلہ نہ بنانا، چھوٹے بچوں کو قتل نہ کرنا، ایسے بوڑھوں کو قتل نہ کرنا جو لڑ نہیں سکتے، عورتوں کو کچھ نہ کہنا، باغات نہ کاٹنا، نہ آگ لگانا، کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کھانے بھر کی ضرورت سے زائد کسی جانور کو ذبح نہ کرنا، تم لوگوں کا گذر ایسے لوگوں پر ہوگا جنہوں نے اپنے آپ کو گرجوں میں عبادت کے لیئے وقف کر رکھا ہے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اور وہ کام کرنے دینا جس کے لیے وہ یکسو ہوگئے ہیں"۔

چونکہ اسلامی جنگ ظلم و تعدی کے لیئے نہیں لڑی جاتی بلکہ قیام عدل و انصاف کے لیے لڑی جاتی ہے، اور دشمنان ملک و وطن اور اعدائے اسلام کی دست درازی کے خلاف ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر وہ جنگ کرنے سے رک جائیں اور صلح و معاہدہ کے لیے ہاتھ بڑھائیں تو جنگ سے رک جانا چاہیئے اور صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھانا چاہیئے۔ فَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ اس صلح و معاہدہ پر اس وقت عمل پیرا ہونے کو کہتا ہے

جب تک مخالفین کی طرف سے عہد شکنی کا کوئی واضح ثبوت نہ ملجائے۔

دیکھئے اسلام میں جنگی اصول و قواعد بھی کس نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ کیوں کہ اسلام میں جنگ عدل و انصاف کے قیام کے لئے ہوئی ہے نہ کہ کسی پر تعدی و استبداد کیلئے۔ لہٰذا اگر دشمن قوم سے معاہدۂ صلح ہوگیا تو اس کا پاس رکھنا فرض ہے اور اس عہد کو خدا سے عہد کرنا قرار دیا گیا۔ "وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا۔" یعنی جب خدا سے عہد کرلو تو اس کو پورا کرو اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو کہ تم تو اللہ کو اپنا ضامن مقرر کرچکے ہو"

اور جب اسلام کو کامیابی اور فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ اپنے ظفریاب لوگوں کو دشمنوں کے ساتھ انتقامی کارروائی کرنے سے منع کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی کامیابی امن وسلامتی اور اخلاق وکردار کی کامیابی ہوتی ہے، اسلام اور اس کے اصولوں کی کامیابی ہوتی ہے لہٰذا کامیابی حاصل کرنے والے شیدایان اسلام عدل وانصاف اور بہترین تہذیب کے قیام کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا۔ "الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ" یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے، اور برائی سے روکیں گے

انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اسلام نے صرف اچھے اصول اور بہترین جنگی قوانین بنا کر پیش نہیں کیا ہے بلکہ اس کے پاس بے شمار ایسی عملی دلیلیں اور شواہد ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی جنگ خوں ریزی اور ملک گیری کے لئے نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا مقصد صرف اور صرف عدل وانصاف کا قیام اور ظلم و تعدی کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کے مثل ملت اسلامیہ جب میدان جنگ میں ہوتی ہے تو خونریزی پر نہیں اترتی اور اس موقع پر بھی یہ چاہتی ہے کہ کم سے کم جانیں جائیں اور وہ اس میں حد سے تجاوز نہیں کرتی ہے ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ جنگ کے دوران بھی اسلامی تہذیب انسانی دوستی کا بے مثال نمونہ پیش کرتی ہے۔ جنگ اُحد میں بعض صحابہ کی غلطیوں کے باعث حضور کافروں کے نرغے میں آگئے جس کی بنا پر آپ کو زخم بھی آگئے۔ ایک دانت بھی ٹوٹ گیا اور قریب تھا کہ کفار مکہ کچھ اور کر گذرتے۔ صحابہؓ نے اپنی جانوں پر کھیل کر آپؐ کی جان کی حفاظت کی۔ بعد میں صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپؐ کیوں نہ ان کافروں کے لئے بد دعا کرتے۔ دیکھئے محسن انسانیتؐ اور سراپا رحمت والی ذات کا جواب، اس سنگین حالت میں بھی کہتے ہیں کہ لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ داعی و رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ کیا کوئی تہذیب اپنے ماننے والوں میں سے کسی کی مثال پیش کر سکتی ہے کیا کوئی کمانڈر جب کہ اس کی جان

کا خطرہ ہو اس طرح انسان دوستی اور انسانی اخوت کا ثبوت پیش کرسکتا ہے۔ ابھی تک تو تاریخ کے صفحات پر کسی مذہب و تہذیب کے علمبردار اور اس کے فوجی کمانڈر کی مثال ایسی نظر نہیں آئی۔

اور اسلام کو جب فتح حاصل ہوئی تو اس نے انسان دوستی اور عام معافی کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کو دیکھ کر غیر جاندار حجر وشجر بھی اس تہذیب پر رشک کرنے لگے۔ فتح مکہ کی مثال اور اس کی حقیقت تاریخ کے صفحات پر آج تک موجود ہے، اور تا قیامت زمین و آسمان اس انسانی اخوت و محبت کے مداح رہیں گے۔ ایسے لوگوں کو اس موقع پر معاف کردیا جاتا ہے جن کی پوری زندگی اسلام مخالفت میں گزری، آپؐ اور صحابہؓ پر ہمیشہ ظلم وستم کیا، یہاں تک کہ تمام لوگوں کو وطن عزیز کو ترک کرنا پڑا، لیکن جب کامیابی نے اسلام کی قدم بوسی کی تو محسنِ انسانیتؐ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ درجہ احسان کا غیر معمولی نمونہ پیش کیا کہ دشمنوں کے ساتھ انسانیت کا ایسا معاملہ ابھی تک جن و بشر کی نظروں نے نہیں دیکھا تھا۔

خلفائے راشدین نے بھی تمام جنگوں اور فتوحات میں انسانی اخوت کا ایسا ہی نمونہ پیش کیا، اور کبھی بھی انتقام لینے کی نیت سے نہ تو کسی قوم سے جنگ کی اور نہ فتح حاصل ہونے کے بعد دشمنوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی دشمن قوم پر حملہ آور ہوئے اور فتح حاصل ہوئی تو رحم وکرم کا

وہ نمونہ پیش کیا کہ ان قوموں نے بھی ان کی تعریف کی اور اگر وہاں سے کسی وجہ سے وہ جانے لگے تو وہاں کے لوگوں نے انہیں نہ جانے کو کہا۔

خلفائے راشدین کے علاوہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جب اسلامی فوجیں دمشق، حمص اور شام کو فتح کرتی ہیں اور صلحنامے کے مطابق وہاں کے باشندوں کے جان و مال کی حفاظت اور ملک کے دفاع کے لیے ٹیکس وصول کرتی ہے لیکن وہاں سے جاتے وقت تمام کمانڈروں نے شہریوں کو جمع کر کے اور ان کے رقوم کو واپس کر دیا، اس کے جواب میں وہاں کے لوگوں نے کیا جواب دیا۔ ملاحظہ کریں :-

"ہم نے آپ لوگوں سے جو رقوم وصول کی تھیں وہ اس لیے تھیں کہ ہم تمہاری جان و مال کی حفاظت کریں گے اور بیرونی حملہ آوروں سے تمہارا بچاؤ کریں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب ہم تم سے جدا ہو رہے ہیں اور تمہاری حفاظت اور دفاع کی ذمہ داری ادا نہیں کر سکتے، لہٰذا آپ لوگوں کی رقومات یہ ہیں جو ہم واپس کر رہے ہیں۔"

اس پر لوگوں نے کہا!

"اللہ آپ لوگوں کو فتح یاب کرے اور یہاں دوبارہ لوٹائے، تمہاری حکومت اور تمہارے

عدل وانصاف نے ہمیں اپنا گرویدہ بنالیا ہے،
کیوں کہ ہمیں رومیوں کے ہم مذہب ہونے
کے باوجود ان کے جور وظلم کے بڑے تلخ
تجربات ہوئے ہیں۔ خدا کی قسم اگر تمہاری
جگہ وہ لوگ ہوتے تو وہ ہم سے لئے ہوئے
اموال میں سے ایک کوڑی بھی نہ لوٹاتے، بلکہ
بلکہ اپنے ساتھ وہ تمام چیزیں بھی اٹھا کر لے جاتے
جنہیں وہ اٹھا سکتے ۔

کیا تاریخ کے صفحات کوئی ایسی مثال پیش کرسکتے ہیں اور دنیا میں کوئی ایسی تہذیب ہے جس کے ماننے والوں نے کسی ملک یا قوم کو فتح کیا اور اس کی رعایا کے ساتھ انسانی اخوت ومحبت اور اپنے لوگوں کا سا برتاؤ کیا۔ کوئی ایک مثال بھی انسانی تاریخ میں ایسی نظر نہیں آتی ہے، بلکہ فاتح قوم تو مفتوح قوم کو ختم ہی کر دینا چاہتی ہے اور قتل وخوں ریزی ہی اس ملک کے لوگوں کی تقدیر بن جاتی ہے۔ اگر قتل وخوں ریزی کم ہوئی تو مفتوح قوم محکوم وغلام بن کر رہ جاتی ہے۔ اپنے تشخص، تہذیب وتمدن، اور علم وفن سے دور کردی جاتی ہے۔ اقتصادی اور معاشی اعتبار سے فاتح قوم کا مرہون منت بننا پڑتا ہے۔ اور مجبوراً اگر اس ملک کو فاتح قوم اس ملک کو چھوڑ کر جانے لگتی ہے تو جتنا ممکن ہوتا ہے اس ملک کو دیوالیہ بنا کر جاتی ہے اور سب کچھ اپنے ساتھ لے کر جاتی ہے۔ فرانس کا مصر پہ غلبہ ہو یا انگلستان کا ہندوستان پر، ہر ایک نے مفتوح ملک کے

لوگوں پر ظلم و تعدی کی۔ ان کی حق تلفی کرنے اور مغلوب کرنے و محکوم کے مثل رکھنے کی کوشش کی۔ اور جب وہ گئے تو اپنے ساتھ صرف اپنی لائی ہوئی چیزوں ہی کو لے کر نہیں گئے بلکہ اس ملک کا باقی ماندہ اثاثہ بھی لے جانے کی کوشش کی۔

اسلام وہ واحد اور تنہا تہذیب ہے جس کی جنگ اور فتح دونوں میں انسان دوستی اور انسانی مزاج کی ضمانت ہوتی ہے۔ تہذیب اسلامی ہر قوم کی جان و مال کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر قوم و برادری کے لوگوں کی عزت و آبرو برابر درجہ کی حامل ہے اور ہر مظلوم کی حمایت کرنا اس کے نزدیک ضروری ہے چاہے وہ کسی بھی تہذیب اور کلچر کا پیرو کار ہو۔ چنانچہ جب تاتاریوں نے شام پر حملہ کر کے بے شمار یہودیوں، مسلمانوں، اور عیسائیوں کو قید کر لیا، تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے تاتاریوں کے امیر سے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ امیر صرف مسلمان قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوا۔ امام ابن تیمیہؒ اس بات پر تیار نہیں ہوئے اور یہودیوں اور عیسائیوں کی بھی رہائی کا مطالبہ کیا۔ یہ ہے ہماری تہذیب جو اپنے پیروکاروں کے اندر انسانیت و اخوت کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور اسلامی تہذیب ہی واحد تہذیب ہے جو اپنے ماننے والوں کے اندر اس طرح کا اعلیٰ اخلاق و کردار پیدا کر سکتی ہے۔

آئیے عیسائیوں کی قتل و خوں ریزی پر ہلکی سی نظر ڈالیں۔ اس قوم کی بربریت اور حیوانیت سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ صرف ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ جب وہ بیت المقدس

کی جانب بڑھے اور اکثر علاقوں پر قابض ہوگئے تو لوگ سمجھ گئے کہ وہ مغلوب ہوگئے، چنانچہ انہوں نے ان کے سپہ سالار سے اپنی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت لی۔ اس نے ضمانت دی اور سفید جھنڈا دیا کہ وہ مسجد اقصیٰ پر اسے لہرا کر اس میں داخل ہو جائیں۔ اب یہ لوگ اس میں داخل ہوگئے۔ اس میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور جوان سبھی لوگ تھے۔ پھر چشم فلک نے واضح طور پر دیکھا کہ عیسائی درندہ صفت فوجی مسجد مقدس میں داخل ہوئے اور تمام لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرنے لگے۔ معبد مذبح میں تبدیل ہوتا نظر آیا، پوری مسجد خون سے لت پت ہوگئی اور تمام شہریوں کو قتل کرکے گویا کہ پورے شہر کو پاک کر دیا گیا۔ عورت، بچے اور بوڑھے کسی کو نہیں بخشا گیا۔

لیکن صرف نوّے سال بعد اسلامی تہذیب کا ماننے والا صلاح الدین ایوبیؒ نے اس ملک کو فتح کیا، لیکن اس کی جانب سے اس طرح کی کشت و خون ریزی نہیں دیکھی گئی، وہاں کے باشندوں کی پوری حفاظت کی گئی، ان کے جان و مال محفوظ رہے، عزت و آبرو کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ اور وہاں پر تقریباً ایک لاکھ مغربی برادری کے لوگ تھے، ان پر کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی گئی۔ ان کے جان و مال کی حفاظت کی گئی، معمولی رقم لے کر باقاعدہ طور پر انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی، اور ان کو جانے کے لئے چالیس دن کا موقع بھی دیا گیا۔

ان دلائل و شواہد سے اسلام مخالف عناصر کا وہ الزام باطل اور بالکل غلط ہو جاتا ہے جو اسلامی تہذیب اور اس کے پیروکاروں پر

یہ لگاتے ہیں کہ اسلامی تہذیب اپنی بقاء و حفاظت کے لئے غیروں کی خوں ریزی کرنے سے گریز نہیں کرتی ہے، بلکہ وہ خود اپنی تہذیب کی حقیقت پر نظر ڈالیں اور خود اپنی تاریخ کو پڑھیں کہ کس طرح اپنے رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کی خاطر غیروں کی خوں ریزی کا کام ان کے شرمندہ درندہ ہاتھوں انجام پایا۔ (وہ اگر تاریخ اسلامی اور اپنی تاریخ کا بغیر کسی عصبیت کے مطالعہ کریں تو ان کا ضمیر و قلب اس بات کا اعتراف کرے گا کہ اسلام امن و آشتی اور فلاح و بہبود کے لئے جنگ کرتا ہے، اس کا ہر اقدام ظلم و تعدی اور جارحیت کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی جنگ کا مقصد غیروں پر ظلم و ستم کرنا، اور اپنی شان و شوکت اور سیادت و قیادت میں اضافہ کرنے کے لیے ہوتا ہے اور ان کے پاس کوئی ایسی مثال نہیں کہ ان کا کوئی اقدام حق و انصاف کے قیام کی خاطر ہوا ہو، اور کوئی جنگ انسانوں کی قتل و خوں ریزی اور ظلم و زیادتی سے پاک رہی ہو، وہاں کے لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کیا گیا ہو۔ انہیں محکوم و غلام بنا کر نہ رکھا گیا ہو۔ ان کے مال و متاع کو غضب کرنے اور مادی و اقتصادی اعتبار سے کمزور کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اور جہاں کے لوگوں نے ان کے خلاف آواز نہ اٹھائی ہو۔ اور جب وہ اس ملک کو چھوڑ کر گئے تو وہاں کی چیزوں کو لے نہ گئے ہوں) صرف اسلامی جنگ ہی ایک ایسی جنگ تاریخ کے صفحات پر نظر آتی ہے جہاں قتل و خوں ریزی بہت کم ہوئی کسی نے امان مانگی اسے امان دی گئی۔ ان کے جان و مال کی حفاظت کی گئی۔ اور جب وہاں سے گئے تو ان کی معمولی سی معمولی چیز واپس کر کے گئے۔ کسی چیز کو اپنے ساتھ لے جانا گوارا نہ کیا۔ — ختم شد —

قسط ۲

اجتہاد اور اس کے نئے آفاق پندرہویں صدی کی ایک تجدیدی ضرورت

(مولانا شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور ۵۷)

چنانچہ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھئے۔ جب اللہ تعالے نے ابلیس کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے تو اس نے اپنے غلط قیاس کے ذریعہ یہ استدلال کرنا چاہا کہ آدمؑ چونکہ مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اور میں آگ سے بنایا گیا ہوں، لہذا میرا مقام و مرتبہ آدمؑ سے اونچا اور بالاتر ہے، تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ تو اس موقع پر اللہ تعالے نے ابلیس کے استدلال (ARGUMENT) کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کو صاف صاف مردود اور لعنتی قرار دیا۔ کیونکہ اس نے خدائی حکم ماننے سے محض اپنے غلط قیاس کی بنا پر انکار کر دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدائی حکم کے مقابلے میں قیاس کام نہیں دے سکتا کیونکہ خدا کا حکم سراپا عدل ہوتا ہے جس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لہذا ایک مؤمن ومسلم کے لئے خدائی احکام کو محض استدلال کی بنیاد پر رد کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہاں البتہ وہ احکام الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے غور وفکر کے ذریعہ ان احکام کی حکمتیں اور مصلحتیں ضرور معلوم کر سکتا ہے، تاکہ وہ غیر مسلموں کو اپنی شریعت اور قانون کی معقولیت سمجھا سکے اور ان کے سامنے اسلامی شریعت کی برتری ثابت کر سکے کیونکہ اسلامی شریعت

---

۵۳ ۔ ملاحظہ ہو اعلام الموقعین، از۔ علامہ ابن قیم ۱/۳۹۱ مطبوعہ قاہرہ۔

سراپا عدل اور سراپا دانش ہوتی ہے۔

فہم نصوص میں اختلاف ہوسکتا ہے، اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ مجموعی اعتبار سے فہم نصوص میں اختلاف ہوسکتا ہے کہ ایک آیت سے کوئی عالم کچھ سمجھے تو دوسرا کچھ، کیونکہ قرآنی آیات میں بڑی لچک اور اس کے معانی میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ اور ان میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی و مطالب سمیٹ دیے گئے ہیں۔ جو حقیقتاً کلیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن سے بہت سے جزئی احکام وضع کیے جا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے حدیث شریف کے مطابق قرآن کو "جوامع الکلم" (جامع الکلمات) کہا گیا ہے۔[۱] چنانچہ امام ابن قیم رح اس سلسلے میں بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: کہ مقصود یہ کہ نصوص کے فہم میں لوگوں کا تفاوت ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی عالم کسی آیت سے ایک یا دو احکام ثابت کرتا ہے تو دوسرا اس سے دس یا اس سے زیادہ احکام نکالتا ہے۔ جب کہ کسی کا یہ حال بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آیت کے سیاق کو سمجھے بغیر محض ایک لفظ کے معنی ہی سمجھ سکے۔[۲]
چنانچہ اس کی مثالیں اور فقہاء کے محیر العقول کارنامے دیکھنے ہوں تو "احکام القرآن" کے موضوع پر مختلف مصنفین کی کتابیں دیکھنی چاہئیں۔ مثلاً علامہ جصاص رازی حنفی کی احکام القرآن اور قاضی ابوبکر ابن العربی کی احکام القرآن وغیرہ۔

---

[۱] بخاری کتاب الاعتصام ۱۰۰/۸ (۳۸) بعثت بجوامع الکلم مطبوعہ استنبول۔ [۲] اعلام الموقعین ۱/۳۹۷۔

اس اعتبار سے قرآنِ حکیم کے اسرار و عجائب کی کوئی انتہا نہیں ہے، جو دراصل اُس کا حیرت انگیز اعجاز ہے اور اسی بنا پر فقہاء کا اختلاف بھی "فہمِ نصوص" ہی کا اختلاف ہے جس کی بنا پر فقہ کے مختلف مسلک یا مکاتب فکر بن گئے۔ مگر قرآنی آیات کے فہم تفاوت کا یہ اختلاف "اجتہاد" کے ذیل میں نہیں بلکہ "تفسیر" کے ذیل میں آتا ہے۔

قیاس و اجتہاد کی حقیقت۔

اب رہا معاملہ فقہاء کے قیاس و اجتہاد کا تو یہ دراصل قرآن اور حدیث کے نصوص کے مسائل کا حل نکالنا ہے جو تشریح و تفسیر سے ایک زائد چیز ہے۔ اس کو قرآن اور حدیث کے "اُصول" سے "فروع" یا اُن کے "کلیات" سے "جزئیات" کا استنباط بھی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن اور حدیث میں بعض احکام (COMMANDMENTS) کی ایسی "علتیں" (REASONS) بیان کی گئی ہیں، جن کی بنیاد پر بعض غیر مذکور شدہ یا نئے مسائل کا حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں شراب کی حرمت کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ٥۔

اے ایمان والو جان لو کہ شراب، جوا، بتوں (کی تنصیب) اور فال کے تیر (چھوڑنا) یہ سب گندے ناکارہ شیطانی کام ہیں، لہٰذا تم ان سے باز رہو تا کہ نجات پا سکو

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ تم میں دشمنی اور بغض پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم باز آجاؤ گے (مائدہ: ۹۰-۹۱)

قرآن حکیم کی اس تصریح کے مطابق شراب کی حرمت اگرچہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اوّل وہ ایک گندہ کام (رجس) ہے، پھر وہ ایک شیطانی عمل ہے اور پھر یہ کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان عداوت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح اس کی سب سے بڑی خرابی یہ کہ جس کو یہ لت لگ جاتی ہے وہ یادِ الٰہی سے بالکل غافل اور بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس موقع پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر جس چیز کو "خمر" کہا گیا ہے وہ بذاتِ خود کیا چیز ہے؟ یعنی وہ کونسی شراب ہے؟ کیونکہ خمر کا اطلاق مختلف قسم کی شرابوں پر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام راغب تحریر فرماتے ہیں:

"خمر کی اصل کسی چیز کو چھپا لینا ہے۔ اور چونکہ وہ عقل کو چھپا دیتی ہے (یعنی اسکو زائل کر دیتی ہے) اس لیے شراب کا نام خمر پڑ گیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک خمر کا اطلاق ہر قسم کی نشہ آور شراب پر ہوتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک خاص کر انگور یا کھجور کی بنی ہوئی شراب کو خمر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا کہ خمر وہ ہے جو ان دو درختوں یعنی کھجور (یا) انگور سے بنی ہوئی ہو۔ اسی طرح بعض کے نزدیک خمر وہ ہے جو پکی نہ ہو"۔[۵]

اس بنا پر ممکن تھا کہ شراب اصلاً حرام ہوتے ہوئے بھی لفظی ہیر پھیر (کی بنا) پر حرام نہ رہ جاتی بلکہ امت کے لیے ایک فتنہ بن جاتی۔ لہٰذا حدیث (نبوی) میں صاف صاف نہ صرف یہ کہ اس کی صحیح تعریف کر دی گئی ہے بلکہ پوری وضاحت کے ساتھ ایک ایسا ضابطہ بھی بیان کر دیا گیا ہے جس کی بنا پر اس میں کسی

---

۵ المفردات فی غریب القرآن، ص ۱۲۰، مطبوعہ بیروت۔

بھی قسم کا شبہ نہ رہ جائے اور اس قسم کا کوئی بھی رخنہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ "صحاح ستہ" میں اس سلسلے کے بعض اصول مذکور ہیں۔ مثلاً:۔
كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ۔ ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔[7]
كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ۔ ہر وہ مشروب جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔[8]
مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ۔ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ لائے اسکی تھوڑی [مقدار بھی حرام ہے۔[9]]
ان تین کلیات میں اتنی جامعیت ہے کہ نہ صرف شراب بلکہ دنیا کا ہر وہ مشروب جو نشہ آور ہو وہ سب حرام قرار پا سکتا ہے۔ اور اس باب میں کسی قسم کا استثناء نہیں ہے۔[10] اور جو چیز زیادہ پینے سے نشہ لا سکتی ہے اس کی تھوڑی سی مقدار یا اس کا چکھنا بھی حرام ہے۔ اسی طرح ان صریح احادیث سے اس سلسلے کے سارے "چور دروازے" بند ہو جاتے ہیں۔

غرض اس طرح "نص حدیث" کے مطابق ماحصل یہ ہوا کہ جو بھی چیز نشہ آور ہو وہ حرام ہے۔ کیونکہ اس کے باعث دینی و دنیوی دونوں اعتبار سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ دورِ قدیم میں فقہاء نے شراب کی حرمت کی وجہ "نشہ" قرار دے کر حکم لگایا کہ وہ نبیذ (کھجور وغیرہ کا شیرہ) جو نشہ لائے اس کا بھی یہی حکم ہے، اگرچہ یہ لفظ قرآن اور حدیث میں مذکور نہ ہو۔ کیونکہ ایک اصولی حکم اور اسکی علت (REASON) معلوم ہو جانے کے بعد جس چیز میں بھی یہ علت موجود ہو گی وہ حرام ہو جائے گی۔[11]

---

[7] صحیح مسلم، کتاب الاشربہ، ۳/۱۵۸۷، مطبوعہ ریاض۔ [8] صحیح بخاری، کتاب الوضوء، ۱/۶۶، مطبوعہ استانبول۔ [9] سنن ابی داؤد، کتاب الاشربہ، مطبوعہ حمص (شام)۔ [10] واضح رہے کہ عربی زبان میں اردو کے برعکس لفظ "شراب" مشروب کے معنی میں آتا ہے۔ اور اس کے اعتبار سے وہ پانی یا دودھ وغیرہ بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ اصل شراب کو خمر کہا جاتا ہے۔ [11] دیکھئے کتاب "اصول الفقہ" از محمد خضری بک، ص ۳۰۰ تا ۳۰۲ نیز "علم اصول الفقہ" از عبد الوہاب خلاف، ص ۶۳۔

"قیاس" کے لفظی معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اور اصول فقہ کی اصطلاح میں اس سے مراد "حکم شرعی کسی علت کی بنیاد پر ایک چیز کا حکم دوسری چیز پر لگانا ہے"[۱۲] یعنی دو چیزوں کا حکم مشترک علت کی بنیاد پر ایک قرار دینا ہے۔

اس اعتبار سے موجودہ دور میں جو نئی نئی قسم کی شرابیں بن رہی ہیں مثلاً شیمپین، وسکی، رم، بیئر اور برانڈی وغیرہ یہ سب اسی علت کی بنا پر حرام ہیں۔ اور اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جس چیز کی کثیر مقدار سے نشہ آسکتا ہے اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ مجھے فلاں فلاں قسم کی شراب سے نشہ نہیں ہوتا یا اتنی مقدار سے نشہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا مجھے اس کی اجازت ملنی چاہیئے۔ اس قسم کے استثناء کی ایک دائمی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ خدائی قانون ہر فرد، ہر دور اور ہر جگہ کے لئے ایک ہوتا ہے۔

اسی طرح موجودہ دور کے نئے نئے نشے مثلاً افیم، گانجہ، بھنگ، حشیش، ہیروئن، اور براؤن شوگر وغیرہ ہر قسم کے منشیات (DRUGS) بھی حرام ہیں۔ کیونکہ ان سے بھی نہ صرف یہ کہ عقل فاسد ہو جاتی ہے بلکہ انسانی صحت پر اس کے بہت برے اثرات پڑتے ہیں۔ اب دیکھئے یہ تمام چیزیں اسلامی شریعت میں لفظاً تو موجود نہیں ہیں۔ مگر معنوی طور پر ان سب کا احاطہ چودہ سو سال پہلے ہی کر لیا گیا ہے۔ یہی حال دیگر تمام مسائل کا بھی ہے۔ اس طرح ہر نئے پیش آنیوالے مسئلے کا حکم اسلامی شریعت میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔

یہ ہے اسلامی نقطۂ نظر سے قیاس و اجتہاد کی صحیح حقیقت و ماہیت کہ وہ جدید مسائل و مشکلات جن سے انسانی معاشرہ کسی دور میں دو چار ہوتا ہے۔ ان کا شرعی نقطۂ نظر سے حکم معلوم کرنا یا ان مسائل کے تعلق سے شریعت کا نقطۂ نظر

[۱۲] المدخل الیٰ علم اصول الفقہ، از ڈاکٹر معروف دوالیبی، دمشق، ۱۹۵۵ء

واضح کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف ایک انسانی اور تمدنی ضرورت ہے بلکہ خود ایک شرعی فقہی ضرورت بھی ہے کیونکہ شریعت نوع انسانی کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہے۔ لہٰذا نئے نئے مسائل میں انسان کی رہنمائی کرنا شریعت کا فرض ہے اور یہ فریضہ ہر دور میں اہل شریعت پر عائد ہوتا ہے۔ کہ اُن کے درمیان ہر دور میں ایسے مجتہد ضرور موجود ہوں جو نئے نئے مسائل کا حل معلوم کرکے عالم انسانی کی صحیح رہنمائی کرتے رہیں۔ ورنہ شریعت کے دعوائے کمال و دوام پر حرف آسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک کامل اور دائمی شریعت کا مطلب یہی تو ہے کہ وہ ہمیشہ مشکل مسائل اور تقاضہ جات کو اپنے ابدی اُصولوں کی روشنی میں حل کرتی رہے۔ اس لحاظ سے اہل شریعت کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا اب انہیں اپنی ذمہ داریاں کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اس میدان میں پیش رفت کرنی چاہیئے۔

احکام شریعت میزان عقل کے مُطابق۔

اس بحث سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عقلی اعتبار سے جو چیزیں مضر صحت ہوتی ہیں، اُن سب کو اسلامی شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار اسلامی شریعت نہ صرف ایک معقول اور برتر شریعت ثابت ہوتی ہے جو نوع انسانی کے مفاد کے لئے نازل کی گئی ہے، بلکہ وہ ایک پاکیزہ اور صحت مند قانون کی حامل بھی نظر آتی ہے جس میں نوع انسانی کا تحفظ اور اس کی بقاء کا راز مضمر ہے۔ جب کہ دنیا کے دیگر مذاہب اور قوانین میں شراب پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یا اگر ہے بھی تو محض برائے نام۔ اس اعتبار سے بھی اسلام اور دیگر مذاہب کا فرق بالکل واضح ہے۔

غرض اسلامی شریعت عقلی و استدلالی اعتبار سے ایک ایسے اعلیٰ مقام پر فائز ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی شریعت اور کوئی قانون نہیں کر سکتا۔

چنانچہ علامہ ابن قیمؒ اپنی ایک قابل قدر اور معرکۃ الآراء کتاب "اعلام الموقعین" میں قیاس و اجتہاد کے موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "احکام شریعت کے تمام تمام قیاس صحیح کے موافق ہیں۔ اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی حکم صحیح کی میزان کے خلاف نہیں ہے" [۳۱]

گویا کہ احکام شریعت سراپا علم و عقل ہیں جنہیں کسی بھی دور میں "علوم انسانی" منطق صحیح کی بنیاد پر چیلنج نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ خدائی علم و حکمت پر مبنی ہونے کی بنا پر سراپا عدل اور سراپا مصلحت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینی احکام میں غور و خوض کر کے ان کی علتیں اور حکمتیں معلوم کرنے پر زور دیا گیا ہے، جیسا کہ تفصیل پچھلے ابواب میں گزر چکی ہے۔ چنانچہ علامہ ابو اسحاق شاطبی مالکی (متوفی ۷۹۰ھ) اس سلسلے میں اپنی کتاب "الموافقات" جو اصول شریعت کی ایک جلیل القدر تصنیف ہے) میں تحریر فرماتے ہیں کہ: "شرعی دلیلیں عقلی امور و قضایا کے منافی نہیں ہوتیں" (الادلۃ الشرعیۃ لا تنافی قضایا العقول [۳۲]) اور پھر اس اصول کی تشریح کئی صفحات میں کی ہے۔

اسلام میں قیاس کا مقام

غرض قیاس انسانی فطرت میں داخل ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا دین میں بھی وہ پوری طرح مطلوب ہے۔ اور اس اعتبار سے دین و فطرت کا ربط و تعلق بھی پوری طرح ظاہر ہوتا ہے اور اس

---

[۳۱] اعلام الموقعین ۱/۳۹۱، مطبوعہ قاہرہ۔

[۳۲] الموافقات، از ابو اسحاق شاطبی ۳/۲۷، مطبوعہ بیروت، ۱۳۹۵ھ۔

اعتبار سے وہ دینِ دین نہیں ہوسکتا جو انسانی فطرت اور اس کے داعیات کے خلاف ہو۔ یعنی جو انسانوں کے عقل و قیاس پر پابندی لگانے کی کوشش کرتا ہو۔ مگر اسلام میں نہ صرف یہ کہ صحیح عقل و قیاس کی تعریف کی گئی ہے بلکہ عقل و قیاس کو کام نہ لانے والے کی مذمت کرتے ہوئے انہیں چوپائے قرار دیا گیا ہے۔ اس سے آپ اسلام میں عقل و خردمندی کی اہمیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ جب کہ دنیا کے دیگر بڑے بڑے مذاہب میں عقل و خرد کا کوئی کام ہی نہیں ہے۔

اسلام میں قیاس و اجتہاد کا دروازہ سب سے پہلے خود صحابہ کرام نے کھولا تھا۔ خصوصاً خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں چند رہنما اصول قائم کیے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ کا وہ مکتوب گرامی جو آپ نے والیٔ بصرہ ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا تھا وہ اصول فقہ کی ایک بیش بہا تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے، جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا:-

.... ثُمَّ الْفَهْمَ الْفَهْمَ، فِيمَا أَدْلَى إِلَيْكَ مِمَّا وَرَدَ عَلَيْكَ مِمَّا لَيْسَ فِي قُرْآنٍ وَلَا سُنَّةٍ، ثُمَّ قَايِسِ الْأُمُورَ عِنْدَ ذَلِكَ، وَاعْرِفِ الْأَمْثَالَ، ثُمَّ اعْمِدْ فِيمَا تَرَى إِلَى أَحَبِّهَا إِلَى اللهِ وَأَشْبَهِهَا بِالْحَقِّ۔

ہاں دیکھو اُن تمام امور میں فہم و ادراک سے کام لینا جو تمہارے سامنے پیش ہوں، جن کا حکم قرآن اور سنت میں موجود نہ ہو۔ تو تم ایسے وقت معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرو اور مثالوں کو۔ اچھا تو پھر تم اپنی رائے میں اس فیصلے کو اختیار کرو جو خدا کی نظر میں زیادہ پسندیدہ اور اقرب الی الحق ہو۔[۱۵]

---

۱۵ اعلام الموقعین، ۱/ ۹۲۔

حضرت عمرؓ کا یہ اصول آج "اصول فقہ" کی ایک مستند ترین بنیاد ہے۔ اور اس میں "مثالوں کو پہچاننے" کی جو بات کی گئی ہے وہ دین و شریعت اور فقہ کی ایک اہم ترین اساس ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام ابن قیم تحریر فرماتے ہیں کہ "ہم مثل چیزوں کو ایک دوسرے سے ملانا یا ایک مثال کو دوسری مثال سے سمجھنا ہی دین کی اصل ہے۔ اور اسی وجہ سے شارع نے اپنے احکام میں ایسی علتیں اور صفتیں بیان کی ہیں جن کے ذریعہ ایک حکم کا تعلق دوسرے سے ظاہر ہو۔ اور جہاں کہیں بھی یہ علت پائی جائے اس پر وہی حکم لگایا جائے"۔ [۱۶]

اس قسم کے قیاس عقلی (ایک چیز کو دوسرے کے مطابق سمجھنے) کا حال خود قرآن حکیم ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ جس میں چالیس سے زیادہ عقلی مثالیں (امثال) بیان کی گئی ہیں، جو عقلی قیاسات ہی کی مثالیں ہیں چنانچہ قرآن میں حیات ثانی کو امکان کے اعتبار سے حیات اول پر قیاس کیا گیا ہے۔ اور موت کے بعد مُردوں کی دوبارہ زندگی کو بارش کے بعد زمین پر رونما ہونے والی سرسبزی و شادابی کو "زمین کی مردہ حالت کے بعد دوبارہ اس کی زندگی پر قیاس کیا گیا ہے۔ (یعنی جس طرح بارش ہونے کے بعد زمین دوبارہ جان پڑتی ہے۔ گویا کہ وہ مردہ حالت سے دوبارہ زندگی کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسانی زندگی دوبارہ ممکن ہو سکتی ہے) اس طرح کی بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں، [۱۷] جن میں عقل و استدلال پر ابھارا گیا ہے۔ چنانچہ حیاتِ ثانی کو حیات اولی پر قیاس کرنے کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

وَاللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ۔ اور وہ اللہ ہی ہے

---

[۱۶] اعلام الموقعین، ۱/۲۱۴-۲۱۵۔

[۱۷] ایضاً، ۱/۱۴۱ (ماخوذ)

جس سے ہوئیں چلاتی ہیں جو بادل کو اٹھائے پھرتی ہیں۔ پھر ہم اس بادل کو ایک مرے ہوئے شہر (خطہ ارض) کی طرف ہانکتے ہیں اور اسی کے ذریعہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح تمام انسانوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ (فاطر: ۹)

مثال کا تعلق چونکہ علم و عقل سے ہوتا ہے اس لئے مثالوں کو سمجھنے کے لئے عقل و آگاہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ حسب ذیل آیت میں اسی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ:

یہ مثالیں جن کو ہم لوگوں کے لئے بیان کر رہے ہیں۔ ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں (عنکبوت: ۴۳)

قیاسِ فاسد تمام گمراہیوں کی جڑ ہے

یہ قیاس و اجتہاد کے بارے میں ایک سرسری جائزہ تھا۔ مگر اس موقع پر یہ حقیقت خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ قیاس کے صحیح ہونے کے لئے شرائط ہیں، جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ قیاس باطل بھی ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے قیاس کی دو قسمیں ہیں:

ایک قیاس صحیح اور دوسرے قیاس فاسد۔ اور دونوں کی تعریف حسب ذیل ہے:

۱۔ قیاس صحیح یہ ہے کہ دو ہم مثل چیزوں کو یکجا کیا جائے۔[۱] جیسا کہ پچھلے صفحات کے مطابق "نشہ" کی بنیاد پر پائی جانے والی مختلف چیزوں پر یہ حکم لگایا گیا کہ وہ حرام ہیں۔ کیونکہ ان تمام چیزوں میں نشہ کی مشترک علت موجود ہونے کے باعث وہ سب "ہم مثل" یعنی ایک ہی

---

[۱] ۔ اعلام الموقعین ۱/ ۱۳۱

درج ہیں۔

۴۔ اور قیاس فاسد دو مختلف (علتوں والی) چیزوں کو اکٹھا کرنیکا نام ہے۔ یعنی ایسی دو چیزیں جن میں علت (REASON) مشترک نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی دو مختلف چیزوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ شراب بھی ایک "مشروب" ہے اور دودھ بھی ایک "مشروب" (پینے والی چیز) ہے، لہٰذا ان دونوں کو حلال یا ان دونوں کو حرام ہونا چاہیئے تو یہ ایک غلط قیاس ہوگا کیونکہ شراب کی حرمت اس کی "مشروبیت" کے باعث نہیں بلکہ اس کے نشہ پیدا کرنے کی وجہ سے ہے جو دودھ میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں میں "علت" مشترک نہ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا۔ دورِ جاہلیت میں مشرکینِ عرب نے اسی قسم کے غلط قیاس کی بنا پر سُود کو بھی بیع (تجارت) پر قیاس کرتے ہوئے استدلال کیا تھا کہ جس طرح تجارت میں "بڑھوتری" پائی جاتی ہے اسی طرح سُود میں بھی یہی چیز پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیئے:

قَالُوٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا: انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کے مانند ہے۔ (بقرہ: ۲۷۵)

غرض ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں کہ "قیاس" عدلِ الٰہی ہے، جس کے ساتھ اس نے اپنے نبیؐ کو بھیجا ہے۔ چنانچہ خدا کی شریعت (بقیہ

۴۹ ایضاً۔

قیاس صحیح کے مطابق ہوتی ہے اور وہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ اور قیاس صحیح کی یہ شرط نہیں ہے کہ ہر شخص اس کی صحت کا حال معلوم کر لے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص شریعت کے کسی حکم میں مخالف قیاس کوئی چیز دیکھتا ہے تو وہ در اصل ایسا قیاس ہے جو خود اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے جبکہ وہ حقیقتاً قیاس صحیح کے مخالف نہیں ہے۔ اور جب کبھی ہم کو ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ کوئی "نص" خلاف قیاس وارد ہوئی ہے تو وہ در اصل قیاس فاسد کی قبیل سے ہوگی۔ لہذا شریعت میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو قیاس صحیح کے مخالف ہو۔ ہاں البتہ وہ قیاس فاسد کی مخالف ہو سکتی ہے۔ اگرچہ بعض لوگ اس کے فساد سے لاعلم ہوں" [۲۰]

پھر موصوف دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "قیاس فاسد کا شریعت میں ہمیشہ ابطال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سود کو تجارت پر قیاس کرنے، مردار کو ذبح کئے ہوئے جانور پر قیاس کرنے اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بتوں پر قیاس کرنے کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ نے حضرت عیسٰیؑ کو اپنا مقبول بندہ اور رسول قرار دیا ہے، جنھوں نے لوگوں کو اپنے معبود قرار دئے جانے سے منع کیا تھا۔ لہٰذا اس بنا پر آپ عذاب الٰہی کے مستحق نہیں بن سکتے۔ بخلاف مشرکین کے بتوں کے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں امور قیاساً ایک درجے میں نہیں ہیں۔" [۲۱]

موصوف اس سلسلے میں مزید تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کا قیاس کرنے والا سب سے پہلا فرد ابلیس تھا اور آفتاب و مہتاب کی عبادت بھی

---

[۲۰] اعلام الموقعین، ص ۴۳۱-۴۳۲۔

[۲۱] اعلام الموقعین، ۱/۴۶۰۔

اسی قسم کے فاسد قیاس کی بنا پر کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ادیان و مذاہب میں جو بھی بد عنوانی اور فساد پرور اُمور نے جگہ پائی ہے وہ سب قیاس فاسد ہی کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں۔ خود اسلام میں جو گمراہ فرقے انحرافات کا شکار ہوئے مثلاً فرقہ جہمیہ نے اللہ کی صفات، اس کی علویت، اس کا عرش پر مستوی ہونا، اس کا اپنے بندوں سے کلام کرنا اور آخرت میں اس کی رؤیت ثابت ہونا وغیرہ اُمور کا جو انکار کیا وہ سب اسی قیاس فاسد کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح فرقۂ قدریہ نے اللہ تعالیٰ کی عمومی قدرات و مشیت کا انکار بھی اسی قیاس فاسد کی بنا پر کیا ہے۔ رافضیوں کی گمراہی بھی اسی قیاس فاسد کی بنیاد پر ہے۔ جس کے باعث وہ اللہ کے محبوب بندوں کے دشمن ہیں اور صحابۂ کرام کی تکفیر کرتے اور انھیں بُرا بھلا کہتے ہیں اور اسی طرح ملحد اور دھریئے بھی مُردوں کے دوبارہ جی اُٹھنے آسمانوں کے پھٹنے[۲۲] اور دنیا کے اختتام کا انکار بھی اسی قیاس فاسد کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ اس طرح مجموعی اعتبار سے دُنیا میں جو بھی فساد برپا ہو رہا ہے اور جو خرابیاں رونما ہو رہی ہیں وہ سب کی سب قیاس فاسد ہی کی بنا پر ہیں۔[۲۳]

قیاس فاسد اور مخالف شریعت تحریکیں

یہ ایک فکر انگیز بیان ہے۔ جو حقائق و معارف سے بھرپور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قیاس صحیح اور قیاس فاسد کی اس سے زیادہ جامع اور مفصل تعریف شاید ہی کسی نے کی ہو۔ اس فکر انگیز بیان سے یہ حقیقت بھی پوری طرح کھل کر سامنے

---

۲۲ دور قدیم میں یہ ایک فلسفیانہ مسئلہ تھا۔ کہ "آسمان" نہ تو پھٹ سکتا ہے اور نہ پھٹنے کے بعد دوبارہ جڑ سکتا ہے۔

۲۳ اعلام الموقعین، ۱/ ۲۶۰-۲۶۱۔

آجاتی ہے کہ آج اسلامی شریعت کے خلاف جو سازشیں اور شورشیں ہو رہی ہیں اور اس سلسلے میں خواہ کسی قسم کا جو واویلا مخالفین اسلام کے علاوہ خود بعض منافقین امت کی طرف سے برپا کیا جا رہا ہے وہ سب اسی قسم کے کیا اس جاسوس کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ مغالطوں کے ذریعہ وہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح ثابت کرکے اسلامی پر شبخون مارنا چاہتے ہیں۔ یعنی چور دروازوں کے ذریعہ خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام اور اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر دینا منصوبہ بنا رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔

اے ایمان والو ان پاک چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے آگے نہ بڑھو کیونکہ اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو نا پسند کرتا ہے (مائدہ ۸۷)

اسلامی شریعت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ خدا کی حلال کردہ چیزوں کو کوئی بھی حرام قرار نہیں دے سکتا اسی طرح اس کی حرام کردہ چیزوں کو کوئی بھی حلال قرار نہیں دے سکتا۔ اس قسم کا اختیار تو خود رسولؐ کو بھی نہیں تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک واقعہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عصر کے بعد آپؐ اپنی بیویوں کی خبر گیری کے لئے ہر ایک کے یہاں تھوڑی تھوڑی دیر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت زینبؓ کے ہاں آپؐ معمول سے زیادہ وقت ٹھہر گئے اور وہاں آپؐ نے شہد تناول فرمایا۔ اس پر مجھے رشک آیا تو میں نے حفصہؓ سے اس بارے میں مشورہ کیا اور طے پایا کہ حضورؐ ہم میں سے جس کے پاس بھی آئیں وہ یوں کہے کہ آپؐ نے مغافیر (ایک قسم کا بدبودار گوند) نوش فرمایا ہے۔ قصہ مختصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

چونکہ مغافیر سے طبعاً سخت کراہت تھی اس لئے آپ نے قسم کھالی کہ میں کبھی شہد نہ کھاؤں گا۔

اس پر حسب ذیل آیت کریمہ نازل ہوئی۔

یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝:

اے نبی آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جس کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے کیا آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ اللہ بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔ (تحریم ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت کا اصل شارع صرف اللہ تعالی ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں خود رسول اللہ صلعم کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا کہ خدا کے نازل کردہ کلام (یا اس کے دعاوِ شریعت) میں تبدیلی کا مجھے مطلق اختیار نہیں ہے:

قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ أَنْ أُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا یُوْحٰٓى إِلَیَّ: کہدو کہ یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو صرف اسی بات کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بذریعہ وحی بھیجی جاتی ہے (یونس ۵)

مگر اب مخالفین اسلام اور ان کے حامی بعض "مسلمان" الٰہی شریعت کو بدل کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا اور ان پر جاہلیت کے فیصلے مسلط کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے کبھی تو وہ چور دروازوں کی تلاش کرتے ہیں اور کبھی "ریکساں سول کوڈ" کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اور ان کے استدلال کی بنیاد محض "قیاس فاسد" ہے۔ چنانچہ آج خدا کے مشروع کردہ قانون طلاق اور تعدد ازواج وغیرہ پر روک لگانے کے سلسلے میں جو بھی آوازیں بلند کی جارہی ہیں اُن سب کی بنیاد اسی "قیاس فاسد" پر ہے۔ چنانچہ قیاس فاسد اور مغالطوں کا سہارا لیکر

حق کو ناحق اور ناحق کو ثابت کرنے کا کاروبار آج پورے زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔

قیاس فاسد کا بانی ابلیس ہے۔

اس سلسلے میں علامہ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں: "دنیا کا سب سے پہلا گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی قیاس فاسد کی بنیاد پر تھی اور یہی قیاس فاسد حضرت آدمؑ اور آپؑ کی اولاد میں بھی اسی قیاس کے مرتکب (ابلیس) کے ذریعہ داخل ہوگیا۔ لہٰذا دنیا اور آخرت کے تمام شر و فساد کی اصل یہی قیاس فاسد ہے"۔ ۲۲؎

چنانچہ ابلیس پہلے تو قیاس فاسد کے ذریعہ خود لعنتی اور مردود قرار پایا۔ پھر اس نے اسی قیاس فاسد کے ذریعہ حضرت آدمؑ کو بھی بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ اور حضرت آدم و حوا نے اسی قیاس فاسد کے ذریعہ اس چالاک دشمن کے فریب میں آکر شجرِ ممنوعہ کو چکھ لیا۔ جس کے باعث دونوں پر عتابِ الٰہی نازل ہوا۔ اس فریب دہی کی تفصیل قرآن حکیم میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝

پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکایا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے اور کہا کہ تمہارے رب نے اس درخت کے (کھانے) سے محض اس لئے روکا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ

۲۲؎ اعلام الموقعین ۱/۲۶۲

(ختم شد)

(قسط ۲)

شہید ملت میرواعظ کشمیر مولوی محمد فاروق

حیات، خدمات اور کارنامے

ایک سرسری جائزہ

(از:- محمد سعید الرحمٰن شمس - مدیر نصرۃ الاسلام، کشمیر)

اس لیے ان حالات کے پیش نظر "ایمنسٹی انٹرنیشنل" جیسی انسانی حقوق کی محافظ تنظیم کی توجہ اس طرف مبذول کرانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بھارت سرکار (جو دنیا میں سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے) پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ وہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی چارٹر پر عمل درآمد کرے اور کشمیر کے لوگوں کے انسانی و جمہوری حقوق کو بحال کرے میری درخواست ہے کہ:

"کشمیر کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اور بچشم خود انسانی حقوق کی پامالی، بے گناہ نوجوانوں کی اندھا دھند گرفتاری۔ آئین و قانون کی بیخ کنی اور خوف و دہشت کے ماحول کا مشاہدہ کرنے کے لیے "ایمنسٹی انٹرنیشنل" اپنا ایک وفد (. Amnesty International) کشمیر بھیجنے کا نظم کرے۔" (میرواعظ مولوی محمد فاروق)

حقیقت یہ ہے کہ جامع مسجد پولیس آپریشن کے بعد ظلم و بربریت، تشدد و جارحیت، سرکاری دہشت گردی اور انسانی حقوق کی سنگین نوعیت کی پامالی ایک طویل داستان ہے۔ شبانہ یوم وادی کشمیر میں کوئی لمحہ ایسا

نہیں گذرتا ہے کہ یہاں کے نہتے، مظلوم و بے گناہ لوگوں کو گولیوں کا نشانہ نہ بننا پڑتا ہو۔

اتحاد و اتفاق کے داعی

شہید ملت میرواعظ مولوی محمد فاروق کی یہ زبردست دلی خواہش اور مسلسل کوشش تھی کہ مسلمانانِ عالم وحدت کلمہ کی بنیاد پر متحد و منظم ہو جائیں اور صیہونی، سامراجی، اور لادین قوتوں کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ناپاک سازشوں کو ناکام بنائیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے ملک اور ملک سے باہر دورہ کر کے عوام و خواص سے خطابات کیے اور باہمی اتحاد اتفاق اور عالمگیر اخوت کا پیغام عام کرنے کے لیے جو مثبت کوششیں کیں۔ وہ ایک مستقل موضوع ہے۔ تاہم ۱۹۸۰ء دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ میں تقریباً ۳۰ لاکھ فرزندانِ توحید کے فقید المثال اور عظیم الشان اجتماع سے شہید ملت کا تاریخی اور انقلاب انگیز خطاب اور اس سے قبل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی علمی مجلسوں میں تقاریر و بیانات، ۱۹۸۲ء میں شہید ملت کا علامہ خمینی مرحوم کی خصوصی دعوت پر دورۂ ایران، ۱۹۸۴ء میں جنوبی ہند کی تین اہم ریاستوں، تامل ناڈو، کرناٹک، اور آندھرا پردیش کے مرکزی مقامات کا تفصیلی دورہ، اور پھر دہلی، کلکتہ، بمبئی، بڑودہ، کانپور اور گجرات کے بعض مرکزی مقامات کا دورہ اور عوامی اجتماعات سے اہم خطابات اور پھر ۱۹۸۵ء میں سعودی عرب سمیت مختلف خلیجی ممالک کا طوفانی دورہ اسی تڑپ، فکر اور جذبہ کی وجہ سے تھا جو شہید ملت کی زندگی کا مقدس مشن اور نصب العین تھا، شہید ملت میرواعظ مرحوم مسلمانانِ

ریاست کے باہمی اتحاد و یکجہتی کے بھی سب سے بڑے علمبردار اور داعی تھے
اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے کہ جس میں ملت کے خواص
اور "دل و دماغ" کو اکٹھے ایک ہی مجلس میں جمع کر سکیں۔

۱۹۸۳ء کے انتخابات میں شہید ملتؒ نے قوم کے اجتماعی اور وسیع تر
مفاد کی خاطر نصف صدی کا ناسور "شیر بکرا تنازعہ" کو دفن کرنے کے
لیے ایسی سیاسی حکمت عملی اپنائی جس سے ریاست میں مسلمانوں کے
باہمی اتحاد و اتفاق کو زبردست فروغ ملا بلکہ آگے چل کر اقدام کشمیر میں
حالیہ تحریک کی بنیاد فراہم کرنے میں نمایاں تر رہا، داخلی و خارجی سازشوں
کے باوجود شہید ملتؒ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

شہید ملتؒ اور دعوت و تبلیغ

شہید ملت میر واعظ
مولوی محمد فاروق رح

دعوتِ الی اللہ کے جذبات سے سرشار اور فکر اسلامی کے حامل تھے پوری
زندگی بنیادی لحاظ سے اس مقدس مشن کی آبیاری کرتے رہے اور لوگوں
لوگوں تک دعوت حق پہونچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آپ بے پناہ
مشکلات مسائل اور ناموافق حالات کے باوجود امت مسلمہ کو عموماً اور
اہل کشمیر کو خصوصاً اسلام کا والہ اور شیدائی بنانے، انہیں اسلامی تعلیمات
دینی اقدار، ملی تقاضوں اور اپنے انفرادی تشخص سے روشناس کرانے کی
بھرپور کوشش کرتے رہے وہ اسلام کو ایک مکمل دین اور ضابطۂ حیات
سمجھتے تھے اور ایک فلاحی اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے خداترس اور
باخبر قیادت اور افراد کی تربیت پر زور دیتے رہے۔

"امت مسلمہ" کی کامیابی اور سربلندی کے لیے اسلام، ایمان، اتحاد،

خلاف و ایثار کے ساتھ ساتھ ان کے مابین عملی اشتراک و تعاون اور اتحاد و اتفاق کو ناگزیر قرار دیتے رہے۔ آپؒ کی پوری زندگی اسی فکر و نظریہ جہد کی آئینہ دار رہی۔ شہید ملتؒ اسلام کی سربلندی، ملی وقار کی بحالی اور وطنِ عزیز کی آزادی کی خاطر اپنی ہی سرزمین میں شہید کئے گئے۔ شہادت کے آخری لمحہ تک شہید رہنما نہایت ہی دانشمندی، بالغ النظری اور ہوشمندی کے ساتھ کشمیری عوام کی سیاسی قیادت اور دینی تربیت اور اخلاقی تعمیر میں مصروف رہے۔ ان کی زبان حق گوئی اور حق شناسی سے کبھی باز نہیں رہی۔

شہیدِ ملتؒ کشمیر سمیت عالم اسلام کے دینی منصب کی رونق، علم و دانش، سوجھ بوجھ اور فکر و فہم کے ساتھ انسانی محبت اور عظمت کا مظہر، اور اخلاق و اخلاص کے پیکر بھی تھے۔ شہید ملتؒ دینِ اسلام کے بلند پایہ داعی، وسیع النظر عالم دین، مفکرِ اسلام، دانشور اور مصلح قوم تھے۔

شہید ملتؒ نہ صرف ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل مذہبی اور سیاسی رہنما تھے بلکہ اسی کے ساتھ عالم انسانیت کے سچے بہی خواہ، کشمیریوں کے بے باک ترجمان اور وحدت انسانی کے علمبردار اور پیام انسانیت کے سفیر تھے۔ آپؒ نے پوری زندگی اپنے قول و فعل اور کردار و گفتار سے اسلام، ایمان اور اتحاد کے بنیادی اصولوں کی آبیاری کی اور آخر میں حق و انصاف اور اسلام و آزادی کی خاطر اپنی قیمتی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا۔

اسلاف کی روایات کے امین

شہید ملت میرواعظ مولوی محمد فاروق [illegible]

معروف اور معرکتہ الآراء خاندان "میرواعظین" کی روایات کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ بدلتے ہوئے زمانہ، نازک سیاسی صورتحال، اور [illegible]

معاشرہ اور تمدن کے متعلق اس میں نئے فکر و نظر، جدید مطالعہ، حقیقت پسندی اور کشمیر سے باہر ملک کے ملی مسائل و مصائب کا علم و احساس۔ مختلف ملی جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل اور عالم اسلام کے ساتھ وابستگی اور ربط و تعلق کا اضافہ کیا۔

شہید ملت ریاست کے قدیم تعلیمی، دینی، ثقافتی ادارہ "انجمن نصرۃ الاسلام" اور "انجمن اوقاف جامع مسجد" کی سربراہی کے علاوہ ملک کی متعدد اسلامی تنظیمات خاص طور پر "کل ہند مسلم مجلس مشاورت" اور "کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ" کے معزز رکن کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوتے رہے اور اس طرح پورے ملک کے مسلمانوں کے ملی اور سیاسی مسائل حل کرانے کے لیے تعمیری جدوجہد آپ کا ایک منفرد کردار تھا۔

شہید ملت ہر سال بیسیوں اجتماعات سے مخاطب ہوتے اور لاکھوں انسانوں تک پیغام حق پہونچاتے۔ یہ اجتماعات خالص دینی بھی ہوتے جن میں قرآن و حدیث اور مسائل دینیہ کا بیان ہوتا اور دنیوی اجتماعات بھی ہوتے جن میں مسائل تعلیم، معاش و معیشت اور عوام کے سماجی، اصلاحی پہلو اور امور بھی زیر بحث آتے۔ اور خاص خاص مرحلوں پر سیاست بھی زیر غور ہوتی۔ اس میں ریاست جموں و کشمیر کی سیاست اہم ترین موضوعات میں سے ہوتی۔ لیکن ایسے مواقع بھی آتے کہ جب اپنی اسٹیٹ کی سیاست سے ایک قدم آگے بڑھا کر پورے ملک کی سیاست اور ہند و پاک کے تعلقات پر اظہار خیال میر واعظ کی تقریر کا موضوع بن جاتے حتیٰ کہ عالم اسلام کے مسائل اور بین الاقوامی سیاست بھی شہید ملت کے موضوعات کے دائرے میں آجاتے۔!

شہید ملتؒ اور اکابر علم وفضل

شہید ملت میرواعظ کشمیر مرحوم کا ملک میں صغیر اور عالم اسلام کے چوٹی کے علماء وفضلاء، دانشوروں، سیاست دانوں، سفارت کاروں، صحافیوں اور ادیبوں سے خصوصی علمی روابط، تعلقات اور اکثر وبیشتر کے ساتھ باہمی مراسلت اور مکاتبت بھی تھی۔ ملک کے جن اکابر علم وفضل سے اکثر وبیشتر مختلف تقریبات کے مواقع پر ملاقاتیں رہتیں ان میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مبلغ اسلام حضرت مولانا سید ارشاد احمدؒ، محقق زماں پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا مہاجر مدنیؒ، حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی، شیخ التفسیر مولانا سید انظر شاہ کشمیری، خطیب عصر مولانا محمد سالم القاسمی، جناب مولانا سید اسعد المدنی، جناب مولانا عبدالکریم پاریکھ، جناب مولانا اخلاق حسین قاسمی، جناب قاضی زین العابدین میرٹھی، جناب مولانا حامد الانصاری غازی، جناب مولانا عبداللہ عباس ندوی، جناب مولانا ریاض احمد فیض آبادی، جناب مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، جناب مولانا وحید الدین خاں، حضرت امام عبداللہ بخاری، جناب مولانا احمد علی قاسمی، جناب مفتی فضیل الرحمن عثمانی، جناب پروفیسر سید حامد، جناب پروفیسر شاہ منظور عالم، جناب پروفیسر اطہر دہلوی، جناب پروفیسر وحید الدین ملک، جناب ڈاکٹر ماجد علی خاں، جناب مولانا بدر الحسن قاسمی، جناب سید شہاب الدین، جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جناب مولانا

رابع ندوی، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، جناب جی۔ ایم بنات والا، جناب سید صلاح الدین اویسی، جناب عزیز سیٹھ، جناب ڈاکٹر ممتاز احمد، جناب سید خلیل اللہ حسینی، جناب رحیم قریشی، جناب علی صدیقی، جناب شاہد صدیقی، جناب جاوید حبیب، جناب م۔ افضل، جناب کلیم الدین شمس، جناب مولانا وحید الزمان، جناب مولانا احمد بخاری، جناب ناز انصاری، جناب حکیم عبدالحمید دہلوی، جناب حکیم مصلح الدین مردانی وغیرہ سرفہرست ہیں۔

بیرونی علماء اور دانشوروں میں شیخ عبداللہ ابن السبیل مفتی اعظم سعودیہ عربیہ، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی، جناب سید شریف الدین پیرزادہ سکریٹری جنرل موتمر عالم اسلامی، الشیخ عبداللہ ابن السبیّل امام حرم مکہ مکرمہ، مرحوم علامہ آیت اللہ خمینی، صدر محترم علی الخامنائی، فلسطینی سربراہ، جناب یاسر عرفات، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر محسن التراکی محمد حسین ھیکل، ڈاکٹر ربیع الہادی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

شہید ملت ؒ کے نام ان اکابر علم و دانش کے تاریخی، علمی، فکری اور ادبی مکتوبات خاص اہمیت کے حامل ہیں جنہیں مناسب اور موزوں وقت پر شائع کر کے منظر عام پر لایا جانا چاہیئے۔

پاسپورٹ کی ضبطی

۱۹۸۵ء میں شہید ملت ؒ دورۂ مشرق وسطیٰ اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد جب وطن واپس تشریف لائے تو سرینگر ایئرپورٹ سے میرواعظ منزل تک عوام نے وہ والہانہ پرجوش اور شاندار استقبال کیا کہ کشمیر کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایئرپورٹ سے میرواعظ منزل آنے تک پورا دن لگ گیا۔ بعد میں میرواعظ منزل چوک پر شہید ملت ؒ نے ایک عظیم عوامی اجتماع میں خطاب کرتے ہوئے اپنے

تفصیل دونوں کی دلچسپ اور معلومات افزا داستان ہے' ادھر رابطہ عالم اسلامی نے ریاست کی نمائندگی کے لیے بحیثیت مستقل رکن میر واعظ مرحوم کا نام اپنے ایجنڈے میں شامل کر لیا تھا۔ ادھر مرکزی وزارت داخلہ نے بغیر کسی وجہ بتائے میر واعظ کے پاسپورٹ کو ضبط کرنے کا مقامی اہلکاروں کو حکم دے دیا تھا۔ آمرانہ اور جمہوریت کش اقدام کے خلاف ریاست میں زبردست احتجاج کیا گیا۔ اس سلسلہ میں جامع مسجد سرینگر کے علاوہ وادی کی متعدد مرکزی مساجد اور خانقاہوں میں میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق کا پاسپورٹ ضبط کرنے پر متعلمین اور عوام نے بھی صدائے احتجاج بلند کیا۔ تقریباً ایک لاکھ لوگوں نے جامع مسجد میں بیک زبان اس قرارداد کو متحدہ طور منظور کیا جو اس موقع پر پیش کی گئی۔ اس قرارداد کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

پاسپورٹ کی ضبطی پر جامع مسجد میں قرارداد

"جامع مسجد کا یہ عظیم اجتماع

حکومت ہند کے اس اقدام پر زبردست احتجاج کرتا ہے جس کی رو سے جموں و کشمیر کے میر واعظ مولوی محمد فاروق کا پاسپورٹ بغیر کسی وجہ کے منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ان پر ملک سے باہر جانے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ یہ اجتماع اسے ایک غیر جمہوری' غیر دانشمندانہ اقدام تصور کرتا ہے اور اس اقدام کو بنیادی انسانی حقوق پر کاری ضرب سمجھتا ہے' یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ اس قسم کے غیر آئینی' غیر جمہوری اقدامات سے شکوک و شبہات' بدگمانی اور بداعتمادی کو تقویت ملتی ہے جو کسی بھی صورت میں ملکی مفادات میں نہیں ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ مرکز میں ایک نئی قیادت کا قیام عمل میں آیا ہے اور اس قیادت سے جموں و کشمیر کے عوام میں جو توقعات

وابستہ تھیں وہ کشمیر میں دل بدلو قانون کی سپرٹ کو نہ لانے اور یہاں کی غیر نمائندہ سرکار کی مسلسل حمایت کرنے سے ان توقعات کو بے حد ٹھیس پہنچی ہے جن کے نتائج کسی بھی صورت میں مفید نہیں ہو سکتے۔

یہ اجتماع مطالبہ کرتا ہے کہ میر واعظ کے پاسپورٹ کی منسوخی کے احکامات کو کالعدم کیا جائے اور ان پر بیرونِ ملک جانے کی پابندیاں ختم کی جائیں۔"

ریاست اور ملک کے متعدد قابلِ ذکر اور موقر اخبارات نے میر واعظ کے پاسپورٹ کی منسوخی پر اداریئے لکھے اور تبصرے شائع کیے (جس کی تفصیل ماہنامہ نصرۃ الاسلام بابت ماہ جون ۱۹۸۵ء میں دیکھی جا سکتی ہے) پاسپورٹ کی ضبطی کی وجہ سے میر واعظ جو مزید عالم اسلام سمیت پڑوسی ممالک پاکستان، بنگلہ دیش، اور مغربی ممالک کا تفصیلی دورہ کرنے کے خواہشمند تھے نہیں کر سکے اور بعد میں مقامی مصروفیات اور عوامی ذمہ داریوں نے بھی اس کے لیے مہلت نہیں دی۔

تصنیفی خدمات

یوں تو شہید ملتؒ رات دن، دینی، ملی، مذہبی، رفاہی، اور سیاسی کاموں میں جٹے رہتے، صبح سے شام تک رہائش گاہ، میر واعظ منزل، انجمن نصرۃ الاسلام اور انجمن اوقاف جامع مسجد میں درجنوں افراد اور وفود سے ملاقاتیں فرماتے اس کے باوجود آپ نے اپنی مصروف عوامی زندگی سے وقت نکال کر باقاعدہ ۱۹۸۴ء میں "ادارۂ تصنیف و تالیف" کے نام سے مستقل ایک ذاتی ادارہ اپنی سرپرستی اور نگرانی میں قائم فرمایا جس کے اہتمام سے مختلف کتابچوں، پمفلٹوں، رسائل اور جرائد کے علاوہ اپنے بعض گرانقدر خطبات، مطالبات، اولین مجموعہ "اسلام کا آفاقی پیغام" "اسلام کا سندیش"

"یونیورسل میسیج" (Universal Message) مواعظ و خطبات کا عوامی اور وسیع مجموعہ "اسلام کی بنیادی تعلیمات" شائع کروائیں اور زندگی کے آخری سالوں میں "اسلام کے احسانات" کے نام سے ایک یادگار اور تحقیقی تصنیف چھوڑی جسے ادارہ تصنیف و تالیف بہت جلد شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہے۔

شہید ملتؒ اور انجمن نصرۃ الاسلام

ریاست جموں و کشمیر کے تعلیمی اور ملی اداروں میں انجمن نصرۃ الاسلام سب سے زیادہ قدیم، عظیم اور زندہ ادارہ ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں ریاست سے ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے کے لیے عظیم دینی اور روحانی پیشوا، شہید ملتؒ کے جد امجد حضرت علامہ مولانا رسول شاہؒ نے قائم فرمایا تھا۔ اور تب سے بے پناہ مشکلات، مسائل اور موانع کے باوجود اب تک قوم کی علمی، دینی، دنیوی، تعلیمی، اصلاحی، اور سماجی خدمات انجام دینے میں حتیٰ المقدور مصروف کار ہے۔ اپنی گذشتہ نوّے سالہ دور حیات میں انجمن نصرۃ الاسلام نے اسلامی علوم کے پہلو بہ پہلو جدید اور علوم عصریہ کو پھیلانے میں جو شاندار رول ادا کیا ہے وہ کشمیر کی علمی تاریخ کا روشن ترین اور ناقابل فراموش باب ہے نصرۃ الاسلام کے تحت چلنے والے اداروں میں ایسے لوگوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی جو آگے چل کر کشمیر میں دور حاضر کے مشاہیر ثابت ہوئے۔

انجمن کی تاریخ میں کتنے انقلابات آئے اور انجمن کو کیسے کیسے ہوشربا حالات سے دوچار ہونا پڑا وہ ایک تلخ اور طویل داستان ہے یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور بانیانِ انجمن کے اخلاص کی برکت تھی کہ انجمن

نصرۃ الاسلام زمانہ کی ناموافق ہواؤں اور طوفانی تھپیڑے کھانے کے بعد اور بار بار موت وحیات کی کشمکش کے چکر سے کامیاب ہو کر نکل آنے کے بعد ہمارے سامنے زندہ موجود ہے۔

شہید ملتؒ میرواعظ مولوی محمد فاروقؒ نے انجمن کی ذمہ داریاں اس وقت سنبھالیں جب کہ انجمن کی تعلیمی اور مالی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ گورنمنٹ نے انجمن کش پالیسی اپنا کر "گرانٹ ان ایڈ" (Grant in Aid) بند کر رکھا تھا۔ اور دوسری طرف عوام کے ایک مخصوص طبقہ کا رویہ بھی انجمن نصرۃ الاسلام کے تئیں نہ صرف یہ کہ منفی اور مایوس کن تھا بلکہ معاندانہ اور مخالفانہ بھی تھا۔ ان عناصر کی ہر ممکن یہی کوشش رہتی کہ انجمن کی شاندار تاریخ اور اس کی وسیع خدمات کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈہ کیا جائے۔ اس کے باوجود میرواعظ مرحوم نے ہمت نہیں ہاری۔ اور پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ انجمن کی تعلیمی، اصلاحی اور تعمیری کاموں کو بڑھاوا دینے کے لئے خصوصی توجہ دیتے رہے۔ تنظیمی اور دیگر متعلقہ امورات میں بہتری لانے کی کوشش کی، موقع بموقع انجمن کے ملازمین اور اساتذہ کو ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلاتے، ان کے جائز مطالبات اور حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات اٹھائے۔ یہ صرف صدر انجمن شہید ملتؒ کی بے لوث خدمات اور مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ گذشتہ کئی سال سے "گرانٹ ان ایڈ" کی بندش کے باوجود انجمن اپنے تعلیمی مشن کی آبیاری میں مصروف کار ہے۔ میرواعظ مولوی محمد فاروقؒ نے اپنے دورِ صدارت میں انجمن کے تحت چلنے والے اداروں کے جملہ مصارف اور اخراجات بخوبی پورے کرنے کے علاوہ جو ٹھوس اور تعمیری کارنامے انجام دیے ان کا سرسری جائزہ پیشِ خدمت

ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج ہر محلہ اور گلی کوچہ میں تعلیمی، تجارتی اداروں کی کثرت کے باوجود انجمن کے ماتحت ادارے کس طرح اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور داخلی و خارجی محاذوں پر انجمن کو کتنی مشکلات کا سامنا ہے۔

اسلامیہ مڈل سکول امیرا کدل، اور صفا کدل کے لیے خطیر رقم کے عوض مکانات خریدے گئے۔ سینٹرل ہائی سکول راجوری کدل، اسلامیہ ماڈل سکول اور اورینٹل کالج کے مکانات کی تجدید و تعمیر پر بھی بڑی رقمیں خرچ کیں۔ اور اس کے علاوہ اسلامیہ ہائی سکول بوٹہ کدل کے لیے جدید عمارت کی تعمیر میں تقریباً آٹھ لاکھ روپے صرف کر کے ایک شاندار سہ منزلہ بلڈنگ کھڑی کر دی جس کے سبب اس پورے علاقہ کے بچّے اور بچّیاں علم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ ان جملہ خرید شدہ اور تعمیر شدہ عمارتوں کے لیے ریاستی حکومت اور گورنمنٹ سے اب تک انجمن کو ایک پائی کی امداد بھی نہیں ملی ہے، بلکہ گورنمنٹ انجمن کے تحت چلنے والے اداروں کے سالانہ واجبی گرانٹ ادا کرنے سے بھی لیت و لعل اور ٹال مٹول کرتی آرہی ہے۔ چنانچہ تازہ اطلاعات اور رپورٹ کے مطابق مندرجہ ذیل مدارس کے سالانہ گرانٹ بھی کئی سالوں سے وصول طلب ہیں۔

۱۔ اسلامیہ ہائی سکول، راجوری کدل جو صدر مرحوم کی ذاتی توجہ اور دلچسپی کے باعث اب ایک بار پھر مثالی ادارہ بن رہا ہے اور آج نونہالان قوم کی اچھی خاصی تعداد اپنی علمی پیاس بجھانے میں مصروف ہے۔ سکول کا نظم و ضبط، تعلیمی معیار، ڈسپلن اور امتحانی نتائج بڑی حد تک اطمینان بخش ہیں۔ اس مرکزی ادارہ کا سابقہ منظور شدہ (grant inaid) ابھی تک

وصول طلب ہے۔

۲۔ اسلامیہ ہائی سکول درگجن، یہ سکول ایک کرایہ کے مکان پر تا ہنوز عمل رہا ہے۔ اس سلسلہ میں انجمن اور اہالیان علاقہ زمین کے حصول اور تعمیر مکان کے لیے کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں مگر گورنمنٹ کی بے اعتنائی سے اب تک اس میں کامیابی نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ اس سکول کے طلبہ (Students .) میں نمایاں اور قابل ذکر حصہ لیتے آئے ہیں۔

۳۔ اسلامیہ مڈل سکول امیر اکدل، انجمن نے فراہمی چندہ اور قرضہ حاصل کرنے کے بعد اس سکول کی عمارت ایک موٹی رقم میں خریدی جس کے لیے اب تک grant . حاصل نہیں ہو سکی۔

۴۔ اسلامیہ مڈل سکول صفاکدل، انجمن نے ایک بڑی رقم کے عوض اس سکول کا مکان بھی خریدا ہے جس کی بلڈنگ گرانٹ وصول طلب ہے اور سالانہ گرانٹ ابتدائی بھی ۷۹-۱۹۸۰ء وصول طلب ہے۔

۵۔ اسلامیہ مڈل سکول، فتح کدل اس اسکول کی سالانہ گرانٹ بھی گورنمنٹ کے ذمہ باقی ہے۔

۶۔ اسلامیہ سکول رعناوادی اس کی ابتدائی سالانہ گرانٹ ۷۷-۱۹۷۸ء وصول طلب ہے۔

۷۔ اسلامیہ مڈل سکول بلبل لنگر (شیو پورہ) اس کی سالانہ گرانٹ ابتدائی بھی ۷۸-۱۹۷۹ء وصول طلب ہے۔ یہ سکول بلبل لنگر سے شیو پورہ منتقل کیا گیا تھا مگر گورنمنٹ نے اس اسکول کے متوازی اور ہمسائیگی میں اپنا سکول کھولا۔ چنانچہ مجبوراً انجمن کو سکول ہذا بو شکیل منتقل کرنا پڑا۔

۸۔ اسی طرح اسلامیہ اور نمبل کالج کی لائبریری گرانٹ بھی کئی سالوں سے

مسلسل وصول طلب ہے۔

انجمن کے اغراض ومقاصد

انجمن نصرۃ الاسلام کے مخلص بانی سر سید میر واعظ مولانا رسول شاہ مرحوم نے جن اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے اس علمی اور تہذیبی دانشگاہ کی بنیاد رکھی تھی، یعنی :۔

— کتاب وسنت کی ترویج واشاعت۔
— اسلامی تعلیمات کے علاوہ عصری علوم سے نئی نسل کو آراستہ کرنا۔
— مسلمانوں کے کردار کو اسلامی اقدار کا آئینہ دار بنانا۔
— مذہبی، اخلاقی، اقتصادی، تہذیبی اور سماجی امور میں عوام کی مثبت اور صحیح رہنمائی کرنا۔
— جدید تعلیم اور مذہب میں توازن پیدا کرنا۔
— مسلمانوں میں "امت وسط" کے تصور کو جاگزیں کر کے ان میں اتحاد پیدا کرنا۔
— روحانی (Moral.) اور اخلاقی (Spiritual.) جذبے کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ عالمی اخوت (Brother Human HooD Kind.) کے کاز کو تقویت پہونچانا۔ وغیرہ۔

مذکورہ بالا اغراض ومقاصد کی آبیاری کے لیے انجمن نے اپنے تقریباً سو سالہ دور حیات میں اگرچہ گرانقدر کام کیا ہے اس کے باوجود شہید ملتؒ صدر محترم میر واعظ مرحوم نے بارہا اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ابھی ان مقاصد اور پالیسیوں کی تکمیل کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس ادارہ کو مزید فعال اور متحرک بنانے اور موجودہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اس کی اہمیت اور افادیت کو بڑھانے کے لیے مسلسل، انتھک، پرخلوص اور اجتماعی

کو شنشیں بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے۔

میرو اعظم مرحوم نے گذشتہ پانچ سال کے دوران مشکلات کے باوجود خاص طور پر انجمن کے تئیں جو متعدد انقلابی اور تعمیری نوعیت کے اقدامات اٹھائے ان کے مفید نتائج بتدریج سامنے آرہے ہیں اور ان کی بدولت نہ صرف تعداد طلبہ کی کمی دور ہوئی ہے بلکہ اس میں خاصا اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ بعض سکولوں میں جگہ کی کمی کی وجہ سے نئے داخلے بند کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی معیار بھی بڑی حد تک بلند ہوا ہے جس کا ہر بہی خواہ انجمن کو بخوبی علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کے ساتھ عوام کے دست تعاون واشتراک میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں تک معلمین انجمن کا سوال ہے تو انجمن کی نئی پالیسی کے تحت صدر محترم کی خصوصی ہدایت کے مطابق نوجوان اور سند یافتہ اساتذہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اس وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ محنتی اور ٹرینڈ اساتذہ (جن میں استانیاں بھی شامل ہیں) کی جتنی تعداد انجمن کے ماتحت اداروں میں کام کرتی ہے ماضی قریب اور بعید میں اتنی کبھی نہیں تھی، اور ان میں اکثر فرض شناس، محنتی اور تعمیری صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ غرض انجمن کی موجودہ حالت کسی بھی صورت میں کمزور نہیں بلکہ رُو بہ ترقی ہے۔ البتہ اس وقت بھی ریاستی حکومت کے پاس تقریباً سولہ لاکھ روپے کی خطیر رقم بطور "گرانٹ اِن ایڈ" واجب الادا ہے اور اگر انجمن کا کوئی مسئلہ ہے تو بس یہی ہے کہ ریاستی حکومت اور محکمۂ تعلیم اس کے ساتھ ہمیشہ امتیاز اور جانب داری کا رویہ اپنائے ہوئے ہے۔

(Grant in Aid) جو انجمن کے سکولوں کا قانونی اور آئینی حق ہے ایک طرف وہ انتہائی ناکافی ہے دوسری طرف ایک دوسرا بہانہ کر

اسکولوں کے کیسس (Cases.) کارروائی نہ ہونے کی وجہ سے دفتروں میں پڑے ہیں جس کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج بھی اگر اس خالص تعلیمی ادارہ کو سیاسی انتقام گیری کا نشانہ نہ بنایا جائے اور اس کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک نہ کیا جائے تو اس انجمن کے عظیم مقاصد کی تکمیل کی راہیں ہموار ہونے میں بڑی مدد ملے گی۔

مرحوم صدر انجمن نے انجمن کی آمدنی کے مستقل ذرائع قائم نہ ہونے انجمن کے پاس اب تک کوئی جائیداد منقولہ نہ ہونے کے باوجود انجمن کے املاک میں اضافہ کروانے میں قابلِ قدر رول انجام دیا جس سے انجمن کی پروپارٹی (Property) میں اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک انجمن کے حسابات کا تعلق ہے وہ ایک کھلی کتاب ہے۔ جسے کوئی بھی شخص انجمن کے دفتر میں آکر موقع پر مشاہدہ کر سکتا ہے۔ روزِ اول سے انجمن ہمیشہ اپنی رقومات بینکوں میں رکھتی آئی ہے اور جو بھی رقم برآمد کی جاتی ہے بذریعہ چیک کی جاتی ہے۔ محکمۂ تعلیم کو گرانٹ ان ایڈ کے سلسلہ میں ہمیشہ جملہ حسابات ایک چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ کے ذریعہ چیک و پڑتال کروا کے ارسال کیے جاتے ہیں۔ سال میں محکمۂ تعلیم کی طرف سے ہر سکول کا دو دفعہ معائنہ کیا جاتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بھی کسی بھی بے ضابطگی کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔

انجمن کی اشاعتی خدمات

صدر انجمن میرواعظ مرحوم نے اپنے دورِ صدارت میں تعلیمی فروغ کے علاوہ جو اہم دینی اور اشاعتی کام کیا ہے ان میں نمایاں ترین مہاجر ملت میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ مرحوم کے قرآن مجید کا کشمیری زبان میں ترجمہ و تفسیر کی اشاعت و طباعت کے بعد بڑے پیمانے پر اس کو پھیلانا ہے آج

اس علمی تحفہ اصبتانی ہدیہ سے کشمیر کا بچہ بچہ مستفید ہو رہا ہے۔ گذشتہ سالے دوبارہ ایک بھاری رقم سے کتابتی غلطیوں اور دیگر خامیوں کی اصلاح کے بعد نئے اہتمام سے صرف دو ضخیم جلدوں میں مذکورہ تفسیر کو شائع کروا کے انجمن نصرۃ الاسلام کے شعبۂ نشر واشاعت کی طرف سے ریاست کے مدارسِ اسلامیہ، مکاتبِ دینیہ، اسلامی و دینی لائبریریوں، ائمہ اور خطیب حضرات کو ہدیتاً پیش کیا گیا ہے۔ بلاشبہ اس طرح تعلیمات قرآنی کو عام کرنا مرحوم میرواعظ کے حسنِ کوشش ہی کا فیض ہے۔

صدر مرحوم نے اپنی نگرانی اور سرپرستی میں انجمن کی طرف سے ایک علمی ماہوار جریدہ "نصرۃ الاسلام" بھی اجراء کروایا جو اسلامی، تاریخی، اخلاقی اور ادبی قدروں کا آئینہ دار ہے۔ اور خاموشی و یکسوئی کے ساتھ ملت کی مبثت خدمات انجام دیتا آرہا ہے۔ خطۂ کشمیر سے شائع ہونے والا یہ منفرد دینی رسالہ ہے جو برصغیر کے علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

انجمن کی شاندار لائبریری جس میں بیش بہا کتب اسلامیہ کا ذخیرہ موجود ہے یقیناً صدر مرحوم کے علمی ذوق کی مظہر ہے۔ صرف چند سال بیشتر شہیدِ ملت نے اسے قائم فرمایا تھا۔ لائبریری کو مزید وسعت دینے اور اس کے علمی فیض کو عام کرنے کا ایک جامع منصوبہ صدر انجمن کے ارتقائی منصوبوں میں شامل تھا۔

میرواعظ مرحوم کی نظر میں انجمن نصرۃ الاسلام صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں تھا جس کا مقصد سنگ و خشت کی بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی کر دینا اور ظاہری آرائش و زیبائش کی نمائش و نمود کر کے لوگوں کا استحصال کرنا ہو۔ نہ ہی اس کا

مقصد چند بچوں کو کتابی تعلیم یا کچھ اساتذہ کے لیے روزی روٹی کا حصول کرنا بلکہ یہ قوم کے حق میں ایک ہمہ گیر اسلامی اصلاحی اور جامع تحریک ہے اور اس کے اغراض و مقاصد اور دائرۂ کار بے حد وسیع اور متنوع ہیں۔ اس لیے انجمن کے اراکین، بہی خواہان، مدرسین و متعلقین کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انجمن نصرۃ الاسلام موجودہ دور میں تب ہی اپنا وجود منوا سکتی ہے جب وہ نئی نسل کو عصری تعلیم امتیازی شان کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم سے آراستہ کرنے کا فریضہ انجام دے اور تمام مسلمانوں کے کردار کو اسلامی تعلیمات کے قریب تر لانے، ان میں روحانی، اخلاقی اور اعلیٰ انسانی اقدار کو اجاگر کرنے کے عظیم فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دے۔

شہید ملتؒ کی ایک اہم خواہش شہید ملتؒ میر واعظ مرحوم کی یہی دلی خواہش اور زبردست آرزو تھی کہ انجمن نصرۃ الاسلام عصر حاضر کے چیلنج کا موثر جواب دینے کے لیے سرگرم عمل ہو، اور ملت کے موجودہ امراض کا علاج کرنے میں یہ ادارہ مفید رول ادا کرے اور قوم کی جو نئی پود پروان چڑھے ان کے دائیں ہاتھ میں قرآن پاک اور بائیں ہاتھ میں سائنس کی جدید کتاب ہو۔

مستقبل کے خاکے اور عزائم شہید ملتؒ نے انجمن نصرۃ الاسلام کے دائرۂ کار کو مزید وسعت دینے کے لیے جو اہم خاکے اور پروگرام مرتب کیے تھے ان میں سرفہرست مرکزی اسلامیہ ہائی سکول میں فوری طور .B.Sc اور .B.Com کے کلاسیں کھولنے، اسلامیہ اورینٹل کالج کی تجدید و اصلاح، مقامی اور بیرونی طلبہ کے قیام و طعام کے لیے بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر، انجمن کے تحت "یتیم خانہ" کا قیام

لڑکیوں کے لیے ایک الگ تعلیمی اور تربیتی ادارہ "مدرستہ البنات" کا خاکہ "ملیہ کالج" کا قیام اور علوم مروجہ کے ساتھ ساتھ "صنعت و حرفت" کی تعلیم کا انتظام وغیرہ پروگرام شامل ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ انجمن کے موجودہ صدر محترم میرواعظ مولوی محمد عمر فاروق کو اللہ تعالیٰ توفیق ہمت اور حوصلہ عطا فرمائیں تاکہ وہ شہید ملت صدر مرحوم نے انجمن کے ارتقائی، تعلیمی اور تعمیری منصوبوں کا جو جامع پروگرام اور خاکہ مرتب کیا تھا ان میں مناسب اور موزوں رنگ بھر سکیں اور اس عظیم تاریخی، ملی اور دینی ادارہ کو مزید فعال، متحرک اور فیض بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر سکیں۔

شہید ملت اور انجمن اوقاف جامع مسجد | تاریخی جامع مسجد سرینگر مسلمانان کشمیر کے دینی اور اسلامی عقیدت کا مرکز اور عظیم عبادت گاہ ہے، تعمیر کے بعد سے مختلف دور شاہان وسلاطین میں اس کا انتظام و انصرام سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطح پر جاری ہے۔ (جامع مسجد کی جامع اور مکمل تاریخ اور دیگر تفصیلات "تاریخ جامع مسجد" مرتبہ شہید ملت میرواعظ مرحوم میں دیکھی جا سکتی ہے یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔)

تاہم ۱۹۴۷ء میں جب مرحوم شیخ عبداللہ ریاست کے وزیر اعظم بنے تو انہوں نے انتظامیہ کمیٹی کو از سر نو تشکیل دیا ۱۹۵۲ء میں خزانہ میں کوئی ۳۰ ہزار روپے کی رقم موجود تھی۔ ۱۹۵۳ء میں جب مرحوم بخشی غلام محمد وزیر اعظم بنے تو انھوں نے ایک کشمیری مہاجر کی وقف کردہ جائداد کی آمدنی سے چھت کی ٹین پوشی کرائی۔ اس پر اکیاسی ہزار روپے صرف ہوئے۔ ادارۂ اوقاف اسلامیہ جموں وکشمیر نے ۱۹۷۰ء تک جامع مسجد کا انتظام چلاتا رہا۔

بالآخر یکم جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کو جامع مسجد کی اندرونی وبیرونی خستہ حالت میں بہتری لانے کی غرض سے ایک علیحدہ تنظیم "انجمن اوقاف جامع مسجد" کے نام سے شہید ملت میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق کی سربراہی میں عمل میں لائی گئی۔ سنہ ۱۹۵۳ء سے لے کر سنہ ۱۹۷۰ء تک یعنی سترہ سال کے عرصے میں کل آمدنی ایک لاکھ بیس ہزار روپے اور کل اخراجات ایک لاکھ نوّے ہزار روپے کیے گئے۔ عہد ڈوگرہ عہد کے خاتمے پر جو روپیہ موجود تھا خرچ کیا۔ "مسلم اوقاف ٹرسٹ" نے مسجد شریف کے نام کوئی سرسٹھ ہزار روپے قرض واجب الادا دکھایا جس کی ادائیگی کے لئے وزیر باغ کا مکان اوقاف ٹرسٹ نے وقتی طور پر اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال اس لیے بھی پیدا ہوئی تھی کہ آمدنی کے ذرائع تلاش کرنے کی طرف مؤثر توجہ نہیں دی گئی تھی۔ مسجد شریف کی دیکھ بھال، پرداخت اور ضروریات کے لیے محدود وسائل اور وہ بھی غیر مستقل انتہائی ناکافی تھے اس لیے مسجد شریف کی مجموعی حالت میں جو ابتری پیدا ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔

صدرِ انجمن اوقاف شہید ملت رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی میں اراکین اور کارکنانِ انجمن نے اس عظیم اور تاریخی عبادت گاہ کی ظاہری اور باطنی حالت بہتر بنانے، خاص طور پر اس کی عظمتِ رفتہ بحال کرنے اور مستقل ذرائع آمدنی قائم کرنے کا جو کام ہاتھ میں لیا اس میں تائیدِ الٰہی اور عام لوگوں کے اشتراک و تعاون سے انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

اصلاحی و تعمیری کام جامع مسجد کی حفاظت، صیانت اور ترقی کے لیے مستقل انتظام کرنے، مسجد شریف

کو ازسر نو دین اسلام کی تعلیم و اشاعت، دعوت و تبلیغ اور قومی اصلاح و بہبود کا مرکز بنانے کے لیے شہید ملت میرواعظ کشمیر رح نے جو تعمیری، فکری اور ارتقائی منصوبہ بند پروگرام مرتب کیا تھا اس پر رفتہ رفتہ عمل ہوتا رہا اور آج کاموں کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس سمت میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ انجمن اوقاف کے اہتمام سے لاکھوں روپے خرچ کر کے مسجد شریف کے باہر چاروں طرف پارکیں بنوائی گئیں، متعدد تعمیرات اور دکانات تعمیر کر دی گئیں۔ باہر کی سڑکوں کو پختہ بنوایا گیا اور مسجد شریف کے اندر و باہر صفائی، روشنی، لاؤڈ سپیکر اور بجلی کا جدید و معقول انتظام کروایا گیا اور مسجد شریف کے اندر صحن کی چمن بندی کرائی گئی۔ پوری مسجد کو مناسب فرش سے آراستہ کرنے پر زر کثیر صرف کیا گیا اور اس کے علاوہ "تعلیم القرآن" کے نام سے ایک مدرسہ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ شہید ملت رح کی نظر میں ابھی یہ کام کی ابتداء تھی انجمن اوقاف کی اسلامی، تعمیری اور ارتقائی سکیم جب پوری طرح عمل میں لائی جائے گی تو "مسجد جامع" تبلیغ و ارشاد اور علم و عرفان کا مرکز ہونے کے لحاظ سے ایک بار پھر اس رتبہ پر فائز ہوگی جو اس کی تعمیر کے وقت حضرت میر محمد علی الہمدانی رح کے پیش نظر اور شہید ملت رح میرواعظ کشمیر رح کے دل و دماغ میں تھی۔

مرکز اسلام میرواعظین کشمیر (رحمہم اللہ اجمعین) نے جامع مسجد کو شروع سے دعوت اسلام، اشاعت اسلام اور حفاظت اسلام کے لیے مرکزی حیثیت دی اور مشکلات اور ناموافق حالات کی پرواہ کیے بغیر یہاں کے مقدس منبر و محراب سے وعظ و تبلیغ اور

دعوت وارشادات جاری رکھ کر مسلمانوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام کی عظیم اور آفاقی تعلیمات اور دینی مسائل و احکام سے روشناس کرتے رہے اور یہ سلسلہ الحمدللہ آج بھی جاری ہے۔ سرینگر کی جامع مسجد ایک تاریخی اور عظیم عبادت گاہ ہونے کے علاوہ سیاحتی اہمیت کی بھی حامل ہے یہی وجہ ہے کہ ملکی، خاص طور پر غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں اور اس نادر فنِ تعمیر سے انتہائی متاثر ہو کر اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔

جامع مسجد کی تاریخی اور سیاسی اہمیت

جامع مسجد سرینگر کو زبردست تاریخی اور سیاسی اہمیت بھی حاصل ہے۔ گذشتہ چھ سو سال سے اس کے ساتھ ریاستی مسلمانوں کی تاریخ وابستہ چلی آرہی ہے۔ اسلامی اور دینی تحریک کے علاوہ یہ تاریخی مرکز لوگوں میں علمی، سیاسی، سماجی، اصلاحی، اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی، بیداری پیدا کرنے میں بھی مرکزی اور نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ جامع مسجد کشمیر جہاں مسلمانانِ ریاست کا حصار اور مضبوط قلعہ ہے وہاں یہ کشمیر کی ملّی اور قومی تحریک کا مرکز بھی چلی آرہی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب "تحریک حریت کشمیر" کا آغاز ہوا تو جامع مسجد نے رائے عامہ کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا اور کشمیر میں قیادت کے بلند اور مستحکم مینار استوار کیے۔ جامع مسجد کے باہر شمال و مشرق کے کونے میں تحریک بیداریٔ کشمیر کے بعض شہیدوں کا مدفن ہے۔ اسی طرح درگاہ حضرت بل سے ۱۹۶۳ء میں موئے مقدس اٹھائے جانے کے سلسلہ میں جو عوامی تحریک شروع ہوئی وہ بھی جامع مسجد کے منبر و محراب سے پروان چڑھی اور ریاست میں تاریخ ساز ملّی اتحاد، وحدتِ اسلامی اور قومی یکجہتی کا باعث بنی۔ غرض جامع مسجد

ایک ایسی فصیل ہے جو نہ صرف ہمارے عظیم مقاصد کی ترجمان بلکہ اتحاد کی پاسبان ہے اور اس کے ہمہ گیر اور جامع کردار کا احیاء شہید ملتؒ کی زندگی کا ایک بنیادی مشن تھا۔

مالی امداد و تعاون

انجمن اوقاف کے باقاعدہ قیام اور مستقل محدود آمدنی کے ذرائع مستحکم ہونے کے بعد مسجد شریف کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ صدر انجمن شہید ملت میرواعظ کشمیرؒ ہر سال بلا ناغہ ریاست اور ملک کے مدارس اسلامیہ، مکاتیب قرآنی، اسلامی درس گاہوں، لائبریریوں اور مساجد کی تعمیر و تجدید کی غرض سے ہزاروں روپے کی مالی معاونت بہم پہونچاتے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشاعت دین کے بنیادی مقصد کو تقویت پہونچانے کے لیے "انجمن اوقاف جامع مسجد" کا رول کسی بھی اہم اوقافی ادارے سے پیچھے یا کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ غریبوں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور حاجت مندوں کی حسب ضرورت و گنجائش ہمیشہ مالی مدد کرتے رہتے۔ کئی ایک کو قرض حسنہ دیا گیا۔ جس کی تمام تر تفصیلات اور ریکارڈ "انجمن اوقاف جامع مسجد" کے دفتر میں کسی بھی وقت کوئی بھی آدمی آکر ملاحظہ کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ تحریک حریت کشمیر کے دوران گذشتہ دو سال میں شہید ہونے والوں کے مستحق لواحقین کی "انجمن اوقاف" سے شہید ملتؒ نے ایک بھاری رقم سے خفیہ طور پر خدمت کی جس کے اظہار کی نہ میرواعظ مرحوم نے کبھی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی اس کو پبلسٹی دی گئی۔ لیکن اب جب کہ حضرت شہید ملتؒ ہمارے درمیان نہیں رہے تو اس کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہید ملت میرواعظ مرحوم نے تاریخی جامع مسجد کے انتظام و انصرام کو اپنی تنظیمی صلاحیت، لیاقت اور خصوصی دلچسپی سے اس مقام تک پہونچا دیا ہے کہ اب مسجد شریف کے ضروری اور بنیادی مصارف، اوقاف کے ملازمین اور ماتحت عملہ کے واجبی اخراجات اور دوسری اہم ضروریات کی انجمن خود متکفل ہے۔

مسجد شریف کی مزید بہتری، گرد و پیش کے ماحول کو خوبصورت اور پرکشش بنانے، ایک معیاری "مسافر خانہ" اور اعلیٰ سطح کا ایک تحقیقی "کتب خانہ" قائم کرنے اور ایک مستقل "دار المبلغین" کے قیام کا شہید ملت حضرت میرواعظ کشمیر کے ذہن میں جو نقشہ تھا انشاء اللہ العزیز اوقاف کی موجودہ انتظامیہ رفتہ رفتہ صدر انجمن میرواعظ کشمیر مولوی محمد فاروق کی سربراہی میں ان خاکوں میں رنگ بھرنے کی کوشش کرے گی۔

ناقابل تلافی نقصان

ریاستی عوام کے علاوہ علماء، ائمہ، دانشور، مفکرین، اہلِ علم، اہل قلم، سیاست داں، سماجی کارکن، قائدین اور زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد شہید ملت میرواعظ کشمیر مولوی محمد فاروق رح کی جدائی میں خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ ہر ایک کو بے بسی، بے کسی اور یتیمی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ قوم و ملت کے ممتاز رہنما، تحریک حریت کے روحِ رواں، علم و فضل کے شہسوار، فکر و فلسفہ کے امام، بزم ادب و دانش کے صدر نشین، دانائے زمان، فخرِ روزگار، آتش بیان خطیب، شعلہ بار مقرر، داعیِ اسلام، مبلغ اعظم، مخزنِ رشد و ہدایت، امیر شریعت، شہید ملت میرواعظ کشمیر مولوی محمد فاروق رح ہمارے درمیان نہیں رہے۔ شہید ملت میرواعظ کشمیر کا موجودہ

تاریک سنگین اور بحرانی حالات میں منزل ناآشنا کارواں کی قیادت سے منہ موڑ لیا، ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو بیچ سمندر میں چھوڑ دیا" ایک ایسی آزمائش، امتحان اور ابتلاء ہے جس میں کامیابی اور ساحلِ مراد تک پہنچنے کے امکانات بے حد تاریک نظر آرہے ہیں۔

معلم شیراز شیخ سعدیؒ نے بجا کہا ہے کہ ؎

سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیقے در یمن

دانائے راز ہونے کے لیے انسان کو ایک عمر چاہیے، زندگی کے نشیب و فراز، زمانہ کے سرد و گرم اور انقلابات کے اُتار چڑھاؤ ایک نہیں کئی بیت جاتے ہیں۔ مختلف بھٹیوں میں زندگی تپتی ہے۔ متعدد طوفان اور حادثوں کے تھپیڑے کھانے پڑتے ہیں پھر کہیں انسان اس قابل ہوتا ہے کہ بصیرت، فکر اور شعور و آگہی سے نوازا جائے۔ اس کے نظریات میں ٹھہراؤ اور اس کے مشاہدات میں جماؤ پیدا ہو۔ تجربات پھر اسے وہ پختگی اور مشاقی عطا کرتے ہیں کہ حالات و حادثات کے اسباب و نتائج تک اس کی نظر عام لوگوں کی نظروں سے بہت پہلے پہنچ جاتی ہے، ایسی ہستیاں قابلِ قدر ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیتوں کی عظمت کے لیے دل خواہ مخواہ جھکا پڑتا ہے وہ نئے راہ چلنے والوں کے لیے رہبرِ منزل ہوتے ہیں اور نوآموزوں کے لیے استاذ کامل، اس پس منظر میں بھی شہید ملتؒ کا ہم سے یک بیک جدا ہونا صرف ایک فرد یا ذات کا جدا ہونا نہیں ہے وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ایک مکتب فکر تھے۔ ایک ادارہ (Institution.) تھے۔ قدیم و جدید کے حسین سنگم تھے، ہماری علمی دینی، ملی، دعوتی، اصلاحی اور سیاسی تاریخ

شہید ملت" کی جہت، متنوع ، شاندار اور گرانقدر خدمات اور سنہرے کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔

بلاشبہ قوم و ملت اپنے ایک مخلص اور بے باک ترجمان، وسیع النظر عالم دین، اسلامی اسکالر بلند قامت سیاسی رہنما اور عظیم مرد مجاہد سے محروم ہو گئی ہے جس کے تدارک اور تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ؎

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ تجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

(جاری)

اعلان

صحت برائے مولانا علی محمد شیر میواتی ناظم جامعہ رحیمیہ مہندیان دہلی

ان دنوں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کے بہت قریبی رفیق، دل کے دورے کی وجہ سے بیماری میں سخت مبتلا ہیں۔ آجکل وہ پنت اسپتال میں اسپیشل وارڈ میں تقریباً دو ماہ سے داخل ہیں۔ میں ان کے لیے خاص اوقات میں دعائے صحت کی درخواست کرتا ہوں ——— (عمید الرحمٰن عثمانی)

دعائے مغفرت

مولانا حامد حسن صاحب عثمانی مرحوم ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بہت پرانے کارکن جو کافی طویل علالت کے بعد اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ موصوف انتقال سے قبل اس ادارے کے کاموں سے کافی عرصہ سے مستثنیٰ ہو چکے تھے۔

برہان

شمارہ ۳ | مارچ ۱۹۹۱ء مطابق شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ | جلد ۱۰۷

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

خلیجی جنگ کا آغاز جن افسوسناک حالات میں ہوا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ عبرت ناک طور پر اس کا انجام بھی ہوا۔ اور یہ انجام تمام دنیا کے انصاف پسندوں کے لیے ایک پیغام چھوڑ گیا اور ملت اسلامیہ کے لیے ایک سبق بھی دے گیا ہے۔

آج سچائی اور ایمانداری کی جو دہائی دی جاتی ہے دنیا نے دیکھ لیا کہ اس دور میں اس کا جتنا شور مچایا جاتا ہے یہ سب فضول سی بات ہے۔ آج جس کی لاٹھی ہے اسی کی بھینس ہے۔

سب کچھ اپنا مفاد ہی اولین شئے کا درجہ رکھتی ہے۔ اور انصاف، سچائی، ایمانداری یہ سب خوب صورت الفاظ اپنے اپنے مفاد کے تحت ہی کاسب کو بھاتے ہیں۔ اپنے مفاد سے اگر ان لفظوں کے مفہوم ٹکراتے ہیں تو پھر ان کی کوئی وقعت ہی کسی کے نزدیک بے معنی بات ہے۔

عراقی صدر صدام حسین نے جب کویت پر قبضہ کیا تو انہوں نے اسے اپنے مفاد ہی کے تحت خوشنما لفظوں کے گورکھ دھندوں میں گھما پھرا کر جائز و صحیح ٹھہرایا۔ اور جب اتحادی فوجوں نے کویت کو آزاد کرانے کے

عراق کے شہر بغداد، بصرہ، کربلا و نجف وغیرہ پر زبردست ہوائی بمباری کی جس سے بھیانک تباہی و بربادی اور لاکھوں بے قصور شہری انسانوں کی موت واقع ہوئی تو اسے بھی اپنی لغت کے ذریعہ صحیح اور بالکل ٹھیک گردانے کی صدا بلند کی گئی۔

آج کی دنیا جس تیزی سے ترقی کرتے کرتے چاند و سورج پر پرواز کرنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہے اسی تیزی کے ساتھ دنیا والے جھوٹ کو سچائی، بے ایمانی کو ایمانداری، بے انصافی کو انصاف میں بدلنے کے لئے بلا شرم و جھجک آمادہ و کمربستہ ہیں۔

صدام حسین نے کویت پر قبضہ کرنے کے جواز میں فلسطین کا راگ الاپا اور اتحادی فوجوں نے عراق کے شہروں بصرہ، بغداد وغیرہ پر بے پناہ بمباری کے ذریعہ تباہی و بربادی اور انسانوں کی ہلاکت کے لیے عراق کو سبق سکھانے اور کوئی ملک آئندہ ایسی غلطی کرنے کی جرأت نہ کرے کا ڈھونگ رچا۔

بے ایمانی دونوں ہی کر رہے ہیں، مگر ایمان داری کی آڑ لے کر، یہ ہے بیسویں صدی میں سائنسی ترقی کا کمال۔!

کویت پر زبردستی قبضہ کرنے سے پہلے صدام حسین کو فلسطین کبھی کیوں یاد نہیں آیا۔ وہ بتائیں کہ اس سے پہلے ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۲ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران میں انہوں نے فلسطین کے کاز کے لیے قربانی دینے کے موقع کو کیوں گنوایا۔؟

کویت پر قبضہ کے بعد تمام دنیا کی طرف سے عراق کی مذمت کو دیکھ کر عراق کی طرف سے فلسطین کا نام لیتا دیکھ کر ہمیں یہ واقعہ یاد آگیا:

"ایک مسجد میں کوئی چور گھس آیا اور اس نے موقع دیکھ کر نمازیوں کے جوتے اکٹھے کر کے باندھنے شروع کر دیئے کہ اسی اثناء میں کسی دیگر شخص نے اسے دیکھ لیا اس نے فوراً شور مچا دیا۔ چور چور، وہ گھبرا گیا اس نے پکڑے جانے کے ڈر سے مسجد کے کونے میں رکھی جھاڑو کو جھٹ سے اٹھا لیا اور لگا صفائی کرنے، اتنے میں چور، چور کی آواز سن کر تمام نمازی آ گئے۔ پوچھا کہ چور کہاں ہے۔؟ تو شور مچانے والے نے کہا کہ یہ ہے جو جھاڑو دے رہا ہے۔ چور نے جواب دیا کہ بھائی میں تو مسجد میں ادھر ادھر پھیلے تمام جوتوں کو ایک جگہ رکھ کر مسجد کی صفائی کر کے ثواب کما رہا ہوں اور یہ مجھے چور کہہ کر صفائی کرنے کی سعادت و ثواب سے محروم کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔ نمازی شور مچانے والے ہی کو ڈانٹنے لگے کہ ایسے نیک آدمی کو چور کہتا ہے۔

صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر کے اسی واقعہ کی یاد تازہ کر دی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ عراق کا کویت پر قبضہ کرنے کو کوئی جائز نہیں مان رہا ہے تو انہوں نے اس کے ساتھ فلسطین کا نام جوڑ دیا کہ اسرائیل فلسطین خالی کر دے گا تو میں بھی کویت سے ہٹ جاؤں گا۔ ان کے اس اعلان پر ملت اسلامیہ جذباتی طور پر ان کی دیوانی ہی ہو گئی۔

ملت اسلامیہ کو صدام حسین میں سلطان صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم بلکہ بعض رہنماؤں کو خلفاء راشدین کی جھلک نظر آنے لگی۔ یہ ملت اسلامیہ کی اس سائنسی دور میں دورگت۔ یعنی جذبات اور صرف جذبات۔!

جس طرح کویت کو خالی کرانے کے لیے امریکہ، فرانس، برطانیہ، مصر

دلچسپی دکھائی اور انسانی حقوق کی دہائی دے کر آناً فاناً اپنی کثیر التعداد فوج بے پناہ جدید ساز و سامان کے ساتھ خلیج کے ریگستانوں میں اتاری وہ بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ اصل میں نہ انھیں کویت سے دلچسپی تھی اور نہ ہی کویت کے عوام کی خیر خواہی مقصود تھی ان کی دلچسپی تھی تو تیل کی اموال و دولت سے اور یہ دولت انھیں اپنے ہاتھوں سے نکلتی معلوم ہوئی تو انھوں نے انسانی حقوق کی آڑ میں یہ مستعدی دکھا ڈالی — جو بے مثال تھی۔

حالانکہ انسانی حقوق اسرائیل نے جس طرح غصب کیے ہوئے ہیں اور ۱۹۶۷ء سے وہ زور زبردستی جس طرح عربوں کے علاقوں پر قابض ہے اور اقوام متحدہ کی بار بار پاس شدہ قراردادوں کی دھجیاں بکھیر رہا ہے، امریکہ، برطانیہ، فرانس کو کبھی اس طرف خیال نہیں آیا۔ آتا کیوں؟ جب کہ اسرائیل ان کے مفاد کا گڑھ ہے اور جو ان کے مفاد کو بنائے رکھے ہو اس کی ہر ناجائز بات جائز ہی کہلانے کا درجہ رکھتی ہے اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ عراق کا کویت پر کسی طرح قبضہ کرانے کی سازش رچی گئی ہو اور پھر اپنے مفاد پر مبنی اسرائیل کی سلامتی کی خاطر عراق کو تباہ کرنے کا در پردہ منصوبہ بنایا گیا ہو۔

بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا۔ کویت سے عراق ہٹ گیا۔ عراق کی جنگ کے ذریعہ جو تباہی و بربادی ہوئی ہے اس پر پوری انسانی برادری سالہا سال تک ماتم کرتی رہے گی۔ عراق پچاس سال میں بھی اپنی اس تباہی و بربادی کو دور کر سکے گا یہ کہنا ہی بڑی مشکل بات ہے۔ ایک انسان کی ضد اور ہٹ دھرمی اور غلطی سے عراق اور اس کے عوام تو جان و مال سے تباہ و برباد ہو گئے اس

کے ساتھ ہی پوری ملت اسلامیہ بھی جذبات میں بہہ کر اپنی خفت و شرمندگی اور ذلت بھی سالہا سال تک نہ مٹا سکے گی۔

اس خلیجی جنگ کو ملت اسلامیہ اپنے لئے ایک سبق سمجھ لے تو یہ اس کے لئے بہتر ہی ہوگا اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے اس جنگ سے جو بات اجاگر کی ہے وہ ہے ملت اسلامیہ کا حد درجہ جذبات کا طوفان، بلا سوچے سمجھے صدام حسین کو پورے عالم اسلام کا رہبر اور خلفاء اسلام کا جانشین کہا گیا۔ آج اس پر ہمیں کس قدر خفگی محسوس ہو رہی ہے۔

ملت اسلامیہ سمجھ ہی نہیں پائی کہ حقیقت کیا ہے اور آج کے دور میں جو حقیقت کو نہ سمجھے اسے زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔؟

ملت اسلامیہ نے یہ نہ سوچا کہ کویت پر عراق کا قبضہ کرنے کے پلان کے پس پردہ سی، آئی، اے کی حکمت عملی تو کام نہیں کر رہی ہے۔ الحمد للہ! 'برہان' دہلی نے گذشتہ نظرات میں خلیجی جنگ کے بارہویں روز اظہار خیال کرتے ہوئے اس طرف ہلکے سے اشارے بھی کیے تھے مگر ہمیں اس کا اعتراف بھی ہے کہ ملت اسلامیہ کو جذبات میں بہتے ہوئے کو ہم پکڑ کر نہ نکال سکے۔ بعض اوقات اپنوں کا ہی بلا وجہ غصہ کا خوف کا بھی خیال کرنا ایک مجبوری ہی ہے۔ اس جنگ نے سعودی عرب کے حکمرانوں کے لیے یہ سوچ پیدا کی ہے کہ وہ قدرت کی بے پناہ دولت سے اپنے ملک کی طاقت کو بھی مضبوط کریں۔ دوسروں کے بل بوتے کبھی اپنی حفاظت ہو ہی نہیں سکتی ہے اپنے دفاع کو مضبوط کریں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے ہی میں اپنی عافیت ہے۔

جو صلاحیتیں، قوتیں اور خزانے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پاک محبوب نبیؐ کی مقدس سرزمین کو عطا کیے ہیں سعودی حکمرانوں کا فرض ہے

کہ وہ اسے خانۂ خدا کے تحفظ و بقاء کے لئے استعمال میں لائیں۔ کویت کو آزاد کرانے کے لئے انہوں نے بیرونی ملکوں کی فوجوں کو عرب کے ریگستانوں میں بلا لیا۔ یہ پہلی بار ہے اس لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے تاریخ شام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ اسلام کی فوج میں عیسائی مخبروں سے کام لیا گیا اس لئے اگر شاہ فہد نے ایک ضدی، ظالم اور گمراہ غاصب بھائی کی ہٹ دھرمی کو ختم کرنے کے لئے وقتی طور پر بیرونی طاقتوں کی مدد لی تو اسے کسی حد تک مجبوری کے ساتھ گوارہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسے آئندہ نہ دہرایا جائے یہ ہماری شاہ فہد اور عرب کے دیگر حکمرانوں سے گذارش ہے۔

ہندوستان کی نویں پارلیمنٹ اپنی مختصر سی مدت ۱۵ ماہ سے کچھ دن زائد پوری کر کے توڑ دی گئی ہے۔ اور مئی ۱۹۹۱ء کے آخری ہفتہ میں دسویں پارلیمنٹ کے لیے انتخابات کرانے کا صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے اعلان ہو چکا ہے۔

دسمبر ۱۹۹۱ء میں انتخابات کے ذریعہ کانگریس پارٹی کی شکست کے بعد شری وی پی سنگھ ہندوستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے انھیں پارلیمنٹ میں واضح اکثریت نہ مل سکی تھی اس لیے انھوں نے دائیں اور بائیں بازو کی پارٹیوں کی حمایت سے اپنی حکومت کی تشکیل کی۔ مگر نومبر ۹۰ء میں ایک بازو بی جے پی کی طرف سے حمایت واپس لے لینے کی وجہ سے وی۔ پی سنگھ کی حکومت گر گئی۔ اس کے بعد شری چندر شیکھر جنتا دل کے کچھ ممبران توڑ کر کانگریس کے ۱۹۴ ممبران

کی حمایت سے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔
لیکن کمزور پائے کا تخت کبھی مضبوط نہیں ہوتا ہے چندر شیکھر کا تخت بھی ٹوٹ گیا۔ اب ملک کے سامنے زبردست مسئلہ ہے انتخابات کا۔
دوٹر اتنی کم مدت میں پارلیمنٹ ٹوٹنے کو کبھی بھی پسند نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس سے ملک پر اخراجات کا زبردست بوجھ پڑتا ہے جو غریب عوام ہی کو متاثر کرے گا۔ اس لیے آئندہ ووٹ دہندگان یہی سوچ کر ووٹ دینگے کہ ملک میں پائیدار حکومت بنے جو پورے پانچ سال کی مدت پوری کرے اس خیال کو ذہن میں رکھ کر ہی ووٹر پائیدار حکومت بنانے اور چلانے والی جماعت کو ڈھونڈے گا۔
خدا کرے آئندہ ایسی ہی جماعت برسر اقتدار آئے جو ملک کو پائیدار حکومت دے سکے۔ تاکہ پارلیمنٹ اپنی پانچ سالہ مدت پوری کرسکے۔ اور اس طرح ملک کا عوام آئندہ انتخابات کے بے پناہ خرچ کے بوجھ سے بچ جائے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
(علمی و سیاسی خدمات)

احسان اللہ فہد فلاحی، بیت العذراء، جامعہ اُردو روڈ، علی گڑھ۔

قسط نمبر (۱)

ہندوستان کے اصحاب سیف و قلم علماء میں علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۸۸۵ء - ۱۹۴۹ء) کا نام نامی اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ آپ کی جولانگاہ ہندوستان کا وہ ماحول اور سرزمین تھی جو ہندو مسلم منافرت، انگریزی سازشوں کی تباہ کاری اور مسلم ملت کی زبوں حالی سے سسک رہی تھی۔ آپ نے وقت کے دھارے میں بہنے والے علماء کے خلاف وقت کو اپنے افکار و نظریات کے موافق بنانے کی کوشش کی۔ تقسیم ہند کے وقت حالات کے دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کیا۔ دو قومی نظریہ کی علی الاعلان علمبرداری کی۔ اور قرآن و سنّت سے اس کے حق میں دلائل دیئے۔ علماء دیوبند کی ایک بڑی تعداد کو اپنا ہمنوا بنایا اور رفتہ رفتہ وہ ہندوستانی علماء جو حالات کی نبض شناسی اور قرآن و سنت میں درک رکھتے تھے آپ کے افکار کے معتقد ہو گئے۔ اور دیوبند اسکول کا ایک بڑا طبقہ اسلامی

کچھ اور شخص کے خلاف ہونے والے ہندو جارحانہ عزائم کے لیے سدِ راہ بن گیا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد محترم کا نام مولانا فضل الرحمان تھا۔ آپ اپنے زمانہ کے فاضل اُردو ادب کے ماہر اور ڈپٹی انسپکٹر مدراس تھے آپ کے والد نے آپ کا نام پہلے فضل اللہ رکھا لیکن بعد میں عشرۂ محرم کی نسبت سے شبیر احمد رکھا۔ اور بعد میں یہی نام مشہور ہوا۔ ۱۳۱۲ھ میں آپ نے حافظ محمد عظیم دیوبندی سے اردو پڑھنا شروع کیا۔ ۱۳۱۴ھ میں منشی منظور احمد دیوبندی سے فارسی کا درس لینا شروع کیا۔ بعد ازاں فارسی کی بڑی بڑی کتابیں مولانا محمد یٰسین صاحب۔ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند سے پڑھی۔ ۱۳۱۹ھ میں ۱۴ سال کی عمر میں آپ نے عربی کی تعلیم کا آغاز کیا۔ عربی کے اساتذہ میں مولانا محمد یٰسین صاحب شیر کوٹی، مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی، مولانا حکیم محمد حسن صاحب دیوبندی اور بالخصوص حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا تھے ۱۳۲۵ھ میں تعلیم سے فراغت پائی۔ فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں چند ماہ تک بحیثیت مدرس کام کرتے رہے۔ اس کے بعد فتح پوری دہلی کے مدرسہ نے آپ کو بحیثیت صدر مدرس اپنے یہاں بلا لیا۔

۱۱ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ کو آپ کے والدین نے آپ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ ابھی شادی کے بعد چند ہی دن گذرے تھے کہ آپ کے والد محترم کا انتقال ہوگیا۔ ۱۳۴۴ھ میں شاہ حجاز کی دعوت پر جمعیتہ العلماء ہند کا نمائندہ بن کر حجاز تشریف لے گئے اور

زبان عربی میں زبردست تقریریں کیں۔ ۱۳۴۸ھ میں آپ جامعہ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے۔ اور وہاں تفسیر و حدیث پڑھاتے رہے۔ ۱۳۵۴ھ میں دارالعلوم کے پرنسپل کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ جہاں آپ نے دارالعلوم کی ترقی میں نمایاں کوشش کی۔ جمعیۃ علماء اسلام کے بانی صدر کی حیثیت سے آپ نے ملک کے طول و عرض میں دورے کیے۔ پاکستان بننے پر ۶ اگست ۱۹۴۷ء کی دوپہر کو دیوبند سے افتتاح پاکستان کی تقریب میں حصہ لینے کے لیے کراچی روانہ ہوئے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں جشن آزادی میں شرکت فرمائی۔ اور وہیں مقیم ہو گئے۔ ۸ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہاولپور کے وزیر اعظم کی درخواست پر جامعہ کی افتتاح کے لیے تشریف لے گئے۔ ۱۳ دسمبر کی شب کو بخار ہوا اور وہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کی ساری عمر دینِ اسلام کی خدمت میں گزری۔ آپ ایک مفسر، ایک محدّث اور ایک جانباز مجاہد تھے۔ آپ نے اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مختلف کتابیں لکھیں۔ قرآن کی تفسیر اور مسلم کی شرح شاہکار کتابوں میں سے ہیں۔ ذیل میں آپ کی کتابوں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) تفسیر عثمانی:۔ آپ کی تصانیف میں جس کتاب کو سب سے زیادہ مقبولیت ملی ہے وہ تفسیر عثمانی ہے۔ تفسیر عثمانی علم و تحقیق کا مرقع، اسرار و رموز کا پیکر، مطالب و معانی کا بحرِ بیکراں ہے۔ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعتاً قرآن کریم انسانوں کی ہدایت

کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ اس کو پڑھنے سے آنکھوں میں نور، دل میں سرور کی موجیں امنڈنے لگتی ہیں۔ تفسیر عثمانی جامع و مانع، متوسط، قدیم و جدید خیالات و روایات کی سیرابی کا سامان اور نئے تقاضوں کا مداوا ہے۔

مولانا عثمانی نے قرآن کی تفسیر کب سے شروع کی کسی کو معلوم نہیں ہے لیکن ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دس محرم ۱۳۳۶ھ تک آپ نے سات پاروں کی تفسیر مکمل کر لی تھی۔ بہرحال ۱۰ محرم ۱۳۳۶ھ کے بعد یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور ۹ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ کو قرآن کریم کی تفسیر آپ نے دیوبند میں مکمل کی۔ پانچ سال کے بعد اس کا پہلا ایڈیشن مولوی محمد حسن بجنوری نے شائع کیا۔ مولانا عثمانی کی تفسیر کے فارسی ترجمہ کو افغانستان میں تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ اور ہر جلد میں دس دس پارے رکھے گئے۔ اور اب پاکستان میں تاج کمپنی اور حاجی وجیہہ الدین صاحب نے بھی یہ تفسیر قرآن کریم کے حاشیے پر شائع کی ہے۔

۲۔ فتح الملہم شرح مسلم :۔ مذہب اسلام کی مقدس کتابوں میں قرآن کریم کے بعد تسیری اور بخاری کے بعد دوسری کتاب علم حدیث میں مسلم ہے۔ مولانا نے اس کتاب کی تین جلدوں میں شرح لکھی ہے۔ جس سے مولانا کے علم کی وسعتوں، بلندیوں، گہرائیوں اور مبلغ علم و فکر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا کی ذہنی اور علمی قوتیں ہر دقیق اور نازک مسئلہ پر اپنا پورا عمل دکھا گئی ہیں۔

(باقی آئندہ)

بسمہ تعالیٰ

"آفتاب جو غروب ہو گیا"

از محمد مشتاق تجاوری، ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی،
دودھ پور، علی گڑھ

تیرہ و تار تھی پہلے ہی یہاں شام حیات　　دامن چرخ سے ایک اور ستارہ ٹوٹا
کوئی بتلاؤ مری قوم کے معصوموں کو　　کون برباد ہوا کس کا سہارا ٹوٹا

یہی کوئی دن کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے جب ہمارے ایک دوست نے اطلاع دی کہ مولانا محمد تقی امینی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سنتے ہی اولاً تو سکتہ کی سی کیفیت ہو گئی۔ کانوں کو جیسے یقین نہ آیا ہو۔ ابھی تقریباً ایک گھنٹہ قبل انہوں نے مجھے یاد فرمایا تھا۔ میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ دھوپ سینک رہے ہیں۔ اور خاصے روبہ صحت معلوم ہو رہے ہیں۔ لیکن اب اچانک یہ خبر ۔۔۔ ؟ کیا واقعی مولینا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیا سچ مچ مولانا ہم سے جدا ہو گئے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ مولینا نے رخت سفر باندھ لیا۔ اور کوچ کر گئے۔؟ کیا امت کا یہ درخشندہ ستارہ بے نور ہو گیا؟ کیا یہ عظیم المرتبت شخصیت ہمیں داغ مفارقت دے گئی۔؟ کیا امت کی تقدیر کے آسمان سے ایک اور ستارہ شہاب ثاقب ہو گیا؟ ۔۔۔ ہم جلدی سے مولینا کے گھر کی طرف لپکے مگر دروازے

ہی پر جیسے کسی نے قدم پکڑ لیے ہوں۔ نالہ و شیون کی آخر یہ ایسا ثبوت تھیں کہ ہمیں اس خبر پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ؎

چل بسا داغ آہ میت اسکی زیب دوش ہے		آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

پروفیسر سابق ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی مولینا محمد تقی امینی صاحب کے اُٹھ جانے سے ایک پوری انجمن خالی ہو گئی ہے، وہ ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک کارواں تھے۔ وہ ایک آدمی نہیں بلکہ ایک انجمن تھے۔ ایک بزم اور ایک محفل تھے۔ اگر ان کو آج کے دور میں علماء کا سرخیل کارواں کہا جائے میں سمجھتا ہوں کہ بے جا نہ ہوگا۔ ان کی ذات اپنے آپ میں ایک ادارہ تھی۔ وہ علم و حکمت کا چلتا پھرتا خزانہ تھے۔ اُن کے دم سے علی گڑھ میں علم دین کی قندیل روشن تھی، جب کبھی کوئی دینی، فقہی مسئلہ حل نہیں ہو پاتا تھا تو یقین رہتا تھا کہ مولینا کے یہاں حل ہو جائے گا۔ مگر آہ ــــــ کسی کو بھی نہ بخشنے والی موت نے آج آپ کی باری لگادی۔ انھیں بھی ہم سے چھین لیا۔ اور وہ بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ ؎

ہائے گلچین اجل یہ تجھ سے نادانی ہوئی		پھول وہ توڑا چمن میں جس سے ویرانی ہوئی

ابھی چند ماہ پہلے ہی کی تو بات ہے مجھے مولینا نے یاد فرمایا اور ہفتہ وار اخبار "بلٹز" کا ایک شمارہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "مشتاق میاں! اس میں ہمارے متعلق ایک مضمون آیا ہے۔ اسے دیکھو"۔ میں نے لیا اور پڑھا۔ اس کا عنوان تھا " ستارہ جو آفتاب بنا" اس عنوان کا ذکر کرتے ہوئے مولینا نے فرمایا کہ کچھ دنوں بعد آئیگا " آفتاب جو غروب ہو گیا" اگرچہ اس لفظ کی دہشت سے ہمارا کلیجہ اچھل کر حلق میں آنے کو ہوا تھا مگر ہمیں یقین تھا کہ ہمارے شفیق استاد ابھی تادیر ہمارے سروں پر سایہ فگن رہیں گے

اور ہم ان کی صحبت میں علم و فن کے موتی چنتے رہیں گے۔ لیکن ان کا آفتاب بننا ہی گویا ان کے غروب کی علامت بن گیا۔ ؎

کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام ہے

آج امت مسلمہ جس قحط الرجال سے دوچار ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جب امت کا سیاسی و سماجی اور خصوصاً مذہبی شیرازہ منتشر ہو رہا ہے، پوری قوم ایک مستقل کرب و بے چینی میں مبتلا ہے، امت کے مسائل و مصائب کا مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، ان کی پریشانیاں پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہیں، آئے دن کے ہنگاموں اور شورشوں میں قوم کی رہی سہی قوت بھی ختم ہو رہی ہے، ایسے مصائب سے پُر حالات میں مولانا جیسے مدبر، ذہین اور زبردست عالم دین کا اٹھ جانا پوری امت کے لئے ایک سانحہ سے کم نہیں ہے۔

ضرورت جتنی بڑھتی جا رہی ہے صبح روشن کی

اندھیرا اور گہرا، اور گہرا ہوتا جاتا ہے

مولٰنا محمد تقی امینی صاحب کی ولادت ۲۲ رشوال ۱۳۴۴ھ مطابق ۵ مئی ۱۹۲۶ء کو ضلع بارہ بنکی کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد کا نام عبدالحلیم تھا۔ ابتدائی تعلیم کے لیے آپ کو گاؤں ہی کے ایک مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ وہاں مولانا نے کلام پاک حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ قرأت و تجوید کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ذہانت و فطانت کی علامات بچپن ہی سے نمایاں تھیں۔ اس لیے آپ کے اساتذہ نے ان کے والد صاحب سے مشورہ کر کے انہیں جامع العلوم کانپور میں داخل کروا دیا۔ یہاں آپ نے عربی زبان کے علاوہ اسلامیات، فقہ اور تفسیر کی تعلیم پائی۔ اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں علوم دینیہ کی تعلیم

کے لیے تین اداسے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور مدرسہ امینیہ دہلی مگر ان میں مفتی کفایت اللہ صاحب کی وجہ سے امینیہ کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس وقت تو امینیہ کے در و دیوار سے بھی علم و عرفان کی بارش ہوتی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے طلباء بھی سند فراغت لینے کے بعد وہاں درس حدیث کے لیے آتے تھے اس لیے مولانا محمد تقی صاحب کے بھی اساتذہ نے سمجھا کہ اس درِ شاہوار کو جب تک مولانا مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمۃ جیسا عظیم المرتبت فقیہہ اور محدث نہیں ملے گا اس وقت تک اس کی فطری تابناکی محتاجِ رہنمائی رہے گی چنانچہ آپ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ امینیہ دہلی بھیج دیا گیا۔ یہاں گویا آپ کو منزلِ مقصود مل گئی یا فردوس گم گشتہ آپ کو حاصل ہو گئی، آپ کی امیدیں بر آئیں۔ علم و عرفان کی جس محفل کے لیے آپ کے سینہ میں نامعلوم سی خلش تھی، اس کو تسکین مل گئی۔ علم و فقہ کی تخم ریزی کاتب ازل نے آپ کی فطرت میں رکھی تھی اس کو برگ و بار نکالنے کا موقعہ مل گیا اور اس نے اپنی ننھی ننھی کونپلیں نکالنی شروع کیں۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بھی جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ ایک انتہائی ذہین اور باصلاحیت طالب علم ہے اس لیے اپنی خصوصی توجہات مولانا پر منعطف کر دیں۔ قابل عظمت استاذ کے زیرِ سایہ یہ ننھا سا پودا بہت جلد تناور درخت بن گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولینا کی نسبت "امینی" سے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ "امینیہ" کی طرف نسبت ہے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ نسبت مولانا کے "نظریہ امانت" کی غماز ہے۔ جس کو انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب اسلام کا زرعی نظام میں پیش کیا ہے۔ بعض وجوہ اور حالات کی

نامسا عدت کی وجہ سے اس نظریہ کو فروغ نہ مل سکا اور لوگوں نے "امینی" کو مدرسہ کی طرف نسبت سمجھ لیا۔

امینیہ سے فارغ ہوتے ہی مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے آپ کی عمدہ صلاحیتوں کے پیش نظر اپنی ذمہ پر میواتیوں کے مشہور مدرسہ، مدرسہ سبحانیہ میں جو اس وقت قرول باغ دہلی میں تھا مدرس کی حیثیت سے بھیج دیا۔ مشہور عالم، مولینا عبدالمنان صاحب، مولانا عبدالغفار صاحب صدر مدرس و شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی اور مولانا محمد اسحاق صاحب شیخ الحدیث مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح (میوات) نے اسی زمانہ میں آپ سے فیض حاصل کیا۔ اسی دور میں آپ کے تعلقات ندوۃ المصنفین کے بانی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور "برہان" کے مدیر مولینا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم سے استوار ہو گئے تھے جو تادم حیات باقی رہے لیکن مولینا کو مدرسہ سبحانیہ کی فضا راس نہ آئی اس لیے جلد ہی دار العلوم ندوۃ العلماء چلے گئے، یہاں کی علمی محفلوں سے مولینا خود بھی مستفید ہوئے بلکہ مولانا کی آمد سے ان میں رونق آگئی لیکن مولانا یہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکے آپ کو جلد ہی ندوۃ العلماء سے سبکدوش ہو جانا پڑا۔ اس کے بعد آپ جامع العلوم کانپور اور وہاں سے مستعفی ہو کر مدرسہ ثانویہ ناگپور (مہاراشٹر) تشریف لے گئے۔ یہیں آپ نے اپنی سب سے مشہور کتاب "اسلام کا زرعی نظام" لکھی یہ مولانا کی پہلی با ضابطہ تصنیف تھی۔ ناگپور کے مدرسہ سے سبکدوش ہوئے تو دار العلوم معینیہ اجمیر میں خدمات شروع کر دیں۔ یہاں آپ نے اپنی دوسری مشہور کتاب "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" لکھی۔

اگرچہ مولینا ایک کامیاب مدرس تھے اور مختلف مدرسوں اور علاقوں

میں ایک عرصہ تک خدمات انجام دیتے رہنے سے مزید تجربات ہو گئے تھے۔ مگر مولانا کے مزاج میں جو فطری آزادی ودیعت کی ہوئی تھی اور آزادانہ کام کرنے کا جو مادہ مولانا کی طبیعت کا جزو ثانی تھا وہ مولانا کو کسی جگہ جمنے نہیں دیتا تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ انہیں ایسا میدان عمل مہیا ہو جائے جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کی ترجمانی کر سکیں۔ اپنی تصنیفی اور تالیفی سرگرمیوں کو بغیر کسی کی مداخلت کے جاری رکھ سکیں جہاں ان کے خیالات پر کسی مہتمم یا صدر مدرس کی قدغن کا اندیشہ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے مولانا کی منشاء کے مطابق انہیں جگہ دلوادی۔ آپ ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں لکچرر کی حیثیت سے مقرر ہو گئے۔

علیگڑھ میں مولانا کے لیے جہاں اور سہولیات تھیں وہاں ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی علیہ الرحمۃ اور مولانا فضل الرحمن گنوری جیسے دانشوروں کی رفاقت مل گئی۔

مولانا کو جو معاشی بے فکری اور اظہار خیال کی آزادی نصیب ہوئی تو آپ نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو تصنیف و تالیف کے میدان میں وقف کر دیا۔ اپنی پوری توجہ تحقیق و تصنیف پر مبذول کر دی اور اس میدان میں بہت ہی مختصر وقت میں وہ حیرت انگیز کارکردگی کا اظہار کیا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ یونیورسٹی کے ارباب انتظام نے اس غیر معمولی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے لکچرر سے براہ راست پروفیسر بنادیا۔ مولانا خود فرماتے تھے کہ "اللہ کا شکر ہے مجھے پروفیسر بننے کے لیے نہ کسی کی سفارش کی ضرورت پیش آئی اور نہ ہی درخواست دینے کی، خود بہ خود پروموشن ہوتا گیا۔"

مولانا محمد تقی امینی صاحب یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے پروفیسر اور

شعبۂ دینیات کی عمارت بھی ہے۔ آپ نے اس شعبہ کے بکھرے وقار کو مستحکم کیا اور اس کی ہیبت منوائی۔ آپ کی اور مولانا سعید اکبر آبادی ہی کی شبانہ روز کی محنتوں کے نتیجہ میں اس شعبہ کی علیحدہ عمارت بنی اور لائبریری بنی۔ اس شعبہ میں آپ نے نظامت دینیات کے فرائض بھی انجام دیئے۔

اگرچہ آپ کی عمر ریٹائرڈ ہونے کی ہو چکی تھی مگر صحت اچھی تھی۔ اور یونیورسٹی کے ارباب انتظام کا اصرار تھا اس لئے ابھی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مگر تین سال قبل اچانک گٹھیا کے مرض نے شدید حملہ کیا اور چند ہی مہینوں میں بالکل صاحب فراش ہو گئے۔ ایک سال پہلے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید مولانا داعیٔ اجل کو لبیک کہنے والے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور پھر رو بصحت معلوم ہونے لگے۔ بلکہ خاصے صحت مند محسوس ہونے لگے تھے۔ تاہم سردی میں شدت کی وجہ سے عموماً گھر ہی میں رہتے تھے۔ اگر دھوپ تیز ہوتی تو کبھی کبھی چہل قدمی بھی کر لیتے تھے۔ حکیم کلیم اللہ صاحب کا علاج چل رہا تھا اور اس سے خاصے مطمئن تھے۔

آج ہی ۲۱ر دسمبر کو صبح مجھے بلوایا اور کہا "ہماری طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ ذرا حکیم صاحب کو میرا حال بتا آؤ" میں نے سائیکل لی اور فوراً دوا لے کر آگیا اس وقت یہی کوئی سوا گیارہ بجے تھے۔ مولانا دھوپ سینک رہے تھے۔ میں اجازت لے کر اندر گیا اور دوا پیش کی۔ دوا لیتے ہوئے مولانا نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "میاں تم آتے ہی نہیں میں نے تم سے کہا تھا ہر روز آیا کرو تم سے مل کر طبیعت ذرا خوش ہو جاتی ہے اور کچھ علمی باتیں بھی ہو جاتی ہیں" میں نے عرض کیا۔ "حضرت آپ کی خرابی صحت کی وجہ سے پابندی نہیں کر پاتا کہیں تکلیف نہ ہو" فرمایا۔ "آیا کرو ہمیں تمہارا انتظار

رہتا ہے"۔ میں نے وعدہ کر لیا اور چلا آیا۔ ابھی مجھے آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ایک عزیز نے آکر اطلاع دی، مولانا محمد تقی امینی صاحب چل بسے'
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا جب اُمّت کا یہ درد شناس ہوار' یہ تابندہ و درخشندہ ستارہ اور یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

وہ ایک دل جو چمک رہا تھا خلوص و ایماں کی تابشوں سے
خلوص و ایماں کے دشمنوں کو خبر سناؤ کہ وہ بھی ڈوبا

پروفیسر مولانا محمد تقی امینی صاحب کے آخری دنوں میں مجھے خاص طور پر ان کی خدمت میں رہنے کا موقع حاصل ہوا۔ ان دنوں میں عموماً آپ کی خدمت میں حاضری دیتا رہتا تھا۔ میں نے مولانا کے مزاج میں جو خاص عناصر ترکیبی پائے جن سے کوئی بھی شخصیت تشکیل پاتی ہے وہ ان کی سادگی تھی۔ وہ انتہائی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ نام و نمود، شہرت و ناموری، عجب و خود بینی، غرور و تکبر، کبر و نخوت، حسد و جلن وغیرہ بُری صفات سے قطعی مبرا تھے۔ بلکہ ان کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ بھیڑ بھاڑ، جلسے جلوس سے آپ کی طبیعت گھبراتی تھی۔ اگرچہ آپ شعلہ بیان خطیب تھے مگر یونیورسٹی کی جامع مسجد کے علاوہ کہیں بھی کیسا بھی جلسہ ہو اس میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ آپ زیادہ تر گوشہ گیر ہی رہتے تھے۔

آپ کے مزاج کا دوسرا اہم عنصر محبت تھا۔ آپ ہر کسی سے محبت کرتے تھے، بلکہ محبت ہی آپ کی طبیعت کا غالب پہلو تھا۔ آپ کی محبت کا فیض اتنا عام تھا کہ اس میں کسی طبقہ، یا گروہ، کسی مسلک یا مذہب، کسی ذات یا برادری کی کوئی قید نہیں تھی۔ جس طرح ایک بڑا آدمی آپ کی محبت میں

شریک ہو سکتا تھا اسی طرح ایک چھوٹا آدمی بھی۔ آپ جیسے ایک مسلم کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے اسی طرح ایک غیر مسلم کو بھی، جس طرح آپ کے جذباتِ محبت عالموں کے لئے تھے اسی طرح جاہلوں کے لیے تھے۔ آپ فسادات کی خبریں سن کر بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ کہتے تھے۔ "جس گھر کا کوئی فرد اس جنون کی نذر ہو گیا اس گھر کا کیا عالم ہوگا؟"

مولانا کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت محبت کا ہی ثمرہ تھا کہ ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی جہاں یونیورسٹی کے اعلیٰ ذمہ داران اور اساتذہ و طلبہ کا سیلاب امنڈ آیا وہیں محلے کے معمولی مزدور اور جھگیوں میں رہنے والوں کی آنکھیں بھی اشکبار ہو اٹھیں۔

مولانا بچوں پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے، ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ اگر کسی کا کوئی مضمون شائع ہو جاتا تو اسے انعام دیتے۔ چاہے بلوا کر ہی دینا پڑتا۔ معمولی معمولی کاموں پر بہت زیادہ احسان مندی کا اظہار فرماتے حتیٰ کہ کبھی کبھی تو کام کرنے والا شرمندگی محسوس کرنے لگتا۔

مولانا اگرچہ زندگی بھر استاد رہے۔ تمام علوم دینیہ کی وقتاً فوقتاً تدریس کی خدمات انجام دیں لیکن مولانا کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں مولانا نے متنوع موضوعات پر اتنا تصنیفی کام کیا ہے کہ ایک آدمی سے اس کی مختصر سی زندگی میں اس کی توقع بہت ہی مشکل سے کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ مولانا کی کتابیں تین درجن کے قریب ہیں۔ لیکن موضوع کے تنوع بلکہ نیاپن سے ان کی حیثیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

اگر ان کی کتاب 'اسلام کا زرعی نظام' اور 'فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر' سامنے ہو تو وہ ایک بالغ نظر فقیہہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اگر 'احکام

شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت'۔ 'اجتہاد کا تاریخی پس منظر'۔ 'اجتہاد اسلامی نقطۂ نظر سے' اور 'مقالاتِ احسنی' سامنے ہو تو اعلیٰ درجہ اصول و اصول الفقہ کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر 'حدیث کا درایتی معیار' سامنے ہو تو ان کی محدثانہ وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اگر 'تہذیب کی تشکیلِ جدید' 'مذہبی دور کا تاریخی پس منظر' 'عروج و زوال کا الٰہی نظام' 'مذاہب میں مفاہمت کے اصول' 'عہدِ جدید کی اجتماعی مشکلات' 'فتنۂ الحاد اور' کو پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب و تمدن' عروج و زوال کے اصول پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔

ان کے علاوہ متعدد موضوعات پر ان کی عمدہ تصنیفات ہیں جو ان کی دقتِ نظر' وسعتِ مطالعہ اور علمی مقام کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کی تصنیفات کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں اور مختلف ممالک میں بڑی کثرت کے ساتھ ان کو پذیرائی مل رہی ہے۔ اور آخر میں 'حکمۃ القرآن' کے نام سے قرآنیات پر ایک عمدہ کتاب لکھی تھی۔ اور اب 'ہدایۃ القرآن' کے نام سے تفسیر لکھ رہے تھے۔ مگر افسوس کہ اس کے چھ اجزاء بھی مکمل نہ ہو سکے۔

مولانا نے ایک علمی پندرہ روزہ "احتساب" بھی جاری کیا تھا جو ایک عرصہ تک فقہ و اسلامیات پر قابلِ قدر مواد پیش کرتا رہا لیکن مولانا کی خرابیٔ صحت کے سبب بند ہو گیا۔ کاش کہ کوئی مولانا کی نگارشات کو زندہ رکھے۔

(ختم شد)

اُردو ادب اور شاعری

از: آفتاب احمد خاں، ایم۔ اے (انگلش و اُردو)
معرفت: حمیدیہ کلینک، نواب کا چوراہہ۔ بھوپال ۳۰۲۰۰۳۔

مغل عہدِ حکومت میں جب ہمارے ملک نے سیاسی حیثیت سے
صحیح معنیٰ میں ایک اکائی اور وحدت کی شکل اختیار کی تو ایک ملک کے لیے
ایک واحد زبان کی ضرورت بھی محسوس ہوئی، چنانچہ ابتداً ہر صوبہ کی
دیسی زبان میں مسلمانوں نے اپنے عربی و فارسی الفاظ ملا کر ہر صوبہ کی
زبان کو ہندوی کا لقب دیا۔ آخر شاہ جہاں صاحبقراں کے عہد میں
خاص پایۂ تخت دہلی (۱۶۴۷ء) کی ہندوی زبان نے سارے
ملک میں ٹکسالی زبان کی حیثیت سے رواج پایا جو شروع میں زبان اردوئے
معلی یعنی دار السلطنت یا شاہی قلعہ کی زبان کہلائی لیکن بقولِ محقق
شہیر پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اس زبان
کے لیے اُردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ البتہ یہ قیاس درست
نظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ سے ہندوستان میں اُردو کا لفظ لشکر اور
لشکر گاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا تھا۔ اسی لیے اس دور

میں بازارِ لشکر کو اُردو بازار کہا جاتا تھا" بہ ایں سبب "برِ عظیم" ہند و پاک کے کئی شہروں میں اس نام کے بازار تا حال موجود ہیں" اجمالی طور پر یہی اس زبان کی تاریخ ہے۔

کسی زبان کے ساتھ بطور لاحقہ لفظ "ادب" بھی اس کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں اختصاراً لفظ ادب کی وضاحت کرنا بھی ضروری و لابدی معلوم ہوتا ہے۔ لفظ ادب کی تاریخ مختلف ارتقائی منازل طے کرتے کرتے ہم تک پہونچی ہے۔ لفظ ادب کے قدیم ترین معنی عادت' طرزِ عمل یا اُس طریقہ کے ہیں جسے آدمی وراثت میں پائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ "ادب" کا صیغۂ جمع ہے جس کے لغوی معنی خو' ڈھنگ' عادت' طریقہ یا طرزِ عمل ہیں نیز یہ کہ "ادب" 'داب' کی ترقی پذیر شکل ہے۔ بعد ازاں اس لفظ کے معنوی ارتقاء کی وجہ سے عملی اور اخلاقی پہلوؤں میں اس کے معنی آسان اور نمایاں تر ہوتے گئے اور اس کا معنوی دائرہ عمدہ صوفیانہ عادات' بہتر تربیت اور اچھے اخلاق وغیرہ پر محیط و محتوی ہو گئے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ پہلی صدی ہجری کے زمانے سے ہی متذکرہ مفاہیم کے دوش بدوش یہ لفظ معلمانہ اور متعلمانہ معنی پر بھی دلالت کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس معنی پر اس کی گرفت کمزور پڑتی گئی اور جہاں تک اس کے معنوی ارتقاء کا تعلق ہے تو اس نے فرانسیسی لفظ "لٹریچر"، جس کا اطلاق ہر اُس لفظ پر ہوتا ہے جو زبان کے حدود کے اندر فکرِ عمیق اور نگاہِ حساس کے نتیجہ میں تحریر کی جائے" کا معنی پا لئے۔ بہر سو اس کے مجموعی معنی ہوئے عمدہ عادات و اطوار' فصاحت و بلاغت' تنقید و تبصرہ اور اشعار و انساب وغیرہ۔ باعتبارِ

مذکورہ معنی ادیب کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ وہ وہ شخص جس میں نیک خصلتیں جمع ہوں وہی ادیب یعنی ادب جاننے والا ہے۔"

ادب ان کتابوں اور صرف اُن کتابوں پر مشتمل ہے جو اول تو اپنے موضوع اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے عام انسانی مذاق کے موافق ہوں اور دوسرے یہ کہ اُن میں زبان و بیان کی لطافتوں کو اصل الاصول قرار دیا گیا ہو۔ ایک ادبی شہ پارہ علم ہیئت، معاشیات، فلسفہ یا تاریخ کے مضامین سے اس وجہ سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ کرنے والوں کے صرف ایک گروہ کو محظوظ نہیں کرتا بلکہ عام انسانوں کو سرور و نشاط بخشتا ہے دوسرے اس سبب سے بھی کہ علم ہیئت یا تاریخ وغیرہ کا کام علمیت میں اضافہ کرنا ہے اور ادب کا کام یہ ہے کہ خواہ معلومات میں ترقی ہو یا نہ ہو لیکن وہ جس پیرایۂ بیان میں موضوع پیش کرتا ہے وہ اس قدر دلچسپ ہو کہ انسان کی جمالیاتی (Aesthetic) تشنگی دور ہو جائے اور سامع یا قاری یہ سُن کر اور پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بالفاظ دیگر ادب انسانی زندگی کی تفسیر ہے اور قدرت نے انسان میں جن سرمدی اشیاء کو ودیعت کیا ہے ان ہی کے اظہار کو ادب لطیف کہا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کی ترویج و ترقی کا انحصار اس قاعدۂ کلیہ پر ہے کہ وہ خواص کے ساتھ ساتھ عوام پسند بھی ہو، اپنے، بیگانے، جانے انجانے سب ہی اُس کے دلدادہ ہوں، دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اگرچہ

اگرچہ زبان کی عمر جیسا کہ گذشتہ سطور میں گذرا کچھ زیادہ طویل نہیں، پھر بھی یہ زبان اپنی لچک، شیرینی، لطافت و نزاکت اور ربط باہم کے سبب انگریزی کے بعد دنیا کی تمام زبانوں میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ علاوہ بریں کسی بھی زبان کے ادبی شہ پاروں سے اس کا تصنیفی سرمایہ بھی کچھ کم نہیں چونکہ یہ زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی لہذا یہاں کے ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے اس کے نقش و نگار سنوارنے، بنانے میں اپنا اپنا خونِ جگر اور سوزِ دماغ یکساں طور پر صرف کیا ہے اس لیے اس زبان کو ہندوستانی کہنے پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔ اس نے ہندوستانی ماحول میں ترقی کی اور اس کی ترقی میں دونوں مذاہب کے لوگوں کا برابر تعاون رہا۔ اردو زبان و شاعری نے ہندوستانی ماحول، دیو مالاؤں اور موضوع کے اعتبار سے ہندوستان کی ہر چیز کو اپنایا، اس وجہ سے اس زبان میں وسعت پیدا ہوئی اور یہ ایک مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت بن گئی۔

اردو شاعری کے اصناف سخن میں غزل سب سے مقبول ترین صنف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی پشت پر زندگی کے ارتقاء کی طویل کہانی ہے، اس میں تمدنی وراثت اور تہذیبی اثرات کے اجزاء خصوصی کی جلوہ گری و کار فرمائی بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ اردو غزل کا پنچ گھر میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہی بلکہ اس میں ایک سماجی احساس اور حیات انسانی کے تقاضوں کا بھرپور سامان موجود ہے۔ صوفی فلسفہ اور ویدانت کے امتزاج و آمیزش کے سبب اس میں نہایت اعلیٰ موضوعات کا اظہار اور بیان ہوا ہے۔ مثلاً ؎

تمہیں سچ سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں
کہ مشتِ خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

خواجہ میر دردؔ اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں علیہ الرحمہ جیسے عظیم صوفی شعراء نے اس میں سارے زمانے کے درد و احساسات کی ایک وسیع و عریض اور عریض اور نئی دنیا سمو دی ہے۔ چنانچہ اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے امیرؔ مینائی نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دوسری طرف غالبؔ و مومنؔ نے اسے کائنات کی وسیع و عریض فضاؤں اور بسیط خلاؤں سے پرے پہونچا دیا ہے۔ ؎

منزل اک بلندی پہ اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا　　(غالبؔ)

یا ؎　ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا　　(غالبؔ)

غزل ہمارے یہاں سب سے زیادہ مقبول صنف شاعری اس لئے ہے کہ وہ ہمارے دل اور سماج کی جو رُوداد ہے اُسے پوری وفاداری اور شدت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل اردو شاعری کی صنوف میں مستحکم ترین صنف ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی پشت پر صدہا فنکاروں کی صناعانہ فتوحات اور گرانقدر تخلیقات کے طویل اور زریں سلسلے ہیں جو ماضی میں دور تک چلے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ غزل اپنے بنیادی رمزیاتی اسلوب کی مداومت کے باوجود ہر دور میں بلکہ

ہر بڑے شاعر کے کلام میں اک نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ بیان اور ابلاغ و ترسیل کی لاکھوں نزاکتوں اور بے شمار لطافتوں سے اس کا دامن لبریز ہے۔ افکار و تأملات، احساسات و انفعالات، حقائق و بصائر اور اسالیب و تصور کے اس حیرت انگیز طلسم خانے کا جواب فارسی کے علاوہ دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان اور شاید ہی کوئی دوسرا ادب ہو جو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ اردو شاعری علی الخصوص غزل میں زبان و بیان کی فصاحت اور سادگی، سوز و گداز نیز مضامین کی تاثیر و جدت اور تخیل کی ندرت، ایسی خوبیاں ہیں جو کسی زبان کو شاذ و باید ہی نصیب ہوں۔ اردو شاعری کا ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم کہا جا سکتا ہے۔ بقول غالب : ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

یہ قول نہ صرف غالب بلکہ پوری اردو شاعری پر صادق آتا ہے۔ حسن تغزل کی شاعری گنجینۂ معنی کا بہترین نمونہ ہے، جس ایجاز و اختصار کے ساتھ غزل کے کسی ایک شعر میں بڑے سے بڑے مسئلے پر اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ فارسی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ نہ صرف ادبی مجالس بلکہ سیاسی و سماجی اجتماعات حتیٰ کہ پارلیمنٹ کے خشک مباحث تک میں تاثیر اور دلنشینی پیدا کرنے کے لیے اردو شاعری کے غزل کے اشعار سے کام لیا جاتا ہے، سینما، تھیٹر نیز دیگر تفریحی اور کلچرل پروگراموں کی تو اردو شاعری گویا جان اور جزءِ لاینفک ہے۔ جنگِ آزادی میں اس کے نمایاں کردار اور اہم رول ادا کرنے کے سلسلے میں یہاں کچھ عرض کرنا

تطویل کا سبب ہو گا کہ یہ موضوع ایک علیحدہ مقالہ کا متقی ہے۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ :

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

جیسے سینکڑوں اشعار نے نحیف و ناتواں لوگوں میں قوت و توانائی اور مردہ دلوں میں یہ کہہ کر روح پھونک دی تھی :

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اور یہ کہ ؎

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

اُردو شاعری میں اضافت کی مدد سے تشبیہوں، استعاروں اور لفظی تصویروں کا جو آئینہ خانہ بنایا گیا ہے، اس کی مثال دوسری زبانوں کی شاعری میں ذرا مشکل سے ملے گی۔ اس سلسلہ میں اُردو، فارسی کے دوش بدوش ہے اور کبھی آگے بھی بڑھ جاتی ہے۔

روایت پسندی اور بعض زوال پذیر رسوم و عادات کے باوجود، جو اُردو شاعری میں دلبستان لکھنؤ کے اثرات سے مروج ہوئیں، محض رُخ و رخسار اور زلفِ محبوب کی کہانی نہیں بلکہ اس کے برعکس اُردو زبان و ادب کے بڑے غزل گو شعراء نے زندگی کا ساتھ دیا ہے اور ہر ایک نے اپنے لافانی اشعار میں سیاسی و معاشرتی، تہذیبی و تمدنی اور خارجی و اندرونی صداقتوں کو جذب کیا ہے۔ اگر ہم اردو شاعری کے ارتقائی مراحل

کا تقابلی مطالعہ کریں معلوم ہوگا نسبتاً آج وہ ترقی کی کتنی منزلیں طے کر چکی ہے اور گل و بلبل، لب و رخسار اور خال محبوب سے کتنی دور پہنچ گئی ہے۔ اس وضاحت کے بعد اس اعتراض کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اردو شاعری میں اخلاقی بلندی کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ یہ پستی سکھلاتی ہے، حالانکہ شاعری تہذیب اخلاق کا بڑا ذریعہ ہے لیکن اول تو ہر شاعر ریفارمر اور مصلح نہیں ہوتا اور نہ ایسا ہونا ضروری ہے، دوسرے ہمیں یہ تسلیم کہ ہر اردو شاعر نے اصلاحِ اخلاق کو مستقل موضوع سخن نہیں بنایا۔ لیکن اس کے علی الرغم اُن کے دواوین اخلاقی عناصر، گرمیٔ حیات، سوز و گداز، اخوت و مساوات اور انسانی ہمدردی وغیرہ امور سے خالی بھی نہیں اگر سطحی نظر سے بھی اُن کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اُن کے کلام میں اصلاحِ اخلاق کی بلندیاں نمایاں طور پر دکھائی دیں گی۔ مثلاً حفیظ جالندھری اپنے احباب کی دنی فطرت کی اصلاح کتنے پیرایہ میں کرنا چاہتے ہیں:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یا پھر

اُن کو دے آئے ہیں خود اپنی محبت کے خطوط
غمگساروں کی ذرا نامہ بری تو دیکھو

دراصل اردو شاعری نے حیاتِ انسانی کے ہر موڑ پر اس کی ترجمانی کی ہے اور اُس کا ساتھ دیا ہے۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ وقوع پذیر ہوا جس کے سبب بنگال کے نکل جانے سے ہماری معاشیات کی ریڑھ

کی ہڈی ٹوٹ گئی اس وقت بنگال اور کرناٹک کے خزانے ڈھل ڈھل کر انگلینڈ پہونچ رہے تھے اور انہی خزانوں کی بدولت وہاں صنعتی انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ اور ہندوستان روز افزوں مفلس و قلاش ہوتا جاتا تھا۔ ہماری اس حالتِ زار کو شیخ غلام احمد ہمدانی مصحفی امروہوی متوفی ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء نے ایک شعر میں یوں واضح کیا ہے۔

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اور Subsidiary Alliance پر شیخ قلندر بخش جرأت متوفی ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء جیسے غزل گو شاعر نے کہا۔

کہیئے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھوں قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ نہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگال کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

اور آج' ارتقاء کی منزلیں بتدریج طے کرتی ہوئی اُردو غزل اپنے لغوی معنی اور خالص رنگِ تغزل سے کتنی دور اور آگے پہونچ گئی ہے۔

زندگی عارض و کاکل کی گزرگاہوں سے
بڑھتے بڑھتے رسن و دار تک آ پہنچی ہے

دراصل شاعر کا فن اور اس کا ذہنی سفر ذات و کائنات کی کشمکش اور تخیلات کی وادیوں کا ایک ایسا رزمیہ (Epic.) اور ایک ایسا دشتِ تمثیل ہے جس کی تفہیم کے لئے اس لمحۂ سکوت و تحیر کی

ضرورت ہے جس میں ہر صورت خود اپنا مفہوم بن جاتی ہے۔ چنانچہ شاعری کا باغ خونِ دل سے سیراب اور سوزِ جگر سے منور ہوتا ہے، شاعری صرف لطف اندوزی کا نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کی عقدہ کشائی کا ذریعہ ہے۔ اس کی آسانیاں مشکلیں اور اس کی مشکلیں آسانیاں پیدا کردیتی ہیں۔ شاعری کیفیت کے ملکوں کی سیر ہے، صحرا نوردی اور کوہ کنی ہے، تمناؤں کی تربیت اور تہذیب ہے، شاعری جنون کا سبق دے کر ہوش کے آداب سکھاتی ہے، جذبات کو تہہ و بالا کر کے سکون کے نقشے بناتی ہے۔ اس کی مثبت پر خواہ اخلاقی اور روحانی مصالح ہوں یا نہ ہوں، کیونکہ یہ ایک آزاد انسان کی واردات قلبی کے سوا کچھ نہیں مگر شاعر کی ذہنیت اس کے ادراکِ حقیقت پر غالب نہیں آنی چاہیئے یہی شاعری کی آبرو اور جان ہے، اسی ادراکِ حقیقت کی ترجمانی کا واقعی انکشاف غالب نے کیا ہے: ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی شاعر کے لیے انسان ہونا اور آگاہ ہونا اک دردِ بے درماں ہے:۔

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانہ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

آج غزل کا دائرہ نہایت وسیع ہوگیا ہے۔ جس میں زندگی کے ہر موضوع کو سمو لیا گیا ہے، زبان کے اعتبار سے بھی سادگی وصفائی کی طرف توجہ ہوئی اور پیچیدہ گنجلک اندازِ بیان متروک ہوا لہذا آج اس میں انسانی جذبات کی صاف ستھری تصویریں نظر آنے لگی ہیں عشق

محض بوالہوسی کے جذبات کا اظہار نہیں رہ گیا بلکہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور سیاسی نصب العین تک کے لیے عشق کا استعارہ استعمال ہونے لگا ہے۔ پھر عشق کا غم انسانی دکھ درد کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا کہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ غزل کے شاعر نے بھی زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں ملائیں اور اُن کو اپنے ہاں جگہ دے کر غزل کی حقیقت سے قریب تر کر دیا۔

زبان زندگی کو متاثر کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اور زندگی کی ترجمانی کا وسیلہ بھی، مگر اس کے لیے تنگ نظری سے گریز اور فراخ دلی سے کام لینا لازم ہے۔ اس حیثیت سے اُردو کی وسیع المشربی اور کشادہ دامانی پر اگر ہم ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی فرہنگ و مصطلحات میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی، انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی و لاطینی اور ہمارے ملک کی تمام مقامی و صوبائی زبانوں کے الفاظ ملیں گے۔ درحقیقت اُردو ادب اور شاعری کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ "خُذ ما صفا و دَع ما کدر" یعنی اچھے کو اختیار کرو اور بُرے سے گریز۔

(ختم شد)

ہندوستان میں عربی شاعری

توقیر عالم فلاحی
ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

عربی زبان وادب میں شعر وشاعری کی دنیا لالہ زار نظر آتی ہے۔ عہد جاہلیت ہو یا اوائل عہد اسلام، عہد امیہ ہو یا عہد عباسیہ یا پھر عہد اسپین اور عہد جدید، ان تمام ادوار کے تقلب کے ساتھ ہی ساتھ مختلف جہتوں سے شعروشاعری کے جلوے دکھائی پڑتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ عربی زبان نے خطۂ عرب سے نکل کر پورے مشرق ومغرب کو اپنے جلوں میں لیا۔ اور زبان وادب کی دنیا کو اپنے فیوض و برکات سے مالامال کر دیا۔ عربی زبان کا فیضان عام منثور ادب کے علاوہ منظوم ادب کو محیط ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاعری نے ہر دور، ہر خطۂ ارض اور ہر شعبۂ زندگی میں فکر وخیال کی دنیا کو بدلا ہے۔

جن دیارِ غیر کو عربی زبان اور ادب کی قدردانی کا شرف حاصل ہے ان میں ہندوستان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ہاں یہ صحیح کہ زبان وادب کے فروغ میں ماحول اور مروجہ افکار وخیالات کا اہم رول ہوا کرتا ہے چونکہ ہندوستان میں اسلام خراسان اور ماوراء النہر کے راستوں سے آیا تھا۔ اور ان دونوں علاقوں میں فلسفہ اور منطق کے اثرات غالب تھے اس لیے ہندوستان کی سرزمین نے

نے عربی زبان کو تاخیر سے قبول کیا۔ ہاں ترکوں کے حملوں کے بعد حالات قدرے سازگار ہوگئے اور اس طرح عربی زبان کو پھلنے پھولنے اور اثر و رسوخ کا موقع ملا۔

ہندوستان میں قدرے تاخیر سے ہی صحیح عربی نثر اور نظم دونوں پہلوؤں پر توجہات مذکور کی گئیں۔ ہند میں عربی زبان کی تاریخ میں بلاشبہ کچھ ایسے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے الگ الگ نثر اور نظم کو تحقیق کا میدان بنایا لیکن ایسے لوگوں کی فہرست طویل ہے جنھوں نے بیک وقت دونوں پہلوؤں پر توجہ دی اور دیار غیر میں کمال فن کا مظاہرہ کرکے ہندوستان کی زمین شور کو زرخیز بنادیا۔

شیخ سعد بن سعد سلیمان لاہوری متوفی ۵۱۵ھ تذکرہ نویسوں کے مطابق وہ اول شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان میں باضابطہ شاعری کا بیج بویا۔(۱) آپ کی شاعری میں ابن زیدون، ابن ہانی اور ابن خفاجہ جیسے اندلسی شعراء کی جاذبیت و دلکشی ملتی ہے اور ابن عبدربہ اور لسان الدین الخطیب کے طرز کی متانت اور امراء القیس اور عمرو بن کلثوم کی سی جرأت و بہادری۔ سعد کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔(۲)

ثِق بالحسام فانہ میمون وارکب وقل للنصر کن فیکون

ترجمہ:۔ تلوار پر اعتماد کرو بے شک یہی صاحب سعادت ہے اور سوار ہوجاؤ پھر فتح و نصرت سے کہو کہ تو ہوجا تو وہ ہو جائے گی۔

سعد لاہوری کو یقیناً اس کا امتیاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے یہاں شاعری کو متعارف کرایا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سلسلے میں اولیت کا شرف حاصل کرنے کے باوجود انہوں نے عربی شاعری کی کوئی قابل ذکر تحریک پیدا کردی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سعد کے بعد تقریباً پونے تین سو سال تک اس پر جمود طاری دیکھتا ہے۔ قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین دہلوی المتوفی ۷۹۱ھ نے

صدیوں کے اس سکوت کو توڑا اور پھر عربی شاعری کے تن مردہ میں نئی جان ڈال دی۔ آپ کی شاعری میں آخرت کی یاددہانی۔ جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں سے تنذیر۔ دنیا کی بے بضاعتی اور قناعت جیسے موضوعات قابل ذکر ہیں۔ عربی زبان وادب پر آپ کو قدرت حاصل تھی جس کا واضح ثبوت وہ لامیہ قصیدہ ہے جو لامیۃ العرب طغرائی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس قصیدہ میں جہاں مذکورہ بالا موضوعات نمایاں ہوتے ہیں وہیں قدیم قصیدہ نگاروں کے اسلوب کی تقلید بھی نظر آتی ہے۔ قصیدے کا پہلا شعر قدیم شعراء کے اسلوب کا واضح ترجمان ہے۔ چند اشعار دیکھے جائیں ؎

یا سائق الظعن فی الأسحار والأصل — سلم علی دار سلمیٰ وابک ثم سل

یا طالب الجاہ فی الدنیا یکون غدًا — علی شفا حفرۃ النیران والشعل

یا طالب العز فی العقبیٰ بلا عمل — ہل تنفعنک فیہا کثرۃ الأمل

یا من تطاول فی النیسان معتمدًا — علی القصور وخفض العیش والطول

أأنت فی غفلۃ والموت فی أثر — یعدو وفی یدہ مستحکم الطول

إقنع من العیش بالادنیٰ وکن ملکًا — ان القناعۃ کنز عنک لم یزل (۳)

ترجمہ:۔ اے صبح وشام اونٹنی کے ہانکنے والے سلمیٰ کی قبر پر جاکر میرا سلام کہنا۔ اور رونا پھر دکھ پوچھنا۔

اے دنیا کی جاہ وحشمت کے طلبگار کل تو آگ اور شعلوں کے گڑھے کے کنارے ہوگا۔

اے بے عمل آخرت میں سرخروئی کے طالب کیا آخرت کے سلسلے میں محض بہت ساری امیدیں ہی تمہارے لیے سودمند ہوں گی۔

اے محلات وقصور اور عیش وعشرت کے بھروسے عمارتوں کی تعمیر میں،

ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے والے شخص تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو حالانکہ موت اپنے ہاتھوں میں مضبوط رسی لے کر تمہارا تعاقب کر رہی ہے۔

تم زندگی گذارنے کے لیے تھوڑی سی چیز پر قناعت کرکے بادشاہ بن جاؤ یقیناً قناعت تمہارے لیے لازوال دولت ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اگرچہ اصلاح و تجدید کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، لیکن ان کی اصلاحی یا تجدیدی کاوشوں کا سرمایہ جہاں فارسی زبان میں ہے وہیں عربی زبان و ادب میں بھی نمایاں ہے۔ فصاحت و بلاغت ان کے رگ و پے میں سرایت تھی۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ معاصرین کے مقابلے میں انہیں اس معاملے میں تقدم و پیشوائی کا شرف حاصل تھا مولانا عبدالحئی الحسنی نے ہندوستان میں عربی ادب پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

"ومنھم الشیخ الاجل ولی اللہ بن عبدالرحیم الدھلوی الذی اکرمہ اللہ تعالیٰ بالفصاحۃ فی اللغۃ العربیۃ دون کثیر من المولدین وغیرھم۔ اذا سمعت من لفظہ الرقیق المعرب البدیع خیل الیک کانما ھو رجل نشأ ببادیۃ من علیاء ھوازن او کانما ادبتہ امرأۃ من سفلی بنی تمیم۔" (۲۸)

ترجمہ۔ انہیں (فرزندان ادب) میں شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی ہیں جنھیں بہتیرے مولدین اور دوسرے شعراء کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کی نعمت سے نوازا تھا۔ جب تم ان کے آسان و خوشگوار، فصیح اور انوکھے الفاظ سنوگے تو تمہیں ایسے معلوم ہوگا گویا کہ انہوں نے بنو ھوازن کے بالائی حصے کے کسی دیہات میں پرورش پائی ہو یا بنو تمیم کے نشیبی علاقے کی کسی عورت نے انہیں آغوشِ تربیت میں لیا ہو۔

شاہ صاحب دہلوی گو یا نابغہ عالم اسلام میں نثری ادب پر مشتمل فکری اثاثے اور شب و روز کے عملی جہاد سے شہرت حاصل ہے لیکن عربی زبان و ادب میں حجۃ اللہ البالغۃ جیسی اکثر شاہکار زمانہ تصنیف کے مالک ہیں تو دوسری طرف شعر و شاعری بھی وہ وصف ہے جو شاہ ولی اللہ دہلوی کی ادیبانہ شخصیت کے خاکے میں رنگ بھرتا ہے اور اس تجزیے میں صداقت نظر آتی ہے کہ ہندوستانی شعراء میں شاہ صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کو زیر بحث لائے بغیر ہندوستان کی عربی شاعری کا مطالعہ تشنہ رہے گا۔ شاہ صاحب کے دیوان کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں شاہ صاحبؒ کے حب رسول کے ساتھ ہی ساتھ ان کا شاعرانہ ذوق ناطق نظر آتا ہے ؎

تطلبت هل من ناصر أو مساعد	الوذ به من سوء خوف العواقب
فلست أرى الا الحبيب محمدا	رسول اله الخلق جم المناقب
ومعتصم المكروب في كل غمرة	ومنتجع الغفران من كل هائب
ملاذ عباد الله ملجأ خوفهم	اذا جاء يوم فيه شيب الذوائب (۵)

ترجمہ: میں نے ڈھونڈا کہ کیا کوئی ایسا ناصر و مددگار ہے جس کی میں نتائج کے خوف کی برائی سے پناہ حاصل کروں۔

پس میں نے محمدؐ کے علاوہ کسی کو اپنا دوست نہیں پایا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام مخلوقات کے معبود کے پیغمبر ہیں اور جو تمام طرح کی خصوصیات و فضائل کا مجموعہ ہیں۔

وہ ہر مصیبت میں دکھیاروں کی جائے پناہ ہیں اور خوف زدہ کے لئے عفو و درگذر کا سرچشمہ قیامت کی وحشتناکیوں اللہ کے بندوں کی پناہ گاہ اور اور ان کے خوف و ہراس کے عالم میں جائے حفظ و امان ہوں گے۔

غلام علی آزاد بلگرامی ہندوستانی شعراء کے صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا علماء اور ادباء کے ادبی کارناموں کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاتا کہ عربی، سنسکرت اور فارسی تینوں زبانوں میں مہارت تامہ رکھنے کی بناء پر غلام علی آزاد بلگرامی کی ادبی خدمات کہیں زیادہ ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کے بقول [۶] بلگرامیؒ ایک فقیہ، محدث اور نمایاں ادیب تھے۔ السبعۃ السیارۃ وغیرہ میں ان کے تمام اشعار کی تعداد گیارہ ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ ہندوستان کے حسان ہیں۔ انہوں نے شاعری کی زبان کو مدحت رسول کا لبادہ پہنایا اور اس میں ایسے نادر معانی پیدا کیے جو کسی بھی ممتاز شاعر کے حصے میں نہیں آئے۔ غزل گوئی میں ان کا خاص اسلوب ہے جس تک دوسرے اصحاب فن کی رسائی بمشکل ہی ہوتی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ آزاد بلگرامی اور باقر آگاہ کی عربی تحریریں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغۃ کے معیار سے پست ہیں۔ اس لیے عربی ادب میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔ (۷) یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ حجۃ اللہ البالغۃ شاہ صاحب محدث دہلوی کی ایک موقر تصنیف ہے جس کے اندر شرعی امور و مسائل پر شرح و بسط سے گفتگو کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ادب کا جوہر بھی نمایاں ہے لیکن اس سے دوسری شخصیات کی خدمات اور کارناموں کی کم مایگی اور بے وقعتی پر استشہاد بجا نہیں معلوم ہوتا۔ جہاں تک آزاد بلگرامی کی بات ہے سبحۃ المرجان، مظہر البرکات، ضوء الدراری شرح صحیح البخاری، شفاء العلیل اور الدواوین السبعۃ وغیرہ میں آپ کی ادیبانہ شخصیت کے مختلف جلوے نظر آتے ہیں۔ اور تمام ادبی کارناموں سے قطع نظر اگر گیارہ ہزار اشعار پر مشتمل السبعۃ السیارۃ کے مختلف موضوعات و مشمولات کو

غیر جانبدارانہ دیکھا جائے تو اس اعتراف حقیقت سے گریز کی نوبت نہیں آتی کہ ہندوستان میں عربی شاعری کی تاریخ بلگرامی کے ذکر کے بغیر تشنۂ تکمیل رہے گی۔

آزاد بلگرامی کی شاعری میں مدحت رسول کا ہی وہ درخشاں پہلو ہے جس کی بناء پر علمائے مکہ معظمہ نے آپ کو حسان الہند کا خطاب دیا۔(۸) بلگرامی کے گنجینۂ اشعار سے مدحیہ قصیدہ کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

من ای ناحیۃ مجیئک یا صبا ان جئت من وادی العقیق فمرحبا

انا یا نسیم علیٰ نوالک شاکرٌ شرفتنی متفضّلا مجتبیاً

ھو افضل الرسل الکرام جمیعھم واجلھم قدراً وارفع منصباً

ھو صاحب التبلیغ اوتی حکمۃً اتی اولی الالباب دینا اصوبا (۹)

ترجمہ:۔ اے باد صبا تو کس سمت سے آئی ہے۔ اگر تیری آمد وادی عقیق کی جانب سے ہے تو خوش آمدید۔

اے نسیم صبا! تیری نوازش پر میں مشکور ہوں۔ تو نے مہربانی کر کے اور مجھ پر اپنی نظر انتخاب ڈال کر مجھے شرف یاب کیا ہے۔

آپ کو تمام ہی معزز رسولوں میں افضلیت کا مقام حاصل ہے اور قدر و منزلت اور جاہ و منصب کے اعتبار سے سب میں نمایاں اور برتر ہیں۔

آپ دعوت و تبلیغ کے ایسے علمبردار ہیں جسے حکمت کی دولت سے نوازا گیا ہو۔ آپ نے عقل و سمجھ والوں کو دین برحق کا عطیہ دیا۔

آزاد شاعری میں غزل گوئی کو بھی بعض خصوصیات کی بناء پر کم از کم ہندوستانی شعراء میں تقدم کا شرف حاصل ہے۔ عشق و عاشقی کے نشیب و فراز اور ہجر و وصال کے احوال و کوائف کی جو تصویر کشی آزاد کی شاعری میں ملتی ہے

وہ آزاد کی شاعری کا بین نشان امتیاز ہے۔(۱) عاشق و معشوق کے مابین ہجر و
وصال کی سنگینی ولذت آزاد کے ان شعروں میں نمایاں ہے سے

عشأن المحب عجیبٌ فی صبابتہ الہجر یقتلہ والوصل یحییہ
لولاہ ماشاقہ عرف الصبا سحراً ولم یکن بارق الظلماء یشجیہ

ترجمہ :۔ عاشق کا حال حالت عشق میں عجیب ہوتا ہے۔ فراق اسے
مار ڈالتا ہے اور وصال اسے زندہ رکھتا ہے۔

اگر ایسا نہ ہو تو صبح کے وقت باد صبا کی خوشبو اس پر شاق نہ گذرے
اور نہ تاریکیوں کی کرن غمزدہ د محزون بنائے۔

شیخ سعد بن مسعود لاہوری، قاضی عبد المقتدر دہلوی، شاہ ولی اللہؒ محدث
دہلوی اور غلام علی آزاد بلگرامی کے علاوہ شیخ عبد الرحیم، عبد الجلیل بلگرامی، انور
شاہ کشمیری، شیخ باقر، فضل حق خیرآبادی، اور عباس چریا کوٹی وغیرہم ہند کے
عربی ادب کی وہ ممتاز ترین ہستیاں ہیں جنھوں نے منثور ادب کے علاوہ
منظوم ادب کو اپنی فکری اور فنی کاوشوں کا نذرانہ پیش کر کے ہندوستان کی
عربی شاعری کو مالا مال کر دیا ہے۔

مراجع و حواشی

---

(۱) عماد الحسن آزاد فاروقی (مرتب)۔ ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات۔
ص ۱۴۲۔ دسمبر ۱۹۸۶ء۔ دہلی، اگرچہ بعض نے ہارون بن موسیٰ ملتانی کو عربی کا
پہلا ہندوستانی شاعر قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو معارف۔ جولائی ۱۹۶۸ء ص۔ ۷۰
(۲) عبد الحیٔ الحسنی ۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۴۴ ۱۹۸۵ء۔ دمشق۔
(۳) ایضاً ایضاً ایضاً ۴۴۔

(۴)	ایضاً	ایضاً	ایضاً ۲۴
(۵)	ایضاً	ایضاً	ایضاً ۴۶

(۶) نظوۃ السکران بحوالہ ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات۔ عماد الحسن آزاد فاروقی (مرتب) ص ۱۴۱

(۷) محمد مرتضیٰ ۔ مولوی محمد باقر آگاہ ص ۸ ۔ حیدرآباد دکن ۔

(۸) مقدمۂ دیوان عربی "السبع السیارۃ" ص ۳ ۔ طبع لکھنؤ۔

(۹) مختار دیوان آزاد۔ ص ۸۷ ۔ لکھنؤ۔

(۱۰) عماد الحسن آزاد فاروقی (مرتب) ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات ص۔

شہید ملت میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق رح

حیات، خدمات اور کارنامے

ایک سرسری جائزہ

از۔ محمد سعید الرحمن شمس، مدیر نصرۃ الاسلام، کشمیر

(۳)

شہید ملت رح کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد و سوز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ رات دن امت مسلمہ کی صلاح و فلاح کے لیے سوچتے رہتے، وہ مجموعی طور سے ملت کے اندر خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کے اوصاف دیکھنے کے زبردست خواہاں تھے۔ شہید ملت رح کے اندر فطری قیادت کی بے پناہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ جرائت و بے باکی اور تنظیمی لیاقت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مسائل حاضرہ پر ان کی نظر بڑی گہری، عمیق اور دور رس تھی، دور حاضر میں اسلامی تعلیمات اور دینی اقدار کے فروغ کے ساتھ ساتھ اسلام کی سربلندی اور امت مسلمہ کے موجودہ تمام تر مسائل کے منصفانہ حل کے لیے پوری زندگی خلوص اور دیانت کے ساتھ سرفروشانہ جد و جہد کرتے رہے۔ شہید ملت رح اپنے وقت کے عبقری (Genius) انسان تھے، جن کے اندر دین اسلام کے احیاء و تجدید کی وہ روح کارفرما تھی جو

کسی خاص خطہ تک محدود رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ دینِ اسلام کے آفاقی نظریات کے پرجوش داعی اور مبلغ تھے۔ ان میں اپنے اکابر و اسلاف کا وہ جوہر سمٹ آیا تھا جو رشد و ہدایت اور دعوت و جہاد کا مرکب تھا۔ وہ زندگی کے آخری لمحہ تک سرحدِ اسلام کے محافظ اور نگراں کا رول ادا کرتے رہے۔ تلوار کا کام تحریر و تقریر سے لیا۔ اور خونِ جگر کی سیاہی، جرأت و بے باکی، بے جگری اور دل سوزی سے اس راہ میں صرف کر کے لوگوں کو پیغامِ عمل دیتے رہے۔ ؎

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

دینِ اسلام کا یہ عظیم اور قابل فخر فرزند، بے باک مجاہد اور مخلص ترجمان ۲۵ ذی قعدہ سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۲۱ مئی سنہ ۱۹۹۰ء بروز پیر دن کے گیارہ بجے حق و انصاف کے حصول، ملی تشخص کے تحفظ اور آزادئ وطن کی خاطر بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں شہادت کا جام نوش کر کے ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گئے۔

" وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ " (القرآن)

(اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کی نسبت (یوں بھی) مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم ان حواس سے اس حیات کا ادراک نہیں کر سکتے۔)

ہمہ گیر نقوش و اثرات

بلا شبہ شہیدِ ملت نے ہمارے لیے تحریک حریت کشمیر کے لیے جو پیغامِ عمل

چھوڑے ہیں جو انمٹ نقوش اور ہمہ گیر اثرات چھوڑے ہیں وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے، وہ نقوش یادوں کے پردے اور خیالات کے دریچے پر اس طرح دبتے اور ابھرتے رہیں گے جس طرح آسمان پر ستاروں کی تنک تابی۔ مگر اس انسانی فطرت وشعور کو کیا کیا جائے کہ شہید ملتؒ بظاہر ہم میں نہیں ہیں تو ہر مجلس و محفل سونی اور اداس اور ماحول بھاری بھاری اور سوگوار معلوم ہوتا ہے۔

شہید ملتؒ ظاہری نگاہوں سے ہم سے دور ہوگئے لیکن اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ شہید ملتؒ سالارِ کارواں ہیں میر محفل ہیں اور ؎

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں
یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

(ختم شد)

بقیہ "تبصرہ" | تدریس کا تجربہ، ماہر تعلیم اور مختلف عالمی زبانوں کے ماہر ہیں۔ اسی لئے ڈاکٹر عبداللہ عباس جو کچھ لکھتے ہیں پوری بصیرت اور وسیع وطویل مطالعہ کے بعد "تفہیم المنطق" ہمارے دعوی کی بیّن دلیل ہے جو سمندر کو کوزہ میں بند کرنے کی مصداق ہے۔ تین سو صفحے کی مبسوط کتاب چھ ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب کے ذیل میں متعدد فصول میں اور ذیلی عنوانات۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس اسلامیہ کے ذمہ دار حضرات طلباء اور اساتذہ اس مفید اور اعلیٰ تحفہ کی قدر و قیمت اور معنوی افادیت کے پیش نظر فی الفور نصاب تعلیم میں شامل کریں تاکہ منطق وفلسفہ جیسے فنون کے بارے میں جو ایک پر ہیبت تصوّر نوخیز طلبا کے ذہن نشین کرایا گیا ہے وہ دور ہوسکے اور باذوق طلباء اپنی صلاحیتیں بڑھا سکیں۔

م۔ س۔ شمس۔ مدیر نصرۃ الاسلام، کشمیر

تبصرہ

نام کتاب ۔ "تفہیم المنطق"
تالیف ۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس الندوی معتمد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔
صفحات ۔ تین سو۔
قیمت مجلد ۔ 45/- کتابت وطباعت آفسیٹ اور معیاری۔
شائع کردہ ۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ (الہند)

"تفہیم المنطق" کا تعارف کراتے ہوئے خود فاضل مصنف لکھتے ہیں :-

"یونانی منطق وفلسفہ ہمارے قدیم درس نظامی کا اہم ترین فن ہے اس کی درسی کتابوں کے مضامین کو آسان زبان اور روزمرہ کی مثالوں سے واضح کرنے کے بعد ابتدائی مثالیں بھی دے دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر سے اس کا رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ طلبائے مدارس اس کے مطالعہ کے بعد اس کی بڑی کتابیں سمجھ سکتے ہیں۔ اردو خواں حضرات اپنی معلومات عامہ بڑھانے کے لیے اور اس فن کے منہج اور اصول سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید پائیں گے۔"

"تفہیم المنطق" میں یونانی منطق کو آسان زبان اور دل نشین اسلوب میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس فن کی کتابیں جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان کے اکثر مسائل اس میں آگئے ہیں۔ مزید وہ بحثیں بھی ہیں جن کا تعلق

اصول اور علم کلام سے ہے۔ طلبۂ مدارس کے علاوہ وہ لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس فن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ "ابتدائیات" کے عنوان سے فاضل مولف نے جامع اور دل نشین انداز میں موضوع کا اجمالی تعارف، تالیف کا مقصد، طریق ترتیب اور بنیادی باتوں اور اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے قیمتی در مبسوط پیش لفظ میں حکیمانہ اور عالمانہ انداز میں مسلمانوں کا منطق و فلسفہ سے واسطہ، ان کی خدمات اور مسلمانوں میں اس فن کے عروج پر سیر حاصل تبصرہ کر کے کتاب کی معنوی قدر و قیمت میں بیش بہا اضافہ کر دیا ہے۔

"تفہیم المنطق" اپنے موضوع اور مواد کی ترتیب کے اعتبار سے ایک منفرد، عام فہم، سلیس اور سلجھی ہوئی کتاب ہے۔ منطق جیسے مشکل اور اُدق فن کو روزمرہ اور عام مثالوں سے واضح کر کے فاضل مصنف نے منطق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑی مشکل حل کر دی ہے۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی الندوی مدظلہ کے بقول اور یہ واقعہ ہے کہ "ہر فن کی پہلی کتاب اپنی مادری زبان میں ہی پڑھانا چاہیئے"۔ اس اہم نکتہ کو پیش نظر رکھ کر مؤلف گرامی نے "تفہیم المنطق" کو اردو زبان میں مرتب کر کے منطق کی بنیادی اصطلاحات، انواع اور اقسام کو مبتدی طالب علموں کے ذہن نشین کرانے کے لیے طلبہ کی نفسیات اور فکر و ذہن کے معیار کو سامنے رکھ کر اس طرح دلچسپ انداز میں مرتب کیا ہے کہ اگر طالب علم تھوڑی سی توجہ اور انہماک سے اس کتاب کا مطالعہ کرے تو بہت جلد اور آسانی سے اس فن سے مناسبت پیدا ہو سکتی ہے۔

فاضل مؤلف جو خود متعدد قیمتی اور علمی کتابوں کے نامور مصنف، کامیاب مترجم، صاحب فکر، صاحب نسبت اور صاحب علم بزرگ ہیں۔ طویل درس و

باقی صفحہ ۲۵ پر

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت	اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی ع۶
۲۔ وقفۂ اشاعت	ماہانہ
۳۔ طابع کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
۴۔ ناشر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
سکونت	۴۱۳۶، اُردو، بازار، دہلی ع۶
۵۔ ایڈیٹر کا نام	عمید الرحمٰن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
سکونت	۴۱۱۵، اُردو بازار دہلی ع۶
۶۔ ملکیت	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ع۶

میں عمید الرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع و ناشر
عمید الرحمٰن عثمانی

برہان

شمارہ ۴	اپریل ۱۹۹۱ء ۔ مطابق رمضان المبارک شوال ۱۴۱۱ھ	جلد ۱۰۷

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر، ایڈیٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

دنیا کے ہر ملک میں اقلیتیں آباد ہیں۔ اقلیتوں کی کئی قسمیں ہیں، اقلیتیں مذہبی بھی ہیں اور لسانی بھی، سماجی بھی ہیں اور رنگ و نسل کی بھی ہیں، اونچی ذات کی بھی ہیں اور کمتر ذات کی بھی ۔۔۔ جس ملک میں جیسا ماحول ہے اسی ماحول کی مناسبت سے اقلیتوں کے ساتھ وہاں سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ بعض ملکوں میں اقلیتوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک کیا جاتا ہے تو اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی جاتی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں انسانی مساوات اور انسانی حقوق کی برابری کی تقسیم کے لئے جس قدر شور مچایا جاتا ہے اسی قدر اقلیتوں کے مسائل بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ کچھ ممالک میں تو اقلیتوں کے ساتھ اکثریتی طبقہ کے لوگ غیر انسانی سلوک کرنے میں حد سے زیادہ تجاوز کر جاتے ہیں اور اس پر انھیں کوئی عار نہیں محسوس ہوتا ہے۔ امریکہ جیسے مہذب و امیر ملک میں بھی اقلیتوں کی بے چینی کی خبریں اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں، تو پھر انسانی حقوق کی دُہائی دینے والے کس کس کا رونا روئیں، اور کہاں جا کر فریاد و اپیل کریں جو یہ سب ناانصافی کو مٹائے اور اقلیتوں کے ساتھ ہر ملک میں مساوات کا سلسلہ جاری کرائے۔

برطانیہ وہ ملک ہے جس نے سب سے پہلے انسانی مساوات کے لئے دورِ حاضر میں آواز بلند کی اور سب انسانوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرنے پر زور

دیا۔ لیکن ہم دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ سب سے زیادہ برطانیہ ہی میں یہ ناانصافی روا ہے۔ گورے لوگ کس طرح غیر گوروں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ ابھی حال ہی میں خلیجی جنگ کے زمانے میں برطانیہ میں رہنے والے عرب باشندوں کی حفاظت کے لئے اگر برطانوی حکومت فوری حرکت میں نہ آتی تو نہ معلوم اُن بے چاروں پر کیا کچھ مصیبت کے پہاڑ لوٹ پڑتے۔

ہندوستان میں تو اقلیتوں کا مسئلہ ایک عجیب و غریب مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہاں اقلیتوں ہی کے درمیان فرق ہے۔ یہاں اقلیتیں دو زمروں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک اقلیت وہ ہے جو ہندوستان کی اکثریت کے مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس لئے وہ صوبہ پنجاب اور جموں وکشمیر میں اگر دکھی و پریشان ہے تو یہ دنیا میں سب سے بڑے ظلم کی مثال ہے اور اس کے تدارک کے لئے ہندوستان کی اکثریت کے لوگ ہر تدبیر اپنانے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنا پسند کرتے کیونکہ ہندوستان کے اکثریتی طبقہ کی نظر میں وہ "اشرف المخلوقات" ہے۔ ان ان پر ذرا بھی آنچ آجائے تو ہندوستان کی ایکتا داکھنڈتا اور بقاء کو زبردست خطرہ لاحق ہو جانے کا شور مچا دیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے دیگر صوبوں کی اقلیتوں پر اگر بھاگلپور، جمشید پور، بھوپال و ساگر، راوڑکیلا و مرادآباد، ملیانہ، و میرٹھ میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات میں ننگ انسانیت مظالم ڈھائے جاتے ہیں تو ان پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا ہے کسی بھی انصاف پسند کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ہے۔ جب کہ اقلیتوں کے معصوم بچوں، عورتوں، بوڑھوں، جوانوں کو ان کے گھروں تک سے گھسیٹ کر باہر نکالتے ہوئے پولیس کی موجودگی میں فرقہ پرست غنڈہ عناصر عصمت ریزی کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، لوٹتے پیٹتے ہیں، بعض جگہوں پر پولیس خود ہی فرقہ پرست و غنڈہ عناصر کا رول ادا کرتی ہے۔ اس ظلم وستم درندگی، وحشیانہ پاگل پن کو نہ پارلیمنٹ

کی نظر دیکھپائی ہے اور نہ ہی سی آئی ڈی اور نہ ہی انصاف و سچائی کا رات دن راگ الاپنے والے لیڈران ملک ہی دیکھ پاتے ہیں اور اگر کسی نے لاکھ کوشش کے بعد ان کو دیکھا بھی دیا تو اسے "ردِ عمل" کا نام دے کر درگذر کردیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ اس قدر بہیمانہ سلوک اس ملک میں دن کے اُجالے میں بڑی ڈھٹائی سے ساتھ کیا جاتا ہے گوتم بدھ اور مہاتما گاندھی کے اہنسا کا جہاں رات دن جاپ ہوتا ہو اور جہاں جیو اور جینے دو کے فلسفہ کی تمام دنیا والوں کے سامنے تشہیر کی جاتی ہو وہاں اس قسم کی اندھیر گردی سمجھ سے باہر ہے۔ اور یہ بھی، ہندوستان ہی کا خاصہ ہے کہ جب یہاں انتخابات کا وقت قریب آتا ہے تو اقلیتوں سے اگر ایک طرف [illegible] ڈرائے [illegible] [illegible] ہوجاتا ہے بلکہ یہ بات تو انتخاب کے ختم ہوتے ہی آئندہ دوسرے انتخابات کی تیاری کے لئے فوراً ہی شروع ہوجاتی ہے اگر ایک جماعت انتخاب میں بازی مار کر حکومت کی کرسی پر قابض ہوجانا چاہتی ہے تو وہ ایک سانس میں تو اقلیتوں کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر خود بولے گی لیکن دوسرے سانس میں وہ اپنی ہی حریف پارٹی کو آنکھ مار دے گی کہ جاؤ تم اقلیتوں کو ڈراؤ، دھمکاؤ، ستاؤ اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرو، قانون کی پرواہ کیے بغیر، اقتدار پر قبضہ جمانے یا جمائے رکھنے کے لئے تختۂ مشق بنایا جاتا ہے اقلیتوں کو، یہ ہے ہندوستان کی ایک بڑی اقلیت کی حیثیت و وقعت۔ یعنی ہندوستان کی ایک بڑی اقلیت صرف اقتدار پرستوں کا کھیل ہیں اس کے علاوہ ان کی اور کوئی بساط ہی نہیں ہے جتنی پارٹیاں ہیں وہ سب کوئی سیل ہے تو کوئی بیٹ اور اقلیتیں معاملہ میں دال بھاجی یا چٹنی، اس سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں ہے یہاں کی اقلیتوں کی ــــ یہ ہندوستان کے لئے تو ہے ہی شرم کی بات، انصاف و انسانیت کے نام لیواؤں کے لئے بھی یہ غیرت کی بات ہی ہے۔

اس سلسلے میں ہندی روزنامہ "نوبھارت ٹائمس" کے ۱۳ ر اپریل ۱۹۹۱ء کے اداریہ کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کریں:

"کسی ملک کے اکثریتی سماج میں رواداری اور سیاسی خود اعتمادی کتنی ہے اسے

ناپنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہاں اقلیتوں کی سماجک اور سیاسی حالت کیا ہے۔ اس پیمانہ پر دیکھیں تو بھارت کی عجیب و غریب تصویر ابھرتی ہے۔ ہمارا آئین سب ہی شہریوں کو مساوی حقوق دیتا ہے اور اس میں مذہب، ذات اور نسل کا بھید نہیں کرتا بلکہ اقلیتوں کو تعلیمی و سماجک مواقع کی خاص گارنٹی بھی دیتا ہے پر ان کے ساتھ سلوک کی حالت یہ ہے کہ اقلیتیں خود کو لگاتار غیر محفوظ محسوس کرتی ہیں۔

اکثریتی طبقہ کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی بھارتیہ جنتا پارٹی کے پاس مسلمانوں کو مطمئن کرنے کا کوئی خانہ ہی نہیں ہے۔ پر اکثریت کے ووٹ اکثر پانے والی کانگریس یا جنتا دل کے بارے میں بھی اگر ان کے دل میں پس و پیش ہے تو وجہ یہ ہی ہے کہ یہ دل بھی عین انتخاب کے موقع پر ہی مسلمانوں کو جھانسہ دینے جاتے ہیں اور آگے پیچھے ان کی فلاح و بہبود کے لئے لمبے چوڑے اعلانات کی حد سے آگے کچھ نہیں ہے یعنی اقلیتوں کے پاس جھیلنے کے لئے ایک طرف آتنک (دہشت و خوف) ہے تو دوسری طرف انتخابی وعدوں کی چار دہائیاں۔ ہماری اکثریت کی سوچ پر اس سے دردناک تبصرہ اور کیا ہو سکتا ہے"۔

مقامِ شکر ہے کہ اب ہندوستان کے اکثریتی طبقہ کے بعض لوگوں میں ہندوستان کی بڑی اقلیت کے بارے میں غور و خوض اور توجہ کرنے کی تحریک تو شروع ہوئی ہے یہی غنیمت ہے اور مظلوم اقلیت اسی پر ہی اطمینان کا سانس لینے پر مجبور ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہندوستان میں ہر انتخاب خیر و عافیت سے ہوتے رہیں انسانی جان و مال کی قتل و غارت گری سے ہم دور رہیں، یہ ہر ہندوستانی کے دل کی آواز ہے۔ مرنے والا چاہے مسلمان ہو، ہندو ہو یا سکھ ہو اور یا عیسائی یا کسی دیگر مذہب کا، انسانی جان قیمتی ہے اور انسانی جان کی حفاظت دنیا کے ہر آئین و مذہب نے دی ہے، اکثریت کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے اور اپنی ہٹ دھرمی سے جتنا جلد ہو سکے کنارہ کشی اختیار کرے اسی میں ملک کا اتحاد اور سالمیت محفوظ ہے۔

کی نظر دیکھ پاتی ہے اور نہ ہی سی آئی ڈی اور نہ ہی انصاف وسچائی کا رات دن راگ الاپنے والے لیڈران ملک ہی دیکھ پاتے ہیں اور اگر کسی نے لاکھ کوشش کے بعد ان کو دیکھا بھی دیا تو اسے "ردعمل" کا نام دے کر درگذر کردیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ اس قدر بہیمانہ سلوک اس ملک میں دن کے اُجالے میں بڑی ڈھٹائی سے ساتھ کیا جاتا ہے گوتم بدھ اور مہاتما گاندھی کے اہنسا کا جہاں رات دن جاپ ہوتا ہو اور جہاں جیو اور جینے دو کے فلسفہ کی تمام دنیا والوں کے سامنے تشہیر کی جاتی ہو وہاں اس قسم کی اندھیر گردی سمجھ سے باہر ہے۔ اور یہ بھی ہندوستان ہی کا خاصہ ہے کہ جب یہاں انتخابات کا وقت قریب آتا ہے تو اقلیتوں پر اگر ایک طرف سے نوازش وکرم ہوتی ہے تو دوسری طرف سے ان کو ستانے' ڈرانے' دھمکانے کا دور شروع ہوجاتا ہے بلکہ یہ بات تو انتخاب کے ختم ہوتے ہی آئندہ دوسرے انتخابات کی تیاری کے لئے فوراً ہی شروع ہوجاتی ہے اگر ایک جماعت انتخاب میں بازی مارکر حکومت کی کرسی پر قابض ہوجانا چاہتی ہے تو ایک سانس میں تو اقلیتوں کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر خود بولے گی لیکن دوسرے سانس میں وہ اپنی ہی حریف پارٹی کو آنکھ مار دے گی کہ جاؤ تم اقلیتوں کو ڈراؤ' دھمکاؤ' ستاؤ اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرو' قانون کی پرواہ کیے بغیر' اقتدار پر قبضہ جمانے یا جمائے رکھنے کے لئے تختۂ مشق بنایا جاتا ہے اقلیتوں کو' یہ ہے ہندوستان کی ایک بڑی اقلیت کی حیثیت و درگت۔ یعنی ہندوستان کی ایک بڑی اقلیت صرف اقتدار پرستوں کا کھیل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اور کوئی بساط ہی نہیں ہے جتنی پارٹیاں ہیں وہ سب کوئی سل ہے تو کوئی بٹہ" اور اقلیتیں مصالحہ ہیں' دال بھاجی یا چٹنی' اس سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں ہے یہاں کی اقلیتوں کی ـــــ یہ ہندوستان کے لئے تو ہے ہی شرم کی بات" انصاف و انسانیت کے نام لیواؤں کے لئے بھی یہ غیرت کی بات ہی ہے ـــــ

اس سلسلے میں ہندی روزنامہ "نوبھارت ٹائمس" کے ۱۲؍اپریل ۱۹۹۱ء کے اداریہ کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کریں:

"کسی ملک کے اکثریتی سماج میں رواداری اور سیاسی خود اعتمادی کتنی ہے اسے

ناپنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہاں اقلیتوں کی سماجک اور سیاسی حالت کیا ہے اس پیمانہ پر دیکھیں تو بھارت کی عجیب و غریب تصویر ابھرتی ہے۔ ہمارا آئین سب ہی شہریوں کو مساوی حقوق دیتا ہے اور اس میں مذہب، ذات اور نسل کا بھید نہیں کرتا بلکہ اقلیتوں کو تعلیمی و سماجک مواقع کی خاص گارنٹی بھی دیتا ہے پر ان کے ساتھ سلوک کی حالت یہ ہے کہ اقلیتیں خود کو لگاتار غیر محفوظ محسوس کرتی ہیں۔

اکثریتی طبقہ کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی بھارتیہ جنتا پارٹی کے پاس مسلمانوں کو مطمئن کرنے کا کوئی خانہ ہی نہیں ہے۔ پر اکثریت کے ووٹ اکثر پانے والی کانگریس یا جنتا دل کے بارے میں بھی اگر ان کے دل میں پس و پیش ہے تو وجہ یہی ہے کہ یہ دل بھی عین انتخاب کے موقع پر ہی مسلمانوں کو جھانسہ دیتے جاتے ہیں اور آگے پیچھے ان کی فلاح و بہبود کے لئے لمبے چوڑے اعلانات کی حد سے آگے کچھ نہیں ہے یعنی اقلیتوں کے پاس جھیلنے کے لئے ایک طرف آتنک (دہشت و خوف) ہے تو دوسری طرف انتخابی وعدوں کی چاردہائیاں۔ ہماری اکثریت کی سوچ پر اس سے دردناک تبصرہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

مقامِ شکر ہے کہ اب ہندوستان کے اکثریتی طبقہ کے بعض لوگوں میں ہندوستان کی بڑی اقلیت کے بارے میں غور و خوض اور توجہ کرنے کی تحریک تو شروع ہوئی ہے یہی غنیمت ہے اور مظلوم اقلیت اسی پر ہی اطمینان کا سانس لینے پر مجبور ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہندوستان میں ہر انتخاب خیر و عافیت سے ہوتے رہیں انسانی جان و مال کی قتل و غارت گری سے ہم دور رہیں، یہ ہر ہندوستانی کے دل کی آواز ہے۔ مرنے والا چاہے مسلمان ہو، ہندو ہو یا سکھ ہو اور یا عیسائی یا کسی دیگر مذہب کا، انسانی جان قیمتی ہے اور انسانی جان کی حفاظت دنیا کے ہر آئین و مذہب نے دی ہے، اکثریت کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے اور اپنی ہٹ دھرمی سے جتنا جلد ہو سکے کنارہ کشی اختیار کرے اسی میں ملک کا اتحاد اور سالمیت محفوظ ہے۔

حادثۂ وفات

ماہِ مارچ ۱۹۹۱ء میں ملّتِ اسلامیہ کو اپنے دو عظیم رہنما عالم دین کے حادثۂ وفات سے دوچار ہونا پڑا۔

امیر شریعت بہار حضرت مولینا منت اللہ رحمانی اور میرٹھ شہر کے مشہور عالم دین، اسلامی مصنف حضرت مولینا قاضی زین العابدین تھوڑے سے آگے پیچھے وقفہ میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○

دونوں ہی ملّت اسلامیہ کی عظیم و برگزیدہ ہستیاں تھیں حضرت مولینا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی خدمت کرنے کے لئے اپنے مرحوم عالم دین والد مولینا محمد علی مونگیری سے ورثہ پایا تھا جس طرح مولینا محمد علی مونگیری رحؒ نے مسلمانانِ ہند کی تعلیم و تربیت کے لئے انتھک کوشش کی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کو جن لوگوں نے ایک تصور سے حقیقت بننے میں مدد دی ان میں مولینا محمد علی مونگیری رحؒ کا نام سرِ فہرست ہے مسلمانوں کی خدمت میں وہ جی جان سے لگے رہے جٹے رہے۔ اسی طرح ان کے لائق و ہونہار صاحبزادے اور بعد میں ملّت اسلامیہ ہند کے غازی و مجاہد مولینا منت اللہ رحمانی نے مسلمانانِ ہند کی ہر طرح خدمت و رہنمائی کی۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ میں حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت و رہنمائی میں بڑا اہم کردار نبھایا اور حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحؒ کے انتقال کے بعد انہوں نے ان کے مشن کو ان کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں کے تحت ہی آگے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وہ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی ممبر تھے مسلمانوں کی کئی فلاحی انجمنوں سے بھی ان کا ربط و تعلق تھا۔ بقول معاصر "قومی آواز"

مولینا منت اللہ رحمانی رحؒ کی وفات حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحؒ کے

وفات کے بعد یہ دوسرا بہت بڑا صدمہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پہنچا ہے اور اس کمی کو پورا کرنا آسان نہ ہوگا ۔ ۷۹ رسال کی عمر پائی ۔ میرٹھ کے عالم دین قاضی زین العابدین ایک اچھے اسلامی مصنف بھی تھے ۔ ادارہ ندوۃ المصنفین سے ان کی عظیم و ضخیم کتاب تاریخ ملت تین حصوں میں شائع ہو چکی ہے، پہلا حصہ نبی عربی، دوسرا حصہ خلافت راشدہ اور تیسرا حصہ خلافت بنو امیہ پر تھا جو علمی حلقوں میں مستند و پسندیدہ ہیں۔ قبلہ ابا جان حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رح سے ان کو خصوصی لگاؤ و انس تھا۔ ان کا نام جب بھی لیتے تعظیم و تکریم سے ہی لیتے ۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے ۔ جمعیتہ العلماء ہند سے وابستہ تھے ۔ حضرت مولینا اسعد مدنی صاحب، حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رح کی ہمیشہ ہی عزت و تکریم کرتے تھے ۔ جب جمعیتہ العلماء ہند کے سلسلے میں مولینا اسعد مدنی سے حضرت مفتی صاحب کے بعض معاملات میں اختلافات ہوئے تب بھی یہ دونوں بزرگ ہمیشہ ہی حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمان عثمانی رح کا ادب و لحاظ کرتے تھے اور عزت و تکریم میں ہمیشہ ہی بازی لے جانے کی کوشش کرتے ۔

مولینا قاضی زین العابدین صاحب رح قبلہ ابا جان مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رح کے شیدائی تھے اور میرے بھائی نجیب الرحمان عثمانی کے سسرالی رشتے کے بزرگ بھی تھے ۔ حضرت مفتی شوکت علی فہمی (اللہ تعالیٰ ان عمر دراز اور صحت و تندرستی عطا فرمائے) کے عزیز خاص تھے ۔ ان کے انتقال سے علمی و دینی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی ہے ۔ ابھی حضرت مولینا قاضی سجاد حسین صاحب، حضرت ملا محمد تقی امینی اور مولینا ابو اللیث کا صدمہ ہی ہرا تھا ان کی وفات سے ہمارے آنسو خشک نہ ہوئے تھے کہ برہان کو ان کی وفات کا عظیم صدمہ ہو گیا ۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی حضرت مولینا منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار) اور حضرت مولینا قاضی زین العابدین صاحب رح کے انتقال پُر ملال پر خود اپنے سے، ملت اسلامیہ سے اور تمام لواحقین سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ

جنت نصیب فرمائے۔ آمین !

ہندی روز نامہ "نوبھارت ٹائمس کے چیف ایڈیٹر شری راجندر ماتھر ا۱ اپریل ۱۹۹۱ء کو صرف ۴۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ آنجہانی ماتھر بڑے ہی فراخدل اور غیر متعصب انسان تھے سیکولرزم کے دلدادہ اور مسلمانوں کے حقوق کے لئے ہمیشہ ہی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ رمضان شریف کے عاشق تھے۔ روزہ افطار پارٹیوں میں باوجود بڑی مصروفیتوں کے ضرور جاتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے رمضان شریف کا انتظار رہتا ہے کیسی کو کیا معلوم تھا کہ اس نیک دل انسان کی موت رمضان شریف ہی میں ہوگی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی اخبار نہیں ہے جو ان کے دکھ درد سب کو سنائے مسٹر ماتھر نے نوبھارت ٹائمس کے ذریعہ مسلمانوں کی مشکلات و پریشانیوں کو اہلِ وطن تک پہنچایا۔ ہر محاذ پر مسلمانوں کا دفاع کیا مسلمانوں کو ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی بتایا۔ فرقہ پرست ہندؤوں کو ہمیشہ ہی انھوں نے ڈانٹا۔ واضح ہو کہ ہندی نوبھارت ہندوستان کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار ہے جس کے پڑھنے والے بھی کچھ ایک چھوڑ کر سب کے سب ہندو ہی ہیں۔ ایسے شریف نیک اور غیر مسلم انسان و مسلم دوست کی وفات سے یقیناً مسلمانانِ ہند کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

(علمی و سیاسی خدمات)

احسان اللہ فہد فلاحی، بیت العزیز، جامعہ اردو روڈ، علی گڑھ۔

(۲)

آپ نے تمام ہی احادیث کا بالیک بینی سے مطالعہ کیا اور قرآن و حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم کی شرح لکھی۔ اور اپنے مسلک کی تائید میں بہت ہی ٹھوس دلائل جمع کئے۔ آپ کی اس کتاب کی تین جلدیں شائع ہوئیں۔ جلد اول کے آغاز میں ایک سو آٹھ صفحہ کا مبسوط مقدمہ اصول حدیث پر آپ نے لکھا ہے جو دیگر اصول حدیث کی کتب سے زیادہ جامع ہے۔ اس مقدمہ میں اقسام حدیث، رواۃ کی صفات، تدوین حدیث، اور دیگر متعلقات علم حدیث کے متعلق سیر حاصل تبصرہ ہے۔

فتح الملہم شرح مسلم مولانا نے کب سے لکھنی شروع کی اس کے لئے کوئی خاص سن یا ماہ متعین کرنا مشکل ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۳۶ھ سے پہلے ہی آپ نے اس مبارک کام کو شروع کر دیا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ "مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں انجمن اسلامیہ اعظم گڈھ کی دعوت پر اعظم گڈھ آئے تھے اور شبلی منزل میں میرے پاس ہی ٹھہرے تھے۔ اس وقت ان کے پاس شرح مسلم کے کچھ اجزا مسودات تھے جن میں قرأت فاتحہ خلف الامام وغیرہ اختلافی مسائل پر مباحث تھے جن کو مجھے سنایا گیا" ؎

مولانا ندوی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عثمانی صاحب نے اس کام

کو بہت پہلے ہی شروع کر دیا تھا کیونکہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت کا مسئلہ کتاب میں ہے اور کتاب الصلوٰۃ کا تعلق فتح الملہم کی دوسری جلد سے ہے معلوم ہوا کہ مولانا عثمانی نے فتح الملہم شرح مسلم کا کام ۱۹۱۶ء سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ آپ کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے باقاعدہ طور پر کام ۱۹۱۴ء سے شروع کیا ہوگا۔

۳:- شرح بخاری شریف؛ مولانا عثمانی کے علمی سرمایہ اور خزانہ میں بخاری شریف کی شرح کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ شرح علم و عرفان، تدقیق و تحقیق کا سمندر معلوم ہوتا ہے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے انتقال کے بعد مولانا عثمانی جامعہ ڈابھیل میں بخاری کی تعلیم دیتے رہے۔ مولانا عثمانی نے اثنائے درس بخاری میں جو تقاریر درساً درساً فرمائی ہیں یہ شرح انھیں تقریری تحقیقات کا تحریری نقش ہے لیکن والئے افسوس کہ یہ شرح ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔ اس کا مسودہ جس میں بخاری شریف کا متن شامل نہیں ہے تقریباً گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہے مسودہ اردو زبان میں ہے عبارتیں صاف اور گنجلک ہیں۔ معرکۃ الآرا مسائل پر حسب عادت مولانا عثمانی نے نہایت بسط و تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ آٹھ سو صفحات تک مسودہ پر مولانا نے نظر ثانی فرمائی تھی۔ نظر ثانی میں دستِ مبارک سے جا بجا ترمیمیں کی گئی ہیں۔

۴:- اعجاز القرآن آپ کی مدلل تصنیف ہے۔ اس میں قرآن کریم کے اعجاز اور خدا کا کلام ہونے پر فاضلانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں قرآن کے اعجاز کو اتنے مدلل انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک منصف مزاج غیر مسلم ایک سلجھا ہوا مستشرق قرآن کریم کو خدا کا کلام ماننے پر آمادہ ہو جائے گا۔ مولانا کی اس کتاب نے ان لوگوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جنھوں نے قرآن کو اللہ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا تھا مولانا نے دلائل کی بنیاد پر ثابت کر دیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم نہیں کرتا ہے تو اس کی ہٹ دھرمی ہے۔

۵:- العقل والنقل؛ علم کلام پر علامہ عثمانی کی یہ ایک معیاری تصنیف ہے

جس میں اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی تعارض نہیں ہو سکتا اور کبھی عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت میں قصور ہو جانے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جائے تو اس وقت بندۂ مومن کو کیا کرنا چاہیئے اس پر آپ نے مفصل بحث کی ہے مولانا شبیر احمد عثمانی کی یہ کتاب اس قدر ٹھوس اور علمی ہے کہ اس کتاب کو حجۃ اللہ البالغۃ، تکمیل الاذہان وغیرہ کے ساتھ درجۂ تکمیل کے نصاب کے لئے واجبات میں سے قرار دیا گیا۔ مولانا محمود الحسن صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "درجۂ تکمیل جس کے فوائد عرصۂ دراز سے تسلیم کیے ہوئے تھے آج توکلاً علی اللہ اس کی ابتدا ہوئی ہے اور مقدس بزرگوں کی تصانیف اس کے نصاب میں شامل کی گئی ہیں، ان کے سمجھنے والوں سے ہم کو امید ہے کہ وہ اسلام کے اصول و فروع کے متعلق معتدبہ واقفیت پیدا کریں گے، عموماً عقل و نقل کے اہم مسائل میں ان کو ایک خاص بصیرت حاصل ہو گی۔ ۲؎"

مولانا عثمانی کی اس تصنیف سے پہلے عقل و نقل کی مطابقت میں اتنی جامع اور مبسوط مفصل کتاب موجود نہ تھی آپ نے اس کتاب کو لکھ کر اس خلاء کو پُر کیا۔ ان مشہور کتابوں کے علاوہ آپ نے دیگر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ "اسلام" جس میں وجود باری تعالیٰ، توحید، رسالت، ملائکہ کے اثبات پر زبردست محققانہ بحث کی ہے۔ "الشہاب" اس مقالہ میں اصولِ اربعہ فقہ یعنی قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع سے قتل مرتد کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ "معارف القرآن" یہ مولانا عثمانی کے مایہ ناز مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین رسالہ "القاسم" کے پرچوں میں بالاقساط ماہ جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ، رجب، شعبان وغیرہ ۱۳۳۱ھ میں مسلسل چھپتے رہے ہیں۔ "الدار الآخرۃ" آپ نے اس مقالے میں دار آخرت کو فلسفہ کے رنگ میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے یہ مقالہ جمعیۃ الانصار کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ میرٹھ میں موتمر الانصار کے سہ روزہ اجلاس میں پڑھا تھا۔ یہ مقالہ بھی رسالہ "القاسم" میں قسط وار چھپ چکا ہے۔ مدیر "القاسم" اس

مضمون کے تعارف میں لکھتے ہیں "مضمون عزیزی مولوی شبیر احمد صاحب نے اجلاس مؤتمر الانصار میں پڑھا تھا چونکہ یہ ایک مفید اور کارآمد مضمون ہے اور بعض بہی خواہان قوم کا تقاضا بھی ہے اس لئے افادۂ عام میں اس کا شائع کرنا مصلحت معلوم ہوا" ان کے علاوہ آپ نے قرآن مجید میں عقل کا [illegible]، تحقیق خطبۂ جمعہ، تشریح واقعہ دیوبند، سیرۃ النبی، لطائف الحدیث، حجاب شرعی، کسوف الشمس، خوارق عادت، الروح فی القرآن جیسے مضامین پر قلم اٹھایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ جس مضمون پر بھی قلم اٹھایا حق ادا کر دیا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کا تفسیری مقام کافی بلند ہے۔ آپ کی بیش بہا تصانیف میں سب سے شاہکار آپ کی تفسیر ہے آپ نے ضخیم تفسیروں سے مستغنی ہو کر سمندر کو کوزے میں بھرنے کی کوشش ہے۔ زبان بہت ہی سلیس و سادہ، فصیح اور عام فہم ہے۔ آیات قرآنیہ کے مفہوم و مطالب کو سمجھانے سے زیادہ کچھ نہیں لکھا ہے اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ کسی بھی مقام کو لاینحل نہیں چھوڑا ہے۔

عام طور پر مفسروں کے اندر مندرجہ ذیل صفات دیکھی جاتی ہیں: تقویٰ اور نور ایمانی کی صفت اجاگر ہو۔ علوم تفسیر میں مہارت رکھتا ہو۔ علوم تفسیر سے مراد اصول حدیث، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم فقہ، علم الکلام، علم تاریخ، علم جغرافیہ، علم الحقائق، علم الحساب، علم الاسرار ہے۔ ان علوم کے علاوہ علم لغت، علم صرف، علم نحو، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم الرجال، علم سیرت ہے۔ ایک مفسر کو ان تمام علوم میں مہارت اور معلومات کی ضرورت ہے تب کہیں جا کر وہ حقیقت میں مفسر جیسے عظیم رتبہ کا مالک ہو سکتا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کی زندگی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو آپ تقویٰ کی تمام تر کسوٹیوں پر پورے اترتے نظر آتے ہیں۔ آپ قرآن کی آیات رحمت پر امید سے پُر اور آیات عذاب پر خوف سے لبریز معلوم ہوتے ہیں۔ نماز بہت ہی خشوع و خضوع سے پڑھتے ہیں آپ بہت ہی رقیق القلب اور نرم دل تھے۔ اللہ کی عظمت، پیغمبر کی محبت حد سے زیادہ دل میں جاگزیں تھی۔ اس دنیا کو

مولانا اعمال اور آخرت کو دنیا کی کھیتی سمجھتے تھے ہمیشہ امید و رجاء کی کیفیت میں رہتے تھے۔ دن کے مجاہد اور رات کے راہب تھے۔ دن کے اجالے میں بندگانِ خدا کی خدمت کرتے اور رات کی تاریکی میں اللہ کے حضور قیام کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی موتمر مکہ ۱۳۴۴ھ کے سفر کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔ "جدہ سے مکہ معظمہ تک ہم سب ایک لاری میں آئے جب مکہ معظمہ قریب آیا تو مرحوم (مولانا شبیر احمد) پر عجب کیفیت تھی۔ انھوں نے قران کا احرام باندھا اور ہم سب تمتع کے احرام میں تھے۔ جیسے جیسے مکہ معظمہ قریب آتا جاتا تھا ان پر گریہ کا غلبہ ہوتا جاتا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔"[3] اسی مضمون میں مولانا ندوی ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔ "ایک اور دفعہ اسی زمانہ ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں وہ (مولانا شبیر احمد صاحب) اعظم گڑھ آئے۔ ٹھہرے کہیں اور جگہ تھے مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے چائے پیش کی تو پینے سے انکار کر دیا۔ انکار کی وجہ نہ معلوم ہوئی۔ مگر بعد کو خیال آیا تو قیاس ہوا کہ چائے کی پیالیاں جو جاپانی تھیں ان پر جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اس لئے ان میں پینے سے انکار کیا۔ بہرحال اس سے ان کے تقویٰ اور بزرگوں کی صحبت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔"[4]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیوبند لکھتے ہیں۔ "نماز انتہائی خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے خشیۃ اللہ اور شرم و حیا کے پیکر تھے قلب نہایت نازک اور رقیق پایا تھا"[5] خلاصہ کلام یہ کہ مولانا کے اندر تقویٰ کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے مولانا نے تفسیر کے ایک ایک گوشے اور ایک ایک شوشے پر نہایت احتیاط سے قلم اٹھایا ہے اور یہی تقویٰ و طہارت کی علامت ہے۔

ایک مفسر کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ تفسیر سے متعلق جتنے علوم ہیں ان سب پر اس کی اعلیٰ درجے کی مہارت ہو۔ ان سبھی علوم پر نقد و جرح، تائید و ترجیح کی قوت اور رطب و یابس میں تمیز کی پوری پوری صلاحیت

رکھتا [illegible] علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے اندر ان تمام علوم پر اعلیٰ درجے کی مہارت موجود تھی جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے اس کا پورا حق ادا کرتے تھے مسلم کی شرح اور اس کے آغاز میں اصول حدیث کا مقدمہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا علم حدیث اصول حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے تفسیر میں بھی اصول حدیث اور حدیث کا تبحر صاف نمایاں ہے۔ (اَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ)

(ترجمہ) ان کو زمانۂ عدت میں اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہوئے اس آیت کے متعلق علامہ لکھتے ہیں۔ "مرد کے ذمہ ضروری ہے کہ مطلقہ کو عدت تک رہنے کے لئے مکان دے۔ (اس کو سکنیٰ کہتے ہیں) اور جب سکنیٰ واجب ہے تو نفقہ بھی اس کے ذمہ ہونا چاہیئے کیونکہ عورت اتنے دنوں تک اسی کی وجہ سے مکان میں مقید و محبوس رہے گی ...... حنفیہ کے نزدیک یہ حکم سکنیٰ اور نفقہ کا ہر قسم کی مطلقہ کو عام ہے رجعیہ کی قید نہیں.....

رہی فاطمہ بنت قیس کی حدیث جس میں وہ کہتی ہیں کہ میرے زوج نے تین طلاق دے دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سکنیٰ اور نفقہ نہیں دلوایا۔ اول تو اس حدیث میں فاروق اعظمؓ عائشہ صدیقہ اور دوسرے صحابہ و تابعین نے انکار فرمایا ہے بلکہ فاروق اعظمؓ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے سے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے، ہم کو معلوم نہیں کہ وہ عورت بھول گئی یا اس نے یاد رکھا معلوم ہوا کہ فاروق اعظم کتاب اللہ سے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ مطلقہ ثلاث کے لئے نفقہ و سکنیٰ واجب ہے اور اس کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت بھی ان کے پاس موجود تھی۔ چنانچہ طحاوی وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں جن میں حضرت عمرؓ وغیرہ نے تصریحاً بیان کیا ہے کہ یہ مسئلہ میں نے نبیؐ سے سنا اور..

دار قطنی میں جابرؓ کی ایک حدیث بھی اس بارے میں صریح ہے۔ گو کہ اس کے بعض رواۃ اور رفع و وقف میں کلام کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیسؓ کے لئے سکنیٰ اس لئے تجویز نہ کیا ہو کہ وہ اپنی سسرال والوں سے زبان درازی اور سخت کلامی کرتی تھیں جیسا کہ بعض سے روایات میں ہے۔ لہذا آپؐ نے حکم دے دیا کہ ان کے گھر سے چلی جائے۔ پھر جب سکنیٰ نہ رہا تو نفقہ بھی ساقط ہوگیا جیسے ناشزہ کا (جو شوہر کی نافرمانی کر کے گھر سے نکل جائے) نفقہ ساقط ہو جاتا ہے تا وقتیکہ گھر واپس نہ آئے نیز جامع ترمذی وغیرہ کی بعض روایات میں ہے کہ اس کو کھانے پینے کے لئے غلہ دیا گیا تھا اس نے اس مقدار سے زیادہ کا مطالبہ کیا لیکن وہ منظور نہیں ہوا تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زائد نفقہ تجویز نہیں فرمایا جو مرد کی طرف سے دیا جا رہا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب، ہاں یہ یاد رہے کہ نسائی، طبرانی، مسند احمد وغیرہ کی بعض روایات میں فاطمہ بنت قیسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد نقل کیا ہے کہ سکنیٰ اور نفقہ صرف اس مطلقہ کے لئے ہے جس سے رجعت کا امکان ہو۔ ان روایات کی سندیں زیادہ قوی نہیں۔ زیلعی نے تخریج ہدایہ میں اس پر بحث کی ہے۔ ؎

علامہ شبیر احمد عثمانی کی مذکورہ تفسیر محدثانہ نقطۂ نظر سے ان کی عظمت اور مہارت علم حدیث کے لئے ایک روشن مثال ہے علامہ نے اس آیت کی تفسیر میں تین علوم پر روشنی ڈالی ہے۔ فاطمہ بنت قیسؓ کی حدیث پر محققانہ جرح کی ہے۔ حضرت عمرؓ کا اجتہاد، آیات قرآنی پھر حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ و تابعین کے اقوال سے سکنیٰ اور نفقہ کا ثبوت فراہم کیا ہے نیز دارقطنی، جامع ترمذی، طبرانی، مسند احمد، نسائی وغیرہ کی روایات پر محدثانہ کلام کیا ہے۔ یہی ایک محدث کے لئے علم حدیث میں بلند پایہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا نے اصول حدیث کی طرف بھی اشارہ کیا ہے دارقطنی کی حدیث جابرؓ میں بعض رواۃ کے ثقہ ہونے پر جرح کرنا، دارقطنی کے بعض راویوں کا رفع و وقف کا ذکر کرنا، نسائی، طبرانی وغیرہ کی روایت کی سند کی قوی نہ

رکھتا ہے ... شبیر احمد عثمانیؒ کے اندر ان تمام علوم پر اعلیٰ درجے کی مہارت موجود تھی جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے اس کا پورا حق ادا کرتے تھے مسلم کی شرح اور اس کے آغاز میں اصول حدیث کا مقدمہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا علم حدیث اصول حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے تفسیر میں بھی اصول حدیث اور حدیث کا تبحّر صاف نمایاں ہے۔ (اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم)

(ترجمہ) ان کو زمانۂ عدت میں اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو۔ اس آیت کے متعلق علامہ لکھتے ہیں۔ "مرد کے ذمہ ضروری ہے کہ مطلقہ کو عدت تک رہنے کے لئے مکان دے۔ (اس کو سُکنیٰ کہتے ہیں) اور جب سُکنیٰ واجب ہے تو نفقہ بھی اس کے ذمہ ہونا چاہیئے کیونکہ عورت اتنے دنوں تک اسی کی وجہ سے مکان میں مقیّد و محبوس رہے گی ...... حنفیہ کے نزدیک یہ حکم سُکنیٰ اور نفقہ کا ہر قسم کی مطلقہ کو عام ہے رجعیہ کی قید نہیں..... رہی فاطمہ بنت قیس کی حدیث جس میں وہ کہتی ہیں کہ میرے زوج نے تین طلاق دے دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سُکنیٰ اور نفقہ نہیں دلوایا۔ اول تو اس حدیث میں فاروق اعظمؓ عائشہ صدیقہ اور دوسرے صحابہ و تابعین نے انکار فرمایا ہے بلکہ فاروق اعظم نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے سے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے ہم کو معلوم نہیں کہ وہ عورت بھول گئی یا اس نے یاد رکھا معلوم ہوا کہ فاروق اعظم کتاب اللہ سے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ مطلقہ ثلاث کے لئے نفقہ و سُکنیٰ واجب ہے اور اس کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت بھی ان کے پاس موجود تھی۔ چنانچہ طحاوی وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں جن میں حضرت عمرؓ وغیرہ نے تصریحاً بیان کیا ہے کہ یہ مسئلہ میں نے نبیؐ سے سنا اور.. دار قطنی میں جابرؓ کی ایک حدیث بھی اس بارے میں صریح ہے۔ گو کہ اس کے بعض رواۃ اور رفع و وقف میں کلام کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیس رض کے لئے سکنیٰ اس لئے تجویز نہ کیا ہو کہ وہ اپنی سسرال والوں سے زبان درازی اور سخت کلامی کرتی تھیں جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ لہٰذا آپ ؐ نے حکم دے دیا کہ ان کے گھر سے چلی جائے۔ پھر جب سکنیٰ نہ رہا تو نفقہ بھی ساقط ہو گیا جیسے ناشزہ کا (جو شوہر کی نافرمانی کر کے گھر سے نکل جائے) نفقہ ساقط ہو جاتا ہے تاوقتیکہ گھر واپس نہ آئے نیز جامع ترمذی وغیرہ کی بعض روایات میں ہے کہ اس کو کھانے پینے کے لئے غلہ دیا گیا تھا اس نے اس مقدار سے زیادہ کا مطالبہ کیا لیکن وہ منظور نہیں ہوا تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زائد نفقہ تجویز نہیں فرمایا جو مرد کی طرف سے دیا جا رہا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب، ہاں یہ یاد رہے کہ نسائی، طبرانی، مسند احمد وغیرہ کی بعض روایات میں فاطمہ بنت قیس رض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد نقل کیا ہے کہ سکنیٰ اور نفقہ صرف اس مطلقہ کے لئے ہے جس سے رجعت کا امکان ہو۔ ان روایات کی سندیں زیادہ قوی نہیں۔ زیلعی نے تخریج ہدایہ میں اس پر بحث کی ہے۔ شے

علامہ شبیر احمد عثمانی کی مذکورہ تفسیر محدثانہ نقطۂ نظر سے ان کی عظمت اور مہارت علم حدیث کے لئے ایک روشن مثال ہے علامہ نے اس آیت کی تفسیر میں تین علوم پر روشنی ڈالی ہے۔ فاطمہ بنت قیس رض کی حدیث پر محققانہ جرح کی ہے۔ حضرت عمر رض کا اجتہاد، آیات قرآنی پھر حضرت عائشہ رض اور دیگر صحابہ و تابعین کے اقوال سے سکنیٰ اور نفقہ کا ثبوت فراہم کیا ہے نیز دارقطنی، جامع ترمذی، طبرانی، مسند احمد، نسائی وغیرہ کی روایات پر محدثانہ کلام کیا ہے۔ یہی ایک محدث کے لئے علم حدیث میں بلند پایہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا نے اصول حدیث کی طرف بھی اشارہ کیا ہے دارقطنی کی حدیث جابر رض بعض رواۃ کے ثقہ ہونے پر جرح کرنا، دارقطنی کے بعض راویوں کو ... کا ذکر کرنا، نسائی، طبرانی وغیرہ کی روایت کی سندیں قوی نہ

ہونے کی صراحت کرنا، ایک عورت کی حدیث سے قرآن کریم کی آیت کے برعکس حکم لگانا یہ سب کے سب جرح وقدح کی غمازی کررہی ہیں۔ مطلقہ کے نفقہ اور سکنی کے سلسلے میں احناف کا مسلک، ہدایہ میں زیلعی کی تخریج علم تفقہ کی بصیرت پر دلالت کررہی ہیں۔ غرضیکہ علامہ عثمانیؒ تمام ہی علوم پر گہری دسترس رکھتے تھے خواہ وہ اصول فقہ ہو یا علم فقہ، علم تاریخ ہو یا علم جغرافیہ، علم لغت ہو یا علم نحو وصرف، ایک مفسر کے لئے جتنے بھی علوم کی مہارت ضروری ہوسکتی ہے علامہ کے اندر موجود تھی۔

علامہ عثمانی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے ان تمام علوم کا مطالعہ کیا تھا جس کی ضرورت اسلام کی تبلیغ وتشریح میں کسی بھی طرح پڑ سکتی تھی۔ اگر قرآن میں احکام الہٰی کا ذخیرہ موجود ہے تو حدیث تو اسی ذخیرے کی تفسیر وتشریح ہے۔ صحیح حدیث اور اسوۂ حسنہ کے بغیر قرآن حکیم کا سمجھنا دشوار ہی نہیں بلکہ صاف ستھری طبیعت کے نزدیک مستحیل ہے۔ اسی وجہ سے امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذی، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ وغیرھم نے ہر طرح کی مصیبتوں کو برداشت کرکے احادیث صحیحہ کی تلاش وجستجو کی ہے اور اسی کام کو علامہ عثمانیؒ نے بھی آگے بڑھاتے، مزید غور وفکر کرنے اور موجودہ دور کے لحاظ سے اس کی تفسیر وتشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا عثمانی کا شمار مولانا گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا محمد یعقوبؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اسیر مالٹا، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، جیسے بلند پایہ محدثین کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان تمام حضرات نے دارالعلوم دیوبند اور اپنے حلقہ درس و تدریس میں حدیث کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے دارالعلوم دیوبند میں مختلف علوم وفنون کی اعلیٰ کتابوں کے پڑھانے کے بعد صرف علم حدیث کی تعلیم وتدریس کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ آپ کے اساتذہ میں سے

[illegible]

شاگرد تھے جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہ چکے ہیں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بخاری شریف، مسلم شریف، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، موطا امام مالک، موطا امام محمد، نسائی، شمائل ترمذی وغیرہ کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ نے یہ کتابیں دورۂ حدیث کے سال میں پڑھیں اور امتحان میں سب سے اول رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے تدریس کا سلسلہ کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں معقول اور منقول کی کتابیں پڑھانے کے ساتھ ساتھ حدیث کی تعلیم ابتدا ہی سے دیتے رہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے انتقال کے بعد مسلم شریف کا درس مولانا عثمانی مستقل دینے لگے اس کے بعد آپ ڈابھیل چلے گئے۔ مولانا انور شاہ کشمیری کے انتقال کے بعد آپ ڈابھیل کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس بن گئے۔
یہ ہے مولانا عثمانی کا علم حدیث سے شغف تعلیم و تعلّم کے دوران آپ نے علم حدیث، اصول حدیث پر بہت محنت کی جس کے نتیجے میں ہندوستان، پاکستان اور بیرونِ ہند کے محدثین میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ مولانا عثمانی نے فتح الملہم شرح مسلم لکھ کر اپنے مایہ ناز محدث ہونے کی مہر ثبت کردی ہے آپ نے فتح الملہم میں حدیث کے مشکل مضامین کی وضاحت نیز اللہ کی ذات و صفات اور دوسرے خدائی افعال یا دقیق حقیقتیں جو انسانی عقلوں سے بلند ہیں آشکارہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے ہر مسئلہ اور مضمون میں علماء کرام کے عمدہ اور منتخب اقوال کو نقل کیا ہے۔ اور اپنی رائے کو مدلل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دقیق اور مشکل مسائل کو مثالوں اور نظیروں سے سمجھایا ہے۔ چاروں اماموں کے اقوال قابل اعتماد کتابوں سے نقل کیے ہیں۔ ایک باب کے متعلق جتنی احادیث ہیں ان کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ احادیث کے تعارض کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی ہے ان تمام باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس نے اپنی شرح میں ان تمام باتوں کا خیال کیا ہو وہ کتنا بڑا محدث اور عالم حدیث ہوگا۔ اس کی حدیث کی کتابوں پر کتنی گہری نظر ہوگی۔ چنانچہ فتح الملہم کو دیکھ کر مولانا انور شاہ کشمیری

نے مسلم کی تقریظ میں حضرت عثمانی کے محدث ہونے کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے لکھتے ہیں "یقیناً اپنے زمانے کے علاوہ علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی کر اس زمانہ کے محدث مفسر متکلم ہیں اور احقر کے علم میں کوئی شخص اس کتاب "مسلم" کی خدمت ان سے زیادہ بہتر اور برتر نہ کر سکا۔ اس خدمت کی طرف متوجہ ہو کر انھوں نے اہلِ علم کے گردن پر احسان کیا ہے[۵] اس طرح سے معاصرین علماء کے ایک گروہ نے آپ کو محدث مانا ہے۔ وقت کا شیخ الحدیث سمجھا ہے آپ کی خدمات کو سراہتے ہوئے خطوط بھی لکھے ہیں۔

علامہ عثمانی جہاں تفسیر و حدیث، منطق و فلسفہ کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں وہیں علم فقہ میں بھی آپ منفرد نظر آتے ہیں۔ علمائے اہلِ نظر میں جب وقتی مسائل اور ان کے عہد کے ہنگامی نظریوں کا سوال پیش آتا تو آپ کا تفقہ اور فقہی معلومات اور تحقیقات کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا۔ فقہی مسائل کو اس طرح بیان کرتے کہ دلوں کی تہوں میں وہ الفاظ اترتے چلے جاتے اور دماغ کے پردوں کو صاف اور روشن کر دیتے۔ جب کبھی ہنگامی دور کے نازک تقاضے امت مسلمہ کے لئے شرعی احکام کی تشنگی محسوس کرتے تو لوگ مولانا کی طرف نظریں اٹھاتے۔ آپ ان مسائل کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھتے اور پورے غور و خوض، نقد و فکر کے بعد جب کہ ظاہری تحقیق و تدقیق کے فیصلے باطن کی نگاہوں کے ساتھ نگاہیں ملا کر شفائے قلبی کے ساتھ متفق ہو جاتے تو مولانا اس پر اڑ جاتے اور پھر ان کی قوت علمی، قوت فیصلہ، قوت استدلال کے سامنے جو مخالف دوسرا نظریہ سر کراتا اسے آپ کے دلائل کے سامنے جھکنا پڑتا اسی وجہ سے علماء نے آپ کو فقیہ دانشمند کے نام سے یاد کیا ہے۔

آپ کے دور میں مائیکروفون کا استعمال اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ نماز میں قرأت کو پہنچانے کا مسئلہ زیر بحث تھا مسلمانوں کے دل میں بڑے بڑے مجموعوں اور عید و جمعہ کی نمازوں کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ خطبہ اور قرأت نماز سننے کی خواہش

اور تڑپ پیدا ہوئی مسلمانوں نے اس مسئلے کو علماء کے سامنے پیش کیا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس مسئلے پر تحقیقات کے بعد احتیاط کے مقام پر نظر رکھتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر نماز کو ناجائز قرار دیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ مقتدی امام کے تابع ہیں اور اسی کی قرأت کا براہ راست ان کو مطیع ہونا ضروری ہے۔ امام اور مقتدی کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں ہونی چاہیئے جو امام سے ہٹا کر مقتدی کو اپنی حرکات و آواز پر چلائے۔ کیونکہ ایسے شخص کی اقتداء جو نماز میں شریک نہیں ہے فقہاء کے نزدیک جائز نہیں اس لئے اگر لاؤڈ اسپیکر میں امام کی بعینہ آواز کے تموج میں شبہ رہا تو اس لئے حکیم الامت نے مقام احتیاط کی بنیاد پر مقتدیوں کی نماز فاسد ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ لیکن مولانا عثمانی نے اپنی خداداد فقہی بصیرت سے مسئلہ کی نزاکت کو سمجھا اور تشدد میں ایک درمیانی پہلو اختیار فرما کر اختلاف کیا۔ آپ کا نظریہ تھا کہ اذان، خطبہ، قرأت نماز میں شریعت کو اس امر کا خاص اہتمام مقصود ہے کہ نماز پڑھنے والوں اور خطبہ اور اذان سننے والوں کو قرأت، اذان، اور خطبہ پہونچ جائے۔ اور اسی پر ان کی اصلاح اور تذکیر و نصیحت موقوف ہے۔ اسی لئے موذن ایسا ہونا چاہیئے جس کی آواز بلند ہو۔ دوسری جانب قرآن کا حکم ہے: اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ یعنی جب قرآن کریم کی قرأت کی جا رہی ہو تو ادھر کان لگا دو اور خاموش ہو جاؤ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ قرأت قرآنی پر کان لگانا اور خاموش نہ رہنا عذاب کا موجب ہو سکتا ہے لہذا یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ شریعت کا بلند آوازی پر اہتمام ہے۔ مولانا عثمانی نے خطبۂ جمعہ کے متعلق صحیح بخاری کی روایت نقل کی ہے۔ فلما قعد علی المنبر وسکت . . المؤذنون الحدیث۔ جب کہ حضرت عمرؓ منبر پر بیٹھ گئے اور موذن حضرات اذان دے کر خاموش ہو گئے۔ اس روایت سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کئی موذنوں نے خطبہ کی اذانیں دیں جس کا مقصد آواز پہنچانا تھا لہذا اگر موجودہ عہد میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ قرأت یا خطبہ یا اذان کو بلند کیا جائے تو مقتدیوں کی نماز فاسد نہیں

ہوگی۔ پھر اس اعتراض کا بھی جواب ہے کہ خطبہ اور قرأتِ امام کو پہنچانے کا کام اگر کوئی شخص مکبر الصوت سے کرے تو کیا مضائقہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے اہم مقاصد یعنی امام کی قرأت اور خطبہ کا سننا اور کان لگانا یعنی استماع اور انصات فوت ہوجائے گا نیز جب کئی آدمی خطبہ اور قرأت کو پہنچائیں گے تو آوازوں کا سلسلہ طویل ہوجائے گا اور اس سہولت کے خلاف ہوگا جس میں خطبہ اور نماز کو مختصر کرنے کو کہا گیا ہے تاکہ نمازیوں کو کلفت نہ ہو لیکن مذکورہ صورت میں طوالت خطبہ کے باعث نمازیوں کو تخفیف نہ ہوگی۔ مولانا تھانوی نے نماز کو فاسد قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ آلہ مکبر الصوت کے ذریعہ قرأت پہنچانا اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اس کا بھی جواب دیا کہ ابتداءً ایک چیز عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن کثرتِ استعمال سے اس کا عجوبہ پن ختم ہوجاتا ہے پھر اس کی طرف توجہ بھی نہیں رہتی ہے۔ علامہ نے ایک اور فقہی نقطہ بھی حل کیا ہے کہ مسائل فقہی کے لئے فلسفیانہ تحقیقات اور تدقیقات کی ضرورت نہیں جیسا کہ رویت ہلال اور سمت قبلہ کے لئے آلات رصدیہ و اصطرلاب کی ضرورت نہیں اور بہترین تفقہ کا ثبوت مولانا کے اس فقہی اصول کی ترجمانی ہے کہ جس مسئلے میں اجتہاد کی ضرورت ہو اور نورِ قلبی وہاں اپنی چمک نہ دکھا رہا ہو تو یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہاں شرحِ صدر نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا چنانچہ جس چیز پر شرحِ صدر نہ ہو اس سے مباح کا پہلو نکلتا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ جو آپ کے سامنے آیا وہ مسلم لیگ میں شرکت کا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی شرعی نوعیت کا تھا۔ آپ نے مسلم لیگ کی شرکت پر مجتہدانہ غور کیا، قرآن و سنت کی روشنی کو رہبر بنایا، استخارے کیے، دعائیں مانگیں بالآخر شرحِ صدر کے ساتھ مسلم لیگ میں اپنی اور اپنی جماعت کی شرکت کا اعلان فرمایا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی میرٹھ کے مسلم لیگ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں:

"راقم الحروف خود ایک مدت دراز تک اسی کشمکش [illegible] میں مبتلا رہا [illegible]

[illegible] مسلم لیگ کی حمایت میں قلم اٹھایا ہے میں نے اپنی قدرت کی حد تک مسئلہ کی نوعیت پر قرآن و سنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں غور و فکر کیا اللہ سے [illegible] اور استخارے کیے۔ بالآخر ایک چیز میرے اطمینان اور شرح صدر کا سبب [illegible] وہ حضرت امام محمد بن حسن الشیبانی کی ایک تصریح ہے جو ان کی کتاب السیر الکبیر میں موجود ہے (تصریح کو بیان کرنے کا موقع نہیں جس کو دیکھنا ہو السیر الکبیر میں دیکھ سکتا ہے۔)

اس تصریح پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عثمانی لکھتے ہیں کہ اتفاق سے آج ہندوستان میں مسلم لیگ کا مقابلہ بھی کفار و مشرکین سے ہے اور مسلم لیگ میں شریک ہونے والے کلمہ گو مدعی اسلام ہیں جو مسلمانوں کے قومی استقلال، سیاسی اقتدار نفس کلمہ اسلام کے اعلاء اور ملت اسلامیہ کو من حیث المجموع مضبوط، طاقتور اور سربلند کرنے کے لئے ایک آئینی جنگ ان کفار و مشرکین کے مقابلہ پر کر رہے ہیں جو مسلم لیگ میں شامل ہونے والے بے شمار آدمیوں میں ان چند باطل پرستوں کی تعداد اہلِ حق کی نسبت عشر عشیر نہیں۔[۹] اس تبصرہ کو پڑھنے کے بعد مولانا کی مسلم لیگ میں شمولیت کی وجہ معلوم ہوتی ہے اور اس تبصرہ سے مولانا کی فقہی صلاحیتیں تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آجاتی ہیں مولانا نے جب یہ فیصلہ کیا اس وقت مسلم لیگ یا کانگریس میں شرکت مسلمانانِ ہند کی زیست اور موت کا سوال تھا شرعی اور سیاسی حیثیت سے اس میں شرکت ایک مذہبی اور سیاسی فکر کی متلاشی تھی۔ ایک طرف مقتدر علماء کی جماعت کانگریس میں شریک تھی۔۔ دوسری طرف خاص و عام سیاسی مسلمانوں کا نظریہ مسلم لیگ اور تخلیق پاکستان تھا، ان حالات میں اس اجتہادی مسئلہ پر سخت تفقہ، غور و فکر، ذمہ داری اور دیانتداری [illegible] کی ضرورت تھی جو جذبات کے ماتحت مسائل سوچنے کا عادی نہ ہو اور [illegible] سے بلند ہو کر خلوص نیت سے مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کا خیال رکھتے ہوئے انہیں کسی منزل کی طرف لے چلے۔ مولانا عثمانی ایسے طوفانی دور

ہو گی۔ پھر اس اعتراض کا بھی جواب دیا کہ خطبہ اور قرأتِ امام کو پہنچانے کا کام اگر کئی شخص مجموعی طور سے کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے اہم مقاصد یعنی امام کی قرأت اور خطبہ کا سننا اور کان لگانا یعنی استماع اور انصات فوت ہو جائے گا۔ نیز جب کئی آدمی خطبہ اور قرأت کو پہنچائیں گے تو آوازوں کا سلسلہ طویل ہو جائے گا اور اس سہولت کے خلاف ہو گا جس میں خطبہ اور نماز کو مختصر کرنے کو کہا گیا ہے تاکہ نمازیوں کو کلفت نہ ہو لیکن مذکورہ صورت میں طوالت خطبہ کے باعث نمازیوں کو تخفیف نہ ہو گی۔ مولانا تھانوی نے نماز کو فاسد قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ آلہ مکبر الصوت کے ذریعہ قرأت پہونچانا لہو ولعب سا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اس کا بھی جواب دیا کہ ابتداءً ایک چیز عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن کثرت استعمال سے اس کا عُجب رفع ہو جاتا ہے پھر اس کی طرف توجہ بھی نہیں رہتی ہے۔ علامہ نے ایک اور فقہی نقطہ بھی حل کیا ہے کہ مسائل فقہی کے لئے فلسفیانہ تحقیقات اور تدقیقات کی ضرورت نہیں جیسا کہ رویت ہلال اور سمت قبلہ کے لئے آلات رصدیہ واصطرلاب کی ضرورت نہیں اور بہترین تفقہ کا ثبوت مولانا کے اس فقہی اصول کی ترجمانی ہے کہ جس مسئلے میں اجتہاد کی ضرورت ہو اور نور قلبی وہاں اپنی چمک نہ دکھا رہا ہو تو یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہاں شرح صدر نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا چنانچہ جس چیز پر شرح صدر نہ ہو اس سے مباح کا پہلو نکلتا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ جو آپ کے سامنے آیا وہ مسلم لیگ میں شرکت کا اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی شرعی نوعیت کا تھا۔ آپ نے مسلم لیگ کی شرکت پر مجتہدانہ غور کیا۔ قرآن وسنت کی روشنی کو رہبر بنایا۔ استخارے کیے، دعائیں مانگیں پھر شرح صدر کے ساتھ مسلم لیگ میں اپنی اور اپنی قوم کی شرکت کا اعلان فرمایا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی میرٹھ کے مسلم لیگ کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں:

" راقم الحروف خود ایک مدت دراز تک اسی کشمکش و پیچ میں رہا اور یہی وجہ ہے کہ

کرخاص تاخیر سے میں نے لیگ کی حمایت میں قلم اُٹھایا ہے میں نے اپنی قدرت کی حد تک مسئلہ کی نوعیت پر قرآن و سنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں غور و فکر کیا اللہ سے دعائیں کیں اور استخارے کیے۔ بالآخر ایک چیز میرے اطمینان اور شرح صدر کا سبب بنی اور وہ حضرت امام محمد بن حسن الشیبانی کی ایک تصریح ہے جو ان کی کتاب السیر الکبیر میں موجود ہے (تصریح کو بیان کرنے کا موقع نہیں جس کو دیکھنا ہو السیر الکبیر میں دیکھ سکتا ہے۔)

اس تصریح پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عثمانی لکھتے ہیں کہ اتفاق سے آج ہندوستان میں مسلم لیگ کا مقابلہ بھی کفار و مشرکین سے ہے اور مسلم لیگ میں شریک ہونے والے کلمہ گو مدعی اسلام ہیں جو مسلمانوں کے قومی استقلال، سیاسی اقتدار نفس، کلمہ اسلام کے اعلاء اور ملت اسلامیہ کو من حیث المجموع مضبوط، طاقتور اور سربلند کرنے کے لئے ایک آئینی جنگ ان کفار و مشرکین کے مقابلہ پر کر رہے ہیں جو مسلم لیگ میں شامل ہونے والے بے شمار آدمیوں میں ان چند باطل پرستوں کی تعداد اہلِ حق کی نسبت عشر عشیر نہیں۔ ۹ے اس تبصرہ کو پڑھنے کے بعد مولانا کی مسلم لیگ میں شمولیت کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس تبصرہ سے مولانا کی فقہی صلاحیتیں تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آجاتی ہیں۔ مولانا نے جب یہ فیصلہ کیا اس وقت مسلم لیگ یا کانگریس میں شرکت مسلمانانِ ہند کی زلیست اور موت کا سوال تھا شرعی اور سیاسی حیثیت سے اس میں شرکت ایک مذہبی اور سیاسی مفکر کی متلاشی تھی۔ ایک طرف مقتدر علماء کی جماعت کانگریس میں شریک تھی.. دوسری طرف خاص و عام سیاسی مسلمانوں کا نظریہ مسلم لیگ اور تخلیق پاکستان تھا، ان حالات میں اس اجتہادی مسئلے پر سخت تفقہ، غور و فکر، ذمہ داری اور دیانت دار رہبری کی ضرورت تھی جو جذبات کے ماتحت مسائل سوچنے کا عادی نہ ہو اور ذاتیات سے بلند ہو کر خلوص نیت سے مسلمانوں کی اصلاح اور فلاح کا خیال رکھتے ہوئے انھیں کسی منزل کی طرف لے چلے۔ مولانا عثمانی ایسے طوفانی دور

میں ابھر کر سامنے آئے۔ اس مسئلے پر قرآن و حدیث کو سامنے رکھ کر اجتہاد کیا اور بالآخر مسلم لیگ میں اپنی اور اپنے قوم کی شرکت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح کے بہت سارے مسائل مولانا کے سامنے آئے۔ آپ نے تمام ہی معاملات پر خوش اسلوبی کے ساتھ غور و فکر کیا۔ ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ فتویٰ دیا۔ اور اپنے مسلک کے حق میں دلائل کے انبار لگا دیے۔ مجبور ہو کر علامہ زاہد الکوثری کو لکھنا ہی پڑا کہ "مولانا عثمانی کو فی الیقین اہل فقہ اور اہل حدیث کی تردید میں پوری نزاہت حاصل ہے۔" ؎

علامہ شبیر احمد عثمانی دنیائے اسلام کی سیاست داں ہستیوں میں سے ایک ایسی ہستی ہے جس کے گوشہ ہائے فکر و تدبر کا صحیح تجزیہ کرنا مشکل ہے علامہ نے سیاست میں اس وقت قدم رکھا جب کہ ہندوستان کے افق سیاست پر انگریزوں کا آفتاب چمک رہا تھا اور انگریزی حکومت ہندو نواز پالیسیوں اور مسلمان دشمن سرگرمیوں کا محور بنتی جا رہی تھی۔ ایسے دور میں ایک طرف محمد علی جناح جیسے بے لوث، مخلص اور سیاست داں ہستی سامنے ابھر کر آئی جس نے مسلم لیگ کے آفتاب کو مسلمانان ہندوستان کے سیاسی افق پر چمکانا چاہا اور مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط سے نکال کر دوسرا ملک بنانے کی تحریک شروع کی تو دوسری طرف مولانا ابوالکلام جیسے سیاست داں عالم نے کانگریس کی حمایت شروع کر دی۔ ایسے دور میں مسلمانوں کا ایک طبقہ سخت کشمکش میں تھا ان کو اپنے ایمان کی بھی فکر تھی اور صحیح منزل مقصود کی بھی۔ اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی نے ایک شمع روشن کی۔ اور مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لئے شریعت محمدی کی روشنی میں راہ ہدایت دکھانی شروع کی۔ آپ نے پوری قومی اور اسلامی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے خود بھی مسلم لیگ میں شمولیت کی اور مسلمانوں کو بھی سیاسی اور مذہبی دلائل کی قوت سے لیگ میں شرکت کی دعوت دی پہلے علامہ نے قرآن و حدیث اور سنت رسول پر

غور کیا اور نظریۂ پاکستان اور لیگ کی تائید میں قدم اٹھانے سے پہلے استخارے کیے اور پھر عملی قدم اٹھایا۔ آپ کے اس اقدام سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جو تذبذب کی پوزیشن میں تھا مسلم لیگ کا حامی بن گیا۔ علامہ عثمانی نے زمانۂ طالب علمی ہی سے سیاست میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ جنگ بلقان کے زمانے میں جب انگریزوں نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کیں اور یورپ کی طاقتیں ترکوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے متفق ہو کر ان پر حملہ آور ہو گئیں تو ہندوستان میں ترکوں کی ہمدردی کا جوالہ مکھی پھٹ پڑا۔ تمام لوگوں کے اندر جذبات غیرت جاگ اٹھے اور ترکوں کی حمایت کا ہر طرف غلغلہ بلند ہونے لگا۔ نوجوانوں، بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں نے ترکوں کی معاونت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور میدان جنگ میں زخمی ترکوں کے ایک ایک زخم کو اپنا زخم سمجھا۔ یہاں تک کہ مشاہیر ہند کا ایک ریڈ کراس کا وفد ان مجروحین و مظلومین کی مدد کے لئے ترکی پہنچا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے جذبۂ اخوت میں جوش پیدا ہوا اور آپ نے بذات خود دورہ کر کے ترکوں کے لئے چندہ جمع کیا۔ ہلال احمر کے کام میں آپ نے دن رات ایک کر دیا اور ایک سچے مومن اور مجاہد کی طرح مردانہ وار ترکوں کی مدد کی۔ اس طرح آپ نے مختلف اوقات میں جا بجا ترکوں کی مدد کی۔ ان کی مدد کے لئے آپ نے دن رات ایک کر کے زمانۂ طالب علمی ہی میں دورے کیے۔ جب آپ بڑے ہوئے اور انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں تحریک کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کے تشخص کو برقرار رکھنے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء کی بنیاد رکھی گئی تو علامہ عثمانی اس کے رکن رکین بن کر رہے۔ جمعیت کے جلسوں میں نہ صرف علامہ نے شرکت کی بلکہ بہت ہی پر جوش اور کامیاب تقریریں کیں۔ آپ کے متعلق اخبار الجمعیۃ دہلی کے ایڈیٹر نے اپنے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ "علامہ عثمانی ۱۹۴۵ء تک جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے اور قومی تحریکات میں ہمیشہ

آگے آگے رہنے کی کوشش کی۔ تحریک خلافت سے لے کر ۱۹۴۵ء تک جمعیتہ العلماء اور کانگریس کو آپ کے تعاون کا فخر حاصل رہا۔ بہت سی کمیٹیوں میں صدارت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۱؎ لیکن ۱۹۴۵ء میں آپ نے جمعیتہ العلماء سے استعفیٰ دے دیا اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ مولانا جمعیتہ العلماء کی کانگریس میں بلا شرط اور بحیثیت مجموعی شرکت اور انفرادی سرگرمیوں کے مخالف تھے لیکن ابتداء میں آپ نے جمعیتہ کا ساتھ اس لئے دیا تھا کہ ملکی آزادی جس صورت سے بھی حاصل ہو جائے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ مسلمانوں کو مسلمانوں ہی کی چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے تو آپ جمعیتہ سے مستعفی ہو گئے اور تحریک پاکستان میں شامل ہو گئے۔ تحریک پاکستان میں شمولیت کی وجہ بتاتے ہوئے آپ نے لکھا ہے "کہ اسلامی برادری کا ایک ادنیٰ جزء ہونے کی حیثیت سے اپنے اندازۂ علم و فہم کے موافق سمجھ کر جو رائے قائم ہوئی ہے اپنے مخلصین کے پیہم اصرار پر بطور مشورہ عرض کر دیتا ہوں ...... اس وقت یہ دردناک منظر دیکھا کہ دس کروڑ مسلمانوں کے قومی و سیاسی استقلال کی روح کو کیسی سنگدلی سے مسلمانوں ہی کی چھری سے ذبح کرایا جا رہا ہے بالکل خاموش رہنا گوارہ نہ ہوا۔ ۱۲؎ مولانا کے جمعیتہ سے مستعفی ہوتے اور تحریک پاکستان کی حمایت کرنے سے پورے ملک میں ہلچل مچ گئی۔ بہت سارے علماء اور صلحاء جو تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھے مولانا کی شرکت سے وہ بھی تحریک پاکستان میں شامل ہو گئے۔ جب آپ کا پیغام کلکتہ کی موتمر کل ہند جمعیتہ العلمائے اسلام کے چار روزہ اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تو اس پیغام نے ایک عالم بے خودی پیدا کر دیا۔ عجیب محویت و کیفیت سبھوں پر طاری ہو گئی۔ اور پورا ماحول نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھا۔ بالآخر آپ کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے تمام ہی علماء نے آپ کو جمعیتہ العلمائے اسلام کا پیشگی صدر چن لیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو آپ نے بہت ہی اصرار کے بعد جمعیتہ العلمائے اسلام کی صدارت منظور کی۔ صدارت قبول کرنے کے بعد مولانا کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ مولانا کے پیغام کے بعد تمام ہی مسلمان فوج

در فوج مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ آپ نے مسلم لیگ میں شرکت اور اس کی تائید میں فتویٰ دیا۔ آپ کا فتویٰ اخبار رہبر دکن سے مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا۔ آپ نے لکھا کہ "میں تو سمجھتا ہوں تمام امور سے قطع نظر کرکے اگر لیگ کے وجود سے اتنا کام ہوگیا کہ مسلم قوم کی مستقل ہستی اور اس کی غیر مخلوط صاف آواز ہر انگریز اور ہندو کے نزدیک تسلیم ہوگئی اور تھوڑی سی مدت میں بدون بہت زیادہ نقصان اٹھائے دنیا نے ہندوستان کے اندر ایک تیسری طاقت کے وجود کا اعتراف کرلیا بلکہ لیگ اور کانگریس کو صلح یا جنگ کے ہر معاملہ میں ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑا کیا جانے لگا تو کیا یہ فائدہ شرعی اور سیاسی نقطۂ نظر سے کم ہے"۔ صدارت قبول کرنے کے بعد آپ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا حفظ الرحمان سیوہاریؒ سے مسئلۂ پاکستان کے متعلق گفتگو کی اور ان کو تحریک پاکستان کا مقصد اور پاکستان الگ بننے کا مقصد صاف لفظوں میں واضح فرمایا۔ قلمی جہاد اور انفرادی ملاقات کے بعد علامہ عثمانیؒ میدان عمل میں کود پڑے۔ پورے ملک کا دورہ کیا۔ جگہ جگہ تقریریں کیں۔ آپ کی تقریروں سے پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اور مسلمانوں کی طرف سے پاکستان کے قیام کے لئے انتھک کوششیں ہونے لگیں۔ پاکستان کی تائید اور مسلم لیگ کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ انگریزی حکومت اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واقعی نمائندہ جماعت صرف مسلم لیگ ہے اس سلسلہ میں صوبائی اور مرکزی انتخابات ہوئے جس میں مسلم لیگ کو زبردست کامیابی ملی اور انگریزی حکومت کو مسلم لیگ کی نمائندگی تسلیم کرنی پڑی۔ اس کے بعد پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے اور شدید ہوگیا۔ بالآخر مجبور ہوکر کانگریس اور انگریزی حکومت نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیا۔ اور انگریزی حکومت نے پاکستان اور ہندوستان کی منظوری دے دی۔ اس منظوری سے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ علامہ عثمانی کی کاوشیں اور جانفشانی رائیگاں نہ گئیں۔ مولانا کی کاوشوں اور محنتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے

اخبار امروز نے لکھا "مولانا کی زندگی اور ان کے کارناموں سے پاکستانی عوام اچھی طرح آگاہ ہیں۔ کیونکہ ان کے تبحر علمی، ان کی راست بازی اور حق گوئی و حق شناسی نے کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کو راستہ دکھایا۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ قائد اعظم کی سیاسی بصیرت اور قانونی مہارت کے ساتھ ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تبحر علمی اور فیض روحانی نے مسلمانوں کو وہ قوت عمل بخشی کہ انھوں نے صدیوں کا راستہ چند برسوں میں طے کر لیا۔"

پاکستان کے ..... بننے کے بعد ۶ راگست ۱۹۴۷ء کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ افتتاح پاکستان کے لئے کراچی تشریف لے گئے۔ دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کا افتتاح علامہ نے قرآن کریم کی آیات سے کیا۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کا افتتاح قرآن کریم کے ذریعہ ہونا دستور بن گیا۔ پاکستان بننے کے بعد علامہ نے ہر اس شخص کی خدمت کی جو آپ کے پاس کوئی تمنّا یا فریاد یا درخواست لے کر گیا۔ آپ نے اپنے آپ کو خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا۔ آپ نے لاکھوں مسلمانوں کی آبادکاری کا کام کیا لیکن خود کہیں نہ آباد ہوسکے۔ انھیں باتوں کی وجہ سے آپ پاکستانی عوام کے ہر دلعزیز ہوگئے آپ کے نام پر کراچی میں ایک کالونی اور ایک ہائی سکول کا قیام عمل میں آیا۔

پاکستان میں آپ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ، مسئلۂ کشمیر رہا۔ آپ نے اس مسئلہ پر زبردست تقریریں کیں اور کشمیری مجاہدین اور مجروحین کی امداد کے لئے سرمایہ اکٹھا کر کے بھیجا۔ آپ نے اس کے علاوہ ڈاکٹر کا ایک وفد کشمیری مجاہدین کی مرہم پٹی کے لئے بھیجا۔ علامہ نے کشمیر کے مسئلہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے جہاد کا فتویٰ صادر فرمایا۔ اور اس فتوے کی تمام ممالک اسلامیہ اور علماء و شیوخ نے موافقت کی اور کشمیری عوام کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس کے علاوہ آپ نے دستور ساز اسمبلی میں کشمیر سے متعلق ایک جوشیلی تقریر کی۔ آپ کے تقریر سے متاثر ہو کر حکومت نے کشمیر کمیٹی کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی۔

علامہ عثمانی جب پاکستان پہونچے تو آپ کی یہ کوشش رہی کہ آپ دستور ساز اسمبلی سے یہ قانون کم از کم پاس کرالیں کہ پاکستان کا دستور قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ اس کے لئے آپ نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ ملک کی رائے عامہ کو ہموار کیا۔ آپ نے ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے موجودہ حکومت کو چیلنج کر دیا کہ خواہ ارباب اقتدار ہمارے ساتھ کچھ بھی برتاؤ کریں ہم اس کوشش سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے کہ مملکت پاکستان میں اسلام کا وہ دستور و آئین اور وہ نظام حکومت تشکیل پذیر ہو جس کی رو سے اس بات کا موثر انتظام کیا جائے کہ مسلم قوم اپنی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن و سنت سے ثابت ہوں مرتب و منظم کر سکے۔ آپ نے ڈھاکہ کے خطبہ میں مملکت پاکستان کے اسلامی آئین کی تجویز کو پاس کرانے کی تجویز کے ساتھ ساتھ وہ بنیادی اصول بھی پیش کیے ہیں جن پر چل کر کوئی حکومت فلاح و کامرانی کا راستہ حاصل کر سکتی ہے۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں "ساری ملت اسلامیہ متحد و یک جان ہو کر اپنی قدرت کی آخری حد تک وہ قوت فراہم کرے جس سے ابلیسی لشکروں کے حوصلے پست ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کی تکمیل و انصرام موقوف ہے اس پر کہ ہماری سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان پہلے اپنے قیام کی اصلی غرض و غایت اور بنیادی اصول کو سمجھ لے جو ہمارے نزدیک حسب ذیل ہونے چاہئیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کو سارے ملک کا مالک اصلی اور حاکم حقیقی مانتے ہوئے اس کے نائب امین کی حیثیت سے اسی کی مقرر کردہ حدود کے اندر پوری . . . امانت . . . کے خیال کے ساتھ حکومت کا کاروبار چلانا۔

(۲) بلاتفریق، مذہب و ملت و نسل وغیرہ تمام باشندگان پاکستان کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرنا اور دوسری اقوام کو بھی اس مقصد کی طرف دعوت دینا۔

(۳) معاہدات کا احترام کرنا جو کسی دوسری قوم یا مملکت سے کیے گئے ہوں

(د) غیر مسلم باشندگان پاکستان کے لئے جان و مال اور مذہب کی آزادی اور شہری حقوق کے تحفظ کے ساتھ مذہب اسلام کی حفاظت اور تقویت کا بندوبست کرتے ہوئے مسلم قوم کو ان قوانین الٰہیہ کا پابند بنانے کی انتہائی سعی کرنا جو مالک الملک نے ان کے فلاح دارین کے لئے نازل فرمائے ہیں۔

(ہ) تمام باشندگان پاکستان کی انفرادی صلاحیتوں کی کامل حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کے معاشی حالات میں مناسب اور معتدل توازن قائم کرنا اور تا بحد امکان کسی فرد کو بھی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہونے دینا۔

(و) خصوصیت کے ساتھ ربا (سود) مسکرات (نشہ آور اشیاء) قمار (جوا) اور ہر قسم کے معاشرتی فواحش کے سدِ باب کی امکانی کوشش کرنا۔

(ز) قومی معاشرہ کو بلند خیالی کے ساتھ ساتھ سادہ اور ستھرا بنانے کی ہر جائز کوشش کرنا۔

(ح) مغربی طرز کی پیچ در پیچ عدالتی بھول بھلیوں سے نکال کر عوام کے لئے امکانی حد تک سستا اور تیز رفتار انصاف حاصل کرنا۔

(ط) ان پاک اور بلند مقاصد کے لئے ایک ایک مسلمان کو بقدر ضرورت دینی و عسکری تربیت دے کر اسلام کا مجاہد اور پاکستان کا سپاہی بنا دینا۔

یہ وہ زریں بنیادی اصول ہیں جو علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ نے اپنی حکومت کے لئے پیش کیے جو ان کی اسلامی قانون دانی اور سیاسی بیدار مغزی پر روشن دلیل ہیں۔

آخری ایام میں آپ نے کوشش کی کہ پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کی طرح ایک مدرسہ قائم کر دیں۔ آپ نے کراچی اور پاکستان کے مقتدر اشخاص اور علماء کو ممبر سازی کی دعوت بھی دی لیکن دارالعلوم کے قیام سے پہلے ہی آپ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

تعلیقات وحواشی

(۱) سید سلیمان ندوی، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۰ء ص ۳۰۸۔
(۲) ملاحظہ ہو رپورٹ موتمر الانصار منعقدہ ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ ص ۶۲، ۶۳۔
(۳) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، حوالہ بالا، ص ۳۰۲، ۳۰۳۔
(۴) نفس مصدر، ص ۳۰۸۔
(۵) ماہنامہ برہان دہلی، نظرات، جنوری ۱۹۸۵ء۔
(۶) قرآن کریم، سورۂ طلاق : ۶
(۷) قرآن کریم بتفسیر عثمانی ۱۳۶۹ء، ص ۷۲۵۔
(۸) تقریظ، فتح الملہم شرح مسلم، مدینہ پریس بجنور ۱۹۳۳ء۔
(۹) علامہ شبیر احمد عثمانی، خطبہ صدارت مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ، ص ۱۵۔
(۱۰) علامہ زاہد الکوثری، تقریظ فتح الملہم شرح مسلم، حوالہ بالا، جلد سوم، ص ۵۲۰ بحوالہ رسالہ الاسلام مصر۔ علامہ کوثری نے علامہ عثمانی کی فقہی بصیرت اور دلائل و براہین کے ذریعہ فقہ حنفی کی حمایت میں ان کی قوت استدلال کی تعریف کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ مولانا کو ان الفاظ میں مخاطب کیا ہے۔ فانتم یا مولانا فخر الحنفیۃ فی ھذا العصر حقا۔ (یا مولانا آپ اس زمانہ میں حق یہ ہے کہ حنفیت کے لئے فخر ہیں۔) فخر حنفیت کے اس لقب سے اگرچہ عصبیت کی بو آتی ہے مگر دراصل علامہ کوثری نے مصنف کی قوت بیان اور زور استدلال کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔
(۱۱) روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۱۸ دسمبر ۱۹۴۹ء۔
(۱۲) علامہ شبیر احمد عثمانی، بیان الیکشن منشور دہلی، ۱۲ نومبر ۱۹۴۵ء۔
(۱۳) اخبار امروز، ۱۷ دسمبر ۱۹۵۱ء۔

(د) غیر مسلم باشندگان پاکستان کے لئے جان ومال اور مذہب کی آزادی اور شہری حقوق کے تحفظ کے ساتھ مذہب اسلام کی حفاظت اور تقویت کا بندوبست کرتے ہوئے مسلم قوم کو ان قوانین الٰہیہ کا پابند بنانے کی انتہائی سعی کرنا جو مالک الملک نے ان کے فلاح دارین کے لئے نازل فرمائے ہیں۔

(ہ) تمام باشندگان پاکستان کی انفرادی صلاحیتوں کی کامل حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کے معاشی حالات میں مناسب اور معتدل توازن قائم کرنا اور تا بحد امکان کسی فرد کو بھی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہونے دینا۔

(و) خصوصیت کے ساتھ ربا (سود) مسکرات (نشہ آور اشیاء) قمار (جوا) اور ہر قسم کے معاشرتی فواحش کے سدِ باب کی امکانی کوشش کرنا۔

(ز) قومی معاشرہ کو بلند خیالی کے ساتھ ساتھ سادہ اور ستھرا بنانے کی ہر جائز کوشش کرنا۔

(ح) مغربی طرز کی پیچ در پیچ عدالتی بھول بھلیوں سے نکال کر عوام کے لئے امکانی حد تک سستا اور تیز رفتار انصاف حاصل کرنا۔

(ط) ان پاک اور بلند مقاصد کے لئے ایک ایک مسلمان کو بقدر ضرورت دینی و عسکری تربیت دے کر اسلام کا مجاہد اور پاکستان کا سپاہی بنا دینا۔

یہ وہ زریں بنیادی اصول ہیں جو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی حکومت کے لئے پیش کیے جو ان کی اسلامی قانون دانی اور سیاسی بیدار مغزی پر روشن دلیل ہیں۔

آخری ایام میں آپ نے کوشش کی کہ پاکستان میں دار العلوم دیوبند کی طرح ایک مدرسہ قائم کر دیں۔ آپ نے کراچی اور پاکستان کے مقتدر اشخاص اور علماء کو ممبر سازی کی دعوت بھی دی لیکن دار العلوم کے قیام سے پہلے ہی آپ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

تعلیقات و حواشی

(۱) سید سلیمان ندوی، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۰ء ص ۳۰۸۔
(۲) ملاحظہ ہو رپورٹ موتمر الانصار منعقدہ ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۲۸ھ ص ۶۲، ۶۳۔
(۳) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، حوالہ بالا، ص ۳۰۲، ۳۰۳۔
(۴) نفس مصدر، ص ۳۰۸۔
(۵) ماہنامہ برہان دہلی، نظرات، جنوری ۱۹۸۵ء۔
(۶) قرآن کریم، سورۂ طلاق : ۶
(۷) قرآن کریم بتفسیر عثمانی ۱۳۶۹ھ، ص ۷۲۵۔
(۸) تقریظ، فتح الملہم شرح مسلم، مدینہ پریس بجنور ۱۹۳۳ء۔
(۹) علامہ شبیر احمد عثمانی، خطبہ صدارت مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ، ص ۱۵۔
(۱۰) علامہ زاہد الکوثری، تقریظ فتح الملہم شرح مسلم، حوالہ بالا، جلد سوم ص ۵۲۰ بحوالہ رسالہ الاسلام مصر۔ علامہ کوثری نے علامہ عثمانی کی فقہی بصیرت اور دلائل و براہین کے ذریعہ فقہ حنفی کی حمایت میں ان کی قوت استدلال کی تعریف کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ مولانا کو ان الفاظ میں مخاطب کیا ہے۔ فانتم یا مولانا فخر الحنفیۃ فی ھذا العصر حقا۔ (یا مولانا آپ اس زمانہ میں حق یہ ہے کہ حنفیت کے لئے فخر ہیں۔) فخر حنفیت کے اس لقب سے گرچہ عصبیت کی بو آتی ہے مگر دراصل علامہ کوثری نے مصنف کی قوت بیان اور زور استدلال کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔
(۱۱) روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۱۸ دسمبر ۱۹۴۹ء۔
(۱۲) علامہ شبیر احمد عثمانی، بیان الیکشن منشور دہلی، ۱۲ نومبر ۱۹۴۵ء۔
(۱۳) اخبار امروز، ۱۷ دسمبر ۱۹۵۱ء۔

(۱۴) علامہ شبیر احمد عثمانی، خطبۂ صدارت اجلاس ڈھاکہ، فروری ۱۹۴۹ء ص ۶،۷۔
(۱۵) نفس مصدر۔

یہ مضمون علامہ انوار الحسن انور شیر کوٹی کی کتاب تجلیات عثمانی، ادارہ نشر المعارف جہلیک ملتان (پاکستان) ۱۹۵۷ء سے مستفاد ہے۔ تفصیل کے طالب کو علامہ کے علمی و سیاسی زندگی کے بالاستیعاب مطالعے کے لئے اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ مضمون ایک ابتدائی علمی کاوش ہے۔ امید ہے کہ اہل قلم حضرات علامہ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

(ختم شد)

ظہیر الدین محمد بابر

از: عبدالرؤف خاں ایم۔اے خیلدار محلہ اُدرئی کلاں (راجستھان)

ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی نے مختلف علوم وفنون کی معیاری تصانیف کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا ایک اشاعتی پروگرام مرتب کر رکھا ہے تاکہ یہ زبان بھی "کلاسیکی علمی سرچشموں کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون کی دولت سے مالامال ہوتی رہے"۔[1] اس پروگرام کے تحت علم تواریخ کی بھی کئی اہم تصنیفات جو "برعظیم" ہندوپاک کی اکثر وبیشتر جامعات کے ایم۔اے کے نصابِ تاریخ میں داخل ہیں، کے تراجم بھی منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ ان میں سے سلسلہ مطبوعات نمبر ۶۲۲ "ایل۔ایف۔رش بروک ولیمز کی تصنیف ظہیر الدین محمد بابر این ایمپائر بلڈر آف دی سکسٹینتھ سینچری" کا ترجمہ "ظہیر الدین محمد بابر" کے نام سے جناب ڈاکٹر رفعت بلگرامی صاحب نے کیا ہے۔ راقم الحروف کے سامنے اس وقت مذکورہ تصنیف کا تیسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا ہے۔ راقم کے پیشِ نظر انگریزی کی اصل تصنیف نہیں کہ جس سے اُردو ترجمہ کو ملا کر دیکھ لیا جاتا تاکہ یہ معلوم ہو جاتا کہ بعض مقاماتِ متن کا ترجمہ حذف تو نہیں ہو گیا ہے، جیسا کہ بیورو کے تاریخ جہانگیر و تاریخ شاہ جہاں کے تراجم میں اکثر وبیشتر صفحات میں ہوا ہے۔[2] تاہم یہ ترجمہ نسبتاً بہتر معلوم ہوا اور کئی صفحات پر مترجم موصوف نے کافی محنت ... زبان سے ترجمہ فرمایا ہے مگر بقول مولانا ابوالکلام

آزادؒ (متوفی ۱۹۵۸ء) ترجمہ کرنا ایک اعتبار سے اصل تخلیق سے بھی مشکل ہوتا ہے،
مترجم کے لئے اصل تحریر کے ادبی متن کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ ترجمہ کے
ذریعہ مصنف کے ادبی طرز نگارش کا اظہار کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے صرف
وہی شخص اس قسم کے مشکل کام کو انجام دے سکتا ہے جس کو دونوں زبانوں
پر مساوی عبور حاصل ہو[۳]" اس تناظر میں اگر ہم ڈاکٹر رفعت بلگرامی صاحب
کے ترجمہ پر ایک نظر ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ موصوف نے رش برک ولیمز کے
اسلوب نگارش کو بڑی حد تک نبھانے کی سعی مشکور فرمائی ہے جس کے لئے
وہ مبارکباد کے مستحق ہیں باوجودیکہ تاریخی اعلام وامصار اور اماکن کے سلسلہ میں
مزید احتیاط درکار تھی، جس کے فقدان کے سبب بہت سے اسماء مضحکہ خیز بن
گئے ہیں مثلاً سلطان محمد ویس (اویس) کو ص ۹۶، ۹۷ پر "سلیمان محمد دیئس"
ارتام فرمایا ہے اور پوری تصنیف میں ص ۲۰۹ تک "ویس" کا املا "وئیس"
ہی لکھا ہے جسے اصلاح کاتب سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ عہد اورنگزیب عالمگیر
علیہ الرحمۃ کے مشہور مورخ صاحب منتخب اللباب محمد ہاشم خاں المخاطب خوافی
خاں المتوفی ۱۷۱۹ء کے نام سے تاریخ کا مبتدی بھی واقف ہے' ان کا اصل وطن
قصبہ "خواف" مضافات نیشاپور تھا جس کی نسبت سے یہ خوافی خاں (خافی
خاں) کہلائے اس معروف مورخ کو مترجم موصوف نے ص ۹۹ حاشیہ ۲ پر
"خفی خاں" لکھا ہے، شکر ہے کہ یہ "خفا خاں" نہیں ہوا گو وہ بہ اعتبار مسلک
اورنگزیب سے زیادہ خوش بھی نہیں تھا۔

نواحِ سنجیرانؒ (جسے مترجم موصوف نے پنج جرن تحریر فرمایا ہے ص ۱۱۳) کے
حاکم ذوالنون بیگ ارغون کو ص ۱۱۳ اور ۱۱۴ پر "ذالنون ارغن" لکھا ہے جسے
تصحیف کاتب پر محمول نہیں کیا جا سکتا ہے، خاکسار راقم ڈاکٹر رفعت بلگرامی
صاحب کی شخصیت سے متعارف نہیں لیکن گمان غالب ہے کہ وہ اردو
ادب کے فاضل ضرور ہوں گے اور ان کی بیاض ذہنی میں "ذوالنون" کی مناسبت

سے لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے درج ذیل اشعار ضرور محفوظ ہوں گے:

نون تنہا کو میں ہے کیوں میم سے لکھتے ہیں لوگ
مدتوں تک میں نہیں سمجھا تھا اس مضمون کو
آج لٹریری لطیفہ یہ سنا اک دوست سے
میم نے ماہی کے نگلا حضرت ذوالنون کو

اور ولی کامل حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے اسم مبارک سے کون واقف نہیں۔ ص ۱۱۴ پر سلطان پشتوئی کو "سلطان یاشائی" ص ۱۱۵ پر تنگر قلی کو "تنگری بردی" کتہ بیگ کو ص ۱۱۷ پر "کیبا" سونارک ترکمان کو "سندوک ترکمان اور آقی کو اسی صفحہ پر "آہی" لکھا ہے۔ نیز بایسنغر مرزا کو اکثر و بیشتر صفحات پر "بایستغر" رقم کیا ہے۔ ص ۱۳۳ پر شاہ رخ اور خان افشار کو ایک ہی شخصیت خیال فرماتے ہوئے شاہ رخ خان افشار، ص ۱۴۸ ر حاشیہ ۲ پر رش ہرک ولیمس کو "رشید ک ولیم" بابا قشقہ کو ص ۱۵۵ پر مضحکہ خیز حد تک "بابا کشہکہ" اور ص ۱۹۱ پر "کشکا" بنا دیا ہے۔ ص ۱۷۰ و ۱۷۱ پر نام صحیح نہیں لکھے گئے، جنہیں یہاں لکھنا موجب تطویل ہوگا۔ ص ۱۷۷ و ۱۹۰ پر "فرملی" کا املا "فارمولی" ص ۱۸۵ پر عبد العزیز میر آخور (داروغہ طویلہ) کو میر آخر اور ص ۱۹۱ پر قوام بیگ و تردی بیگ کو علی الترتیب خوان بیگ و تردیکا، ص ۲۱۸ پر مولانا فرغلی کو "پرغری" (؟ فرغی) ارقام فرمایا ہے یعنی قوسین میں کی گئی اصلاح خود محتاجِ اصلاح ہے۔ ہرات کے باشندہ کو از روئے قاعدہ "ہروی" کہتے ہیں مگر فاضل مترجم نے "مقیم ہروی" کو ص ۲۲۱ پر "ہراوی" کر دیا ہے۔ ص ۲۳۴ پر بابر کے توغچی یعنی نشان بردار "خدابیردی" کو خدابردی" تحریر فرمایا ہے۔ ترکی زبان میں "بیردی" بمعنی دیا ہوا ہے۔ یعنی خدابیردی بمعنی اللہ داد یا خداداد۔ ص ۲۴۳ پر لفظ مصطفےٰ کا املا "مصطفا" اور ص ۱۶۳ و مابعد شوریٰ کو "شورا" ارقام فرمایا ہے معلوم نہیں ان الفاظ سے الف مقصورہ کو کیوں حذف کر دیا ہے۔ اعلا و ادنا تو آج

کل اکثر دیکھنے میں آتا ہے مگر "مصطفا" اور "شورا" ہمارے محدود مطالعہ میں پہلی دفعہ نظر سے گذرا۔ ص ۹۷ پر "کیچک علی" کو کچک علی اور اکثر صفحات پر علی دوست "طغائی" بیں "طغائی" کو طقائی لکھا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے اصل مصادر و مراجع مثلاً بابرنامہ، ہمایوں نامہ، اکبرنامہ نیز دیگر عصری کتب تواریخ سے مراجعت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

ص ۱۴۲ و ۱۶۴ پر خادم الحرمین شریفین سلطان سلیم اول ۹۱۸ھ تا ۹۲۶ھ (۱۵۱۲ء تا ۱۵۲۰ء) کو "سلطان سلیم سنگدل" لکھا ہے جو یقیناً رشبروک ولیمز کی عبارت کا ترجمہ ہوگا۔ مگر واضح ہو کہ یہ "سنگدل" فرمانروا اپنی تمام تر "سنگدلی و سفاکی" کے باوجود رعایا میں نہایت مقبول اور ہردلعزیز تھا اور اس کا اصول جہانبانی و طرزِ عمل مجرم افراد کے لئے ظلم کا حکم رکھتا تھا تو وہی رعایا کے حق میں رحمت بن گیا تھا۔ ایسے فرمانروا کو اپنے فطری عناد و نفرت کے سبب یوروپین مورخ و مستشرقین ضرور مورد الزام قرار دیں گے لیکن فاضل مترجم کو لفظ "سنگدل" کے خلاف حاشیہ میں تشریحی نوٹ ضرور لگانا چاہیئے تھا جیسا کہ بعض صفحات پر فوٹ نوٹس ارقام فرمائے بھی ہیں۔ مگر افسوس کہ آلِ عثمان کے اُس سلطان کے بارے میں جس نے سب سے پہلے خادم الحرمین شریفین کا لقب اختیار کیا، ہمیں کوئی تشریحی نوٹ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

لیکن ہم ان کی خدمات جلیلہ کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔

ص ۱۰۸ و ۱۳۲ پر "تابعین" کی اصطلاح استعمال فرمائی گئی ہے جو نہایت حیرت انگیز ہے کیونکہ یہ اصطلاح صرف اُن حضرات کے لئے مخصوص ہے جو حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے صحبت یافتہ تھے کسی دیگر شخص کے رفقاء و ہم جلیس کے لیے اس اصطلاح کا اطلاق درست نہیں۔

ص ۱۱۲ پر شر انگیز کے بجائے "شر آفریں" کا استعمال بھی محلِ نظر ہے۔ ترکی میں برادرِ رضاعی (Foster Brother) یعنی دودھ بھائی کو کوکلتاش (کوکہ) کہتے ہیں، یعنی وہ دو بچے جنہوں نے ایک ہی دایہ (اَنّا) کا دودھ پیا ہو۔ مگر اس لفظ [illegible] نے ص ۵۳، ۵۷، ۵۸ نیز صنٹ ۱۷ پر "کوکلتش" اور ص ۷۷، ۸۹، [illegible] ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳ پر "کلکدش" نیز ص ۱۵۵ پر "کاکلتش" [illegible] ہے۔ موصوف تاریخ کے نہ سہی اُردو زبان وادب کے فاضل ضرور [illegible] اور اُردو ادب میں "تاش" کے لاحقہ سے مرکب "خواجہ تاش" [illegible] ہے جیسا کہ سید انشاء اللہ خاں انشا متوفی ۱۲۳۳ھ نے فرمایا ہے ؎

ہم کو مصاحبوں سے ہے آپ کے کیا برابری
ہم ہیں کمینہ اک غلام فرقۂ خواجہ تاش کے

اسی ترکی لفظ تاش سے کوکلتاش مرکب ہے۔

اکثر و بیشتر مقامات کو بھی درست املا کے ساتھ مندرج نہیں فرمایا گیا ہے مثلاً ص ۹۷ پر مقام "کول" کو کوئیل ص ۱۱۵ پر "خوال قولی" کو خوال قوتی (مبارک غار) ص ۱۱۸ پر "یکہ اولانگ" کو "یاکا اولنگ" نیز اسی صفحہ پر ... "جلگدلگ" کو جنگ لیک" دریائے گنڈک کو نقشہ ص ۱۲۸ میں "گونڈک" دریائے آمو کو ص ۱۳۱-۲ پر "امو" ص ۱۴۶ کے جدول کالم نمبر ۲ پر .. "بھیرہ" کو "بھیڑہ" ص ۱۱۷ پر "خوشاب" کو خوش آب اور سوائی مادھوپور ضلع کے قصبہ کھنڈار کو ص ۱۷۹ پر "کندر" لکھا ہے یہ وہی قصبہ ہے جہاں اُردو کے مشہور شاعر ظہیر الدین دہلوی تلمیذ ذوق دہلوی ایک عرصہ تک تھانیدار (کوتوال) رہے تھے۔ ص ۱۵۱، پر ۱۵۳۰ء کے ہندوستان کے سیاسی نقشہ میں جے پور کے جائے وقوع کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو باعثِ تعجب ہے کیونکہ جے پور کو .. ۱۷۲۷ء میں سو سال بعد بسایا گیا ہے۔ مذکورۃ الصدر نقشہ میں دراصل جے پور کی بجائے انبیر ہونا چاہیئے تھا۔ ص ۲۰۸ پر ہندوستان کے مشہور قلعہ رنتھنبور ...

دسوائی مادھوپور) کو "رتھنبور" ارقام فرمایا ہے نیز مقام "اورا تیبہ" کو جا بجا...
"اوراتیپہ" ص ۶۹ نیز صفحات مابعد پر مرغینان کو "مرغیلان" ص ۳۴ پر
اتر پردیش کے مشہور قصبہ مارہرہ کو "مارہر" ص ۳۸ کے نقشہ میں تندوز کو
"تندوج" اور مرغینان کو "مرغوان اور قصبہ اسفرہ (اسفرائن) کو ص ۴۵ پر..
"اصفرہ" رقم کیا ہے۔ ص ۴۲ و ۵۳ پر دریائے سیحوں کو "سیمون" ممکن ہے یہ
سہو کاتب ہو۔ دیگر بہت سے مقامات کی صحتِ املا بھی مشکوک ہے امام ابو عیسیٰ
محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ) کی ذاتِ گرامی
اور اُن کی جامع ترمذی شریف سے کون اُردو خواں ہے جو واقف نہ ہو،
آپ کا وطن مالوف قصبہ ترمذ ہی تھا مگر ہمارے فاضل مترجم نے اس مردم
خیز قصبہ کا املا ص ۵۹ پر زائے معجمہ کے ساتھ (ترمز) ارقام فرمایا ہے۔
ص ۵۵ پر ایک جگہ حسن بن یعقوب اور دو تین سطروں کے بعد حسن یعقوب
تحریر کیا ہے جو درست ہے۔ ص ۷۰ پر مشہور نقشبندی بزرگ دولی کامل حضرت
خواجہ عبیداللہ احرار جن کی خدمت میں بابر کا دادا سلطان ابوسعید مرزا پاپیادہ
حاضر ہوا کرتا تھا اور اُن کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا کو بجائے
احرار کے قوسین میں احراری کر دیا ہے۔ ص ۷۶ پر مقام "یورت خان" کو
"خان یورتی" اور "یار ایلاق" کو اسی صفحہ پر "یاز یلاق" ثبت کیا ہے دراصل
ایلاق ترکی زبان میں اس مقام کو کہتے ہیں جہاں امراء و روٴسا موسم گرما گذارتے
ہیں برخلاف قشلاق کے کہ یہ موسم سرما کی چھاؤنی ہوتی ہے۔ ص ۷۷ پر ایک
فقرہ "شیخ مصلحت نے (سمرقند) دے دیا ہے" پڑھنے کو ملتا ہے۔ یہ فقرہ
"شیخ مصلحت بیردی" کا ترجمہ ہے جو درست نہیں کیونکہ "شیخ مصلحت
بیردی" کا ترجمہ "تمہارا شیخ تم کو صلاح دیتا ہے" ہوگا نہ کہ شیخ مصلحت نے
سمرقند دے دیا ہے۔ یہ بابر کے ایک خواب کا واقعہ ہے جس میں حضرت خواجہ
ناصر الدین عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ نے بابر سے مذکورہ فقرہ بطور بشارت

کے کہا تھا، جس کے چند روز بعد ہی بابر نے سمرقند فتح کرلیا۔ ص ۸۶ پر شیباق خان پیادہ کو "شیبق خاں نیز ص ۳۲ پر شاہو خیل کو "شاہو خیلی"، ص ۳۲ پر "مشرقی بادشاہ" اور "مشرقی سلطنت" کی بجائے "شرقی بادشاہ (سلطان) اور شرقی سلطنت ہونا چاہیئے۔

خواجہ عماد الدین محمود قاواں جو "کاواں یا گاواں" کے نام سے مشہور ہے اور جو بہمنی سلطان محمد شاہ ثانی متوفی ۸۸۷ھ کا وزیر باتدبیر اور مقتدین الانسان تھا اور جسے امراء کی سازش کا شکار ہو کر محمد شاہ ثانی نے ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء میں قتل کرادیا۔ ص ۲۶ حاشیہ ۲ پر اس جامع کمال شخصیت کے سال سنوح قتل کے دو تاریخی مادے بھی دیے ہیں۔ اول "قتل ناحق" اور دوئم "بے گناہ محمود شہید شد" اور دونوں ہی مادوں سے مطلوبہ اعداد ۸۸۶ برآمد نہیں ہوتے پہلے مادہ کے اعداد کا میزان صرف ۶۸۹ ہوتا ہے اور دوسرے مادے سے ۸۰۹ھ برآمد ہوتے ہیں چنانچہ دوسرا مادہ یہ ہونا چاہیئے "بے گنہ محمود گاواں شہید شد" (۸۸۶ھ) فاضل مترجم اگر ملا عبدالکریم ہمدانی کی تصنیف سے مراجعت فرمالیتے، جو خواجہ گاواں کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات پر مشتمل ہے، تو بہتر تھا، راقم کے محدود ذاتی ذخیرہ میں گاواں پر کوئی تصنیف نہ ہونے کے سبب پہلے مادہ کی درستی سے معذوری ہے۔

ص ۱۱۶ پر مثل "مرگ انبوہ جشنے دارد" کا استعمال اُس واقعہ کے تناظر میں کیا ہے جب بابر مع اپنے ساتھیوں کے تیز و تند برف باری میں رات کے وقت گھر گیا تھا اور امراء نے اُس سے اصرار کیا کہ آپ غار میں چھپ جائیں، مگر اُس نے اپنی فتوت و مروت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ہمراہیوں (لشکریوں) کو کھلے میں چھوڑ کر غار میں جانا کسی طرح پسند نہ کیا اور امراء سے کہا کہ "مرگ بیاراں عید است" جو اُس کے مافی الضمیر کو مکمل طور پر ادا کرتی ہے اس فارسی ضرب المثل کے مقابل مترجم موصوف نے جو مثل استعمال فرمائی ہے وہ راقم کے نزدیک دوسرے

مفہوم کو ادا کرتی ہے جو نیر د جیسے ظالم پر تو صادق آتی ہے مگر بابر پر نہیں۔ ص ۱۲۷ار پر یہ فقرہ ....."اس کی عملی قوتوں کے لئے کوئی دوسری نکاس کی راہ نہ تھی" محل نظر ہے بالخصوص لفظ "نکاس" کے استعمال کے لئے کیا کہا جائے۔ ع

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے

ص ۴۸ ا پر قبیلہ (قوم) گکھڑ کو "ککر" لکھا گیا ہے۔ ص ۶۴ ا پر ایک لفظ "واحدوں" بھی پڑھنے کو ملتا ہے جو غالباً "اکائیوں" کا مترادف ہے جو درست ہو سکتا ہے مگر خاکسار کے مطالعہ میں پہلی دفعہ آیا۔ بابر کو ابراہیم لودی کی ماں نے احمد چاشنی گیر (بکاؤل) کے ذریعہ سازش کر کے کھانے میں زہر دلوایا" اس سلسلہ میں کھانے کا ذکر کرتے ہوئے ص ۱۸۲ پر ایک فقرہ اس طرح لکھا ہوا ہے: "مجھے (بابر) خرگوش (کے گوشت) کا بڑا شوق تھا اس وجہ سے میں نے تھوڑا سادہ بھی کھا لیا اور بہت سی تلی ہوئی گاجریں بھی —" معلوم نہیں یہ "تلی ہوئی گاجریں" شاہی دسترخوان پر کہاں سے آگئیں ورنہ دسترخوان پر اس روز خرگوش کا گوشت انڈوں کا قلیہ اور قاق چنا گیا تھا۔ اور یہ "تلی ہوئی گاجریں" قاق ہی کا ترجمہ کیا ہے جب کہ اس ترکی لفظ کے معنی ہیں — وہ سکھایا ہوا گوشت جسے گھی میں تل کر کھاتے ہیں۔ صفحہ ۲۲۰ پر اصطلاح "محرور المزاجی" شاید تندخوئی، گرم مزاجی و بدمزاجی کے بطور استعمال فرمائی گئی ہے۔

ص ۱۸ پر یہ فقرہ "— ایک عمر غیر معقول و بے ہست —" بعید از فہم ہے۔ اسی صفحہ پر اس فقرہ "اس تمام ظاہری امثال کی تہہ میں وہ عناصر الخ میں لفظ .. "امثال" کی بجائے "تمثیل" کا استعمال بہتر رہتا۔ ص ۳۴ پر اس فقرہ "..عمر شیخ مرزا جو کہ احتیاط اور اخلاقی ارتیاب کا مادہ کم رکھتے تھے" جن میں لفظ ارتیاب (شک کرنا) کے استعمال کا کون سا محل ہے۔ اسی طرح ص ۱۹۴ پر اسی فقرہ میں "..دشمنوں کے ہجوم میں سے ایک موت کا راستہ توڑ نکالا" خط کشیدہ فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کئی ہوتی ہیں۔ اب تک تو یہی سننے میں آیا تھا کہ موت ایک ہی ہوتی ہے اور

ایک دفعہ ہی آتی ہے نیز "توڑ نکالا" بھی عجیب بات ہے۔ اُردو میں dealt ہوتے ہی نہیں لہٰذا موت سے قبل ایک (d) لکھنا بے معنی بات ہے۔ ص ۱۹۶ پر یہ فقرہ بھی قابل غور ہے، "اب تک تو تصرف ہندوستان کو بابر کی مہم جو یانہ زندگی کا صرف ایک ضمنی واقعے سے تعبیر کیا جا سکتا تھا..." نیز ص ۲۰۷ پر دادین میں یہ فقرہ بھی مضحکہ خیز ہے، "بے الگ، فردہ گیرانہ اور شفقت آمیز" کہا گیا ہے اور ص ۲۱۰ پر بابر کے اپنے دوستوں کو تحائف بھیجنے کے سلسلے میں یہ فقرہ بھی قابل توجہ ہے، "سکھ اور ہوشیار سے ہیرے ساتھ آئے تھے" یعنی سکھ اور ہوشیار دو مقامات کے نام ہوئے جب کہ بابر اپنے سکھ دکھ میں شریک اپنے احباب کو یاد کر رہا ہے۔ یہ چند فقرات بطور نمونہ از خروارے پیش کیے گئے ہیں ورنہ اکثر صفحات میں اس طرح کے فقروں سے پالا پڑتا ہے۔ البتہ بعض مقامات پر ترجمہ بہ اعتبار فن نہایت عمدہ کیا ہے جس کی تعریف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔

ص ۸۲ پر "دشمنوں و دوستوں" ص ۸۸ پر "چٹانوں و پتھروں" نیز دیگر [illegible] صفحات پر بطور حرف ربط "واو" کا استعمال مناسب نہیں بلکہ کیونکہ دشمن [illegible] دوست، چٹان اور پتھر کی جمع اردو قاعدہ پر بنائی گئی ہیں لہٰذا "واو" کی بجائے [illegible] "اور" کا استعمال ہونا چاہیئے تھا البتہ فارسی قاعدۂ جمع کی رو سے [illegible] "دشمنان و دوستاں" درست تھا۔ ص ۱۰۷ پر "طویل الحافظہ" کی نادر اصطلاح [illegible] ملی۔ حافظہ کے طول و عرض کو ناپنے میں آج تک نہ تو کوئی ڈاکٹر ہی کامیاب [illegible] ہوا ہے اور نہ کوئی ماہر ریاضی داں ہی۔ اس موقع پر لسان العصر اکبر الہ آبادی کی یاد [illegible] نہیں رہتی۔ جنہوں نے کہا تھا ؎

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجیئے

[illegible] اکبر الہ آبادی کی طولِ شبِ فراق کو کسی ریاضی داں شاعر المتخلص [illegible] نے ناپ کر بتلا دیا تھا ؎

طولِ شبِ فراق جو ناپا گیا غریب
دو چار ہاتھ کم ہوا لیلیٰ کی زلف سے

فقرہ یہ ہے، "کسی بھی طویل الحافظ بوڑھے شخص کو یاد نہ تھا کہ کوئی شخص اس درہ کو ایسی گہری برف میں پار کرتے سنا گیا ہو...." اس کے علی الرغم تزکِ بابری (اردو) ص ۱۹۸ پر یہ فقرہ اس طرح لکھا ہوا ملتا ہے "کسی بوڑھے بڑے کو یاد نہیں ہے کہ اس پہاڑ میں سے ایسے وقت میں کہ اتنی برف پڑتی ہو کوئی صحیح سلامت نکل گیا ہو"۔ ص ۹۴ پر "عزت نفسی" کی بجائے "عزت نفس" کافی تھا۔ ص ۹۲ حاشیہ عـ۱ پر روضۃ الصفا اور ص ۱۳۲ و ۱۴۲ کے حواشی میں تاریخی رشیدی کے صفحات نمبر محذوف ہو گئے ہیں نیز ص ۱۰۷ اور دیگر دو ایک صفحات پر حواشی کے نقوش نہیں ابھر سکے ہیں۔

خاکسار نے معیاری انگریزی کتب تواریخ کے ہندی تراجم بھی دیکھے ہیں جو اردو تراجم سے کہیں بہتر ہیں۔ اصل انگریزی تصنیف کے علاوہ اگر فاضل مترجم عصری فارسی تواریخ یا اُن کے ترجمے بھی پیش نظر رکھتے تو زیر تبصرہ تصنیف میں اتنے اغلاط راہ نہ پاتے۔ ادباء کے لئے ادبیات کے بہت سے ابواب طبع آزمائی کے لئے کھلے ہوئے ہیں اس لئے کیا ضروری ہے کہ وہ تاریخی کتب کے ترجمے ہی کریں یا تاریخ ہی لکھیں۔ لہٰذا کارپردازانِ ترقی اردو بیورو سے ہماری پُرخلوص درخواست ہے کہ وہ جس فن کی بھی کلاسیکی تصنیف کا ترجمہ کرائیں، اُسے صرف اُسی فن کے فاضل سے کرائیں تاکہ ترجمہ معیاری ہو سکے ورنہ اُردو کا دامن بجائے مالامال ہونے کے تنگ ہی ہوگا۔

تعلیقات و حواشی:— ۱ۓ زیر تبصرہ تصنیف کا پیش لفظ ص۳، از جناب ابوالفیض سحر صاحب

۲ۓ۔ ملاحظہ ہو راقم کا تاریخ جہانگیر پر تبصرہ شمولہ ماہنامہ معارف ماہ نومبر ۱۹۸۲ء ص ۳۴۶ تا ۳۶۹۔

۳ۓ۔ دیکھئے مقالہ "پنڈت نہرو مترجم کی حیثیت سے" از جناب مشیر الدین قریشی شمولہ سہ ماہی نخلستان ادب، پور جلد عـ۱ شمارہ عـ۲ سنہ ۱۹۶۷ء ص ۴۶۔

۴ۓ۔ بابر نامہ اُردو، ص ۱۹۶ مترجم مرزا نصیر الدین حیدر گورگانی بابری مطبوعہ سنہ ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء، مطبع ... [illegible]

برہان

جلد ۱۰۷	مئی ۱۹۹۱ء مطابق ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ	شمارہ ۵

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۱۲ر مئی ۱۹۸۴ء کو ملتِ اسلامیہ کی عظیم و مخلص ہستی مفکرِ ملت حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی وفات نے عالمِ اسلام خصوصاً مسلمانانِ ہند کے درمیان میں ایسا خلاء پیدا کیا ہے کہ جو ابھی تک پورا نہ ہو سکا۔ اس سال ان کی ساتویں برسی کے موقع پر ان کی یاد میں ایک دعائیہ اجتماع کے موقع پر مولانا فقیہہ الدین نے بالکل بجا کہا ہے کہ:

”اس دورِ پرفتن میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی ضرورت واہمیت بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔“

حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ انتہائی متین اور حد درجہ مخلص ہمدردِ قوم تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ہی ملت کے مفاد کو اولیت کا درجہ دیا۔ ذاتی غرض وحمایت کا ان میں فقدان تھا۔ ان کے پرانے قریبی ساتھی جو ابھی ماشاءاللہ حیات ہیں یہ بات بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ آزادی کے بعد ملت اسلامیہ کے ناگفتہ بہ حالات کے پیشِ نظر سخت پریشان رہتے تھے۔

ان ہی حالات نے ان کو باوجود ضعیف العمری کے میدانِ سیاست میں بھی متحرک رکھا۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ، شیخ الاسلام حضرت مولینا حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہؒ، سحبان الہند مولینا احمد سعیدؒ اور مجاہد ملت مولینا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کی وفات کے صدمہ نے ملتِ اسلامیہ ہند کو جس طرح یتیم بنا دیا تھا اس صدمہ کی موجودگی میں مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی شخصیت کے

موجودگی ملتِ اسلامیہ ہند کے لئے بڑی ہی غنیمت تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی ذمہ دارانہ قیادت سے ہمیشہ ہی ملت اسلامیہ کا بھلا ہی کیا۔ اپنی جوانی انھوں نے عالم اسلام کے لئے ایک ممتاز علمی اور دینی ادارہ ندوۃ المصنفین کی تعمیر وبقاء کے لئے جد وجہد و مساعی جمیلہ میں لگائی اور باقی تمام عمر ادارہ ندوۃ المصنفین کی تعمیر وبقاء کے ساتھ ملتِ اسلامیہ ہند کی خدمت میں قربان کردی۔

ملک میں جب سیکولرازم کو چیلنج کرنے کے لئے فرقہ پرست طاقتوں نے کمر کسنی شروع کی اور ملت اسلامیہ ہند کو سخت مشکلات سے دو چار کیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے کانگریس کے بڑے پرانے رہنما ڈاکٹر سید محمودؒ کے اشتراک سے مسلمانانِ ہند کو ہندوستان میں ... پرسکون اور باعزت مقام کے حصول کے لئے جہادی طور پر کام شروع کردیا مجلس مشاورت کے قیام کا مقصد و نصب العین ملت اسلامیہ ہند کی فلاح وبہبودگی اور صحیح سوچ وسمجھ کے لئے ہی عمل میں آیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمودؒ کی وفات اور پھر ان ہی کی ٹکر کے ایک اور مخلص ہمدرد قوم ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی کی رحلت کے بعد حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق حکومت اور برادرانِ وطن سے منوانے کے لئے تنِ تنہا ہی میدان میں ڈٹے رہے۔ اپنی زندگی کے آخری سانس تک وہ ہندوستانی مسلمانوں کی رہبری ورہنمائی اور ہمدردی و فلاح وبہبودگی کے عظیم الشان کارہائے نمایاں انجام دینے میں لگے رہے۔ ان کی ناگہانی موت کے بعد۔ سات برس ہو گئے ہیں اب ڈھونڈنے سے بھی ان جیسا سچا ہمدرد، رہبر و راہنما ہندوستانی مسلمانوں کو نصیب نہیں ہوا۔

خداوند تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے مخلص وہمدردِ ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کو۔ ا۔

وسط مدتی انتخابات کے دوران میں مدراس کے ایک انتخابی جلسہ میں تقریر کے پروگرام سے کچھ دیر پہلے ہی ہندوستان کے سابق وزیر اعظم اور انڈین نیشنل کانگریس کے

نظرات

۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء کو ملّتِ اسلامیہ کی عظیم و مخلص ہستی مفکرِ ملّت حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی وفات نے عالمِ اسلام خصوصاً مسلمانانِ ہند کے درمیان میں ایسا خلاء پیدا کیا ہے کہ جو ابھی تک پورا نہ ہو سکا۔ اس سال ان کی ساتویں برسی کے موقع پر ان کی یاد میں ایک دُعائیہ اجتماع کے موقع پر مولانا فقیہہ الدین نے بالکل بجا کہا ہے کہ :

"اس دورِ پرفتن میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی ضرورت واہمیت بڑی شدّت سے محسوس ہو رہی ہے۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ انتہائی متین اور حد درجہ مخلص ہمدردِ قوم تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ہی مِلّت کے مفاد کو اولیت کا درجہ دیا۔ ذاتی غرض و غایت کا ان میں فقدان تھا۔ ان کے پرانے قریبی ساتھی جو ابھی ماشاء اللہ حیات ہیں یہ بات بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ آزادی کے بعد ملّت اسلامیہ کے ناگفتہ بہ حالات کے پیشِ نظر سخت پریشان رہتے تھے۔

اُن ہی حالات نے ان کو باوجود ضعیف العمری کے میدانِ سیاست میں بھی متحرک رکھا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ، شیخ الاسلام حضرت مولینا حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہؒ، سحبان الہند مولینا احمد سعیدؒ اور مجاہدِ ملّت مولینا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کی وفات کے صدمہ نے مِلّت اسلامیہ ہند کو جس طرح یتیم بنا دیا تھا اس صدمہ کی موجودگی میں مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی شخصیت کے

سوجھ بوجھ ملّت اسلامیہ ہند کے لئے بڑی ہی غنیمت تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی ذمہ دارانہ قیادت سے ہمیشہ ہی ملت اسلامیہ کا بھلا ہی کیا۔ اپنی جوانی انھوں نے عالم اسلام کے لئے ایک ممتاز علمی اور دینی ادارہ ندوۃ المصنفین کی تعمیر وبقاء کے لئے جدوجہد وسائی جمیلہ میں لگائی اور باقی تمام عمر ادارہ ندوۃ المصنفین کی تعمیر وبقاء کے ساتھ ملّت اسلامیہ ہند کی خدمت میں قربان کردی۔

ملک میں جب سیکولرازم کو چیلنج کرنے کے لئے فرقہ پرست طاقتوں نے کمرکسنی شروع کی اور ملّت اسلامیہ ہند کو سخت مشکلات سے دوچار کیا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے کانگریس کے بڑے پرانے رہنما ڈاکٹر سیّد محمودؒ کے اشتراک سے مسلمانان ہند کو ہندوستان میں . . . پُرسکون اور باعزت مقام کے حصول کے لئے جہادی طور پر کام شروع کردیا مجلس مشاورت کے قیام کا مقصد ونصب العین ملّت اسلامیہ ہند کی فلاح وبہبودگی اور صحیح سوچ وسمجھ کے لئے ہی عمل میں آیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمودؒ کی وفات اور پھر ان ہی کی ٹکّر کے ایک اور مخلص ہمدرد قوم ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کی رحلت کے بعد حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق حکومت اور برادران وطن سے منوانے کے لئے تن تنہا ہی میدان میں ڈٹے رہے۔ اپنی زندگی کے آخری سانس تک وہ ہندوستانی مسلمانوں کی رہبری ورہنمائی اور ہمدردی وفلاح وبہبودگی کے عظیم الشان کارہائے نمایاں انجام دینے میں لگے رہے۔ ان کی ناگہانی موت کے بعد۔ سات برس ہوگئے ہیں اب ڈھونڈنے سے بھی ان جیسا سچا ہمدرد رہبر ورہنما ہندوستانی مسلمانوں کو نصیب نہیں ہوا۔

خداوند تعالیٰ جنّت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے مخلص وہمدرد ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کو۔ا ـــ

وسط مدتی انتخابات کے دوران میں مدراس کے ایک انتخابی جلسہ میں تقریر کے پروگرام سے کچھ دیر پہلے ہی ہندوستان کے سابق وزیراعظم اور انڈین نیشنل کانگریس کے

بمبان دہلی

صدر جناب راجیو گاندھی ایک بم دھماکے میں لقمۂ اجل ہو گئے۔

اس وسط مدتی انتخاب کے بارے میں جہاندیدہ دانشورانِ ملک اور خود مقتول...
راجیو گاندھی یہ خدشہ ور لئے ظاہر کر رہے تھے کہ اس وسط مدتی انتخاب میں زبردست تشدد کا امکان نظر آ رہا ہے یہ کس کو معلوم تھا کہ جس تشدد کے امکان کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ ملک کی اس عظیم ہستی ہی کو اپنی منحوس لپیٹ میں لے لیگا۔ مگر انہونی ہو کر رہی اور ملک ایک ایسے رہنما سے محروم ہو گیا جو دورِ حاضر کا ہیرو تھا اور مستقبل کی روشن قندیل، اور جس سے ملک د کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

جناب راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل میں کس پارٹی، کس گروہ، کس ملک یا کس فرد کا ہاتھ ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے ابھی تک کسی نے اس کی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے۔ عام طور پر ایل۔ٹی۔ٹی دہشت پسندوں پر شک ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے لئے اخبارات کی اطلاع کے مطابق کچھ ٹھوس ثبوت بھی جائے واردات سے ملے ہیں جو عورت اپنے جسم پر بم باندھ دلپیٹ کر خود بھی ہلاک ہوئی ہے اور جناب راجیو گاندھی کے ساتھ اور دوسرے تیرہ افراد کو ہلاک کرنے کا باعث بنی ہے اس کے متعلق بھی عام قیاس یہ ہی ہے کہ وہ ایل ٹی ٹی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر ابھی یہ سب قیاس آرائیاں ہی ہیں، یقین و قطیعت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ حکومتِ ہند نے تمام حادثۂ قتل کی تحقیقات کے لئے بیک وقت ایک کمیشن بنا دیا ہے جو عرصہ تین ماہ میں اس سلسلے میں اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ اس سے پہلے جو بھی اس سلسلے میں اظہارِ خیال کریگا وہ صرف قیاسات ہی کے زمرے میں ہوگا اور حقیقت و یقین کا گمان کرنا عبث ہی ہوگا۔

اعظم ۱۹۸۹ء میں ہندوستانی عوام نے جس جوش کے ساتھ غیر کانگریس حکومت کے
الرحمٰن قیام میں ووٹ سے تعاون دیا تھا اسے غیر کانگریسیوں نے آپسی گروہ بندی اور اپنی
اسر پارٹی مفاد میں پڑ کر ناکارہ کر دیا اور جو ملک کے لئے خطرہ کا سگنل بن کر رہ گیا۔ مختصر مت...

دد بارہ انتخاب نے ملک کی معیشت پر جو بوجھ ڈالا ہے اس کے اثرات کا تو انتخاب کے بعد ہی عوام کو اندازہ ہوگا اور جو اس قدر بھیانک ہوگا جس کا قبل از وقت تصور ہی ملک کے بہی خواہوں کے ہوش اڑا رہا ہے ۔ راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل نے ایک اور خطرہ ملک کے سامنے پیدا کر دیا ہے اور وہ ہے انڈین نیشنل کانگریس میں انتشار کا ' سیکولرزم کے زوال کا ' سیکولرزم ویسے بھی کانگریس کے لئے صرف انتخاب کے دوران میں اقلیتوں کے بہلانے کے لئے ایک چمکدار شیئ بن کر اور جس کا عمل سے برائے نام ہی واسطہ رہ گیا تھا ۔ راجیو گاندھی کے قتل کے بعد تو لفظ سیکولرزم ہی کے قائم رکھنے کے لالے پڑ جائیں گے ۔

اس وسط مدتی انتخاب میں تشدد کیوں زیادہ دکھائی دے رہا ہے ۔ اسے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے آزادیٔ ملک کے محسنوں کو بھلا کر ایسے لوگوں نے میدانِ سیاست میں آ کر اپنی چودھراہٹ قائم کر لی ہے جو مذہب کی آڑ میں کھوکھلے نعروں سے اس ملک کے عوام میں مقبولیت چاہتے تھے اور اس میں انھیں طاقت و قوت یقیناً ایسے لوگوں سے بھی ملی جو اپنے بھاری بھرکم وجود سے کانگریس کے اندر براجمان تھے لیکن ان کا دل مخصوص فرقہ ... کا طرفدار و ہمدرد تھا ، سیکولرزم ان کے دل کے کسی گوشہ میں بھی جگہ نہ پائے ہوئے تھا چنانچہ ... اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک مسجد آناً فاناً جنم بھومی میں تبدیل ہو گئی اور اس کے اندر ہی اندر ... عرصۂ دراز تک ایک پودے کی طرح پرورش کی گئی اور جب اسے " پھل " دینے ... قابل سمجھا گیا تو اسے انتخاب کے بازار میں ' حصولِ ووٹ ' کے لئے لے آیا گیا ۔ یہ ... کے منہ پر زبردست کلنک ہے جس پر ان کانگریسیوں کو دکھ ہے جنھوں نے ... کے پلیٹ فارم سے ملک و قوم کے لئے واقعی مخلصانہ قربانیاں دی ہیں آج کانگریس ... خواہوں کی جگہ ..... آماجگاہ بنی ہوئی ہے

بہرحال راجیو گاندھی کا حادثۂ قتل ...

ہیرو ملک وقوم کے مفاد پر قربان ہوگیا۔ یہ ملک کا سپوت اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو سیکولرزم کی آن و شان میں یقین رکھتا تھا۔ ملک وقوم کو سالہاسال اس صدمہ سے چھٹکارا نصیب نہ ہوگا۔ ہمارے خیال میں راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل کا ایک محرک وہ بھی ذمہ دار ہے جس کی نہرو گاندھی خاندان سے ازلی دشمنی ہے۔ ایک مخصوص فرقہ پرست پارٹی (جو وقتاً فوقتاً اپنے نام بھی بدلتی رہتی ہے) نے اپنی بدنام زمانہ رتھ یاترا کے ساتھ زہریلا و جارحانہ پروپیگنڈہ بھی کیسٹوں میں جاری کیا ہوا تھا اسی فرقہ پرست پارٹیوں کی دو سادھوی عورتوں نے بے لگام شرانگیز باتوں سے ہندوستانی سماج کو پراگندہ بنانے کا ذمہ اوڑھے رکھا تھا۔ اسی فرقہ پرست جماعت کی دوسری معاون فرقہ پرست پریشد نے (اخبارات کی اطلاع کے مطابق) اپنے کیسٹوں میں راجیو گاندھی کو ہتھوڑے سے مندر کو توڑتے ہوئے پیش کیا جب انتخاب اس طرح کے زہریلے ونفرت انگریز پروپیگنڈہ کے ساتھ لڑے جائیں گے تو پھر اس قسم کے تشدد کے امکان کو خارج کرنا ہی کم عقلی کی بات ہے۔ تحقیقاتی کمیشن کو راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل کے دوران میں ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر بھی اپنی تفتیش کو بڑھانا چاہیئے کیونکہ راجیو گاندھی کے نہ ہونے سے فرقہ پرست طاقتوں کو ہی تقویت ملے گی ملک کے امن پسند اور سیکولر نظریات کے حامل عوام کو راجیو گاندھی کے حادثۂ قتل سے جو زبردست دھچکا لگا ہے وہ بیان وقلم کی زد سے باہر ہے۔

عراق کے صدر صدام حسین کی ہٹ دھرمی، ضد، مفاد پرستی کی وجہ سے عالم عرب بلکہ عالم اسلام کو جو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے اسے ملت اسلامیہ مدتوں خون کے آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے بھی کبھی پورا نہ کرسکے گی۔

جو لوگ خلیجی جنگ کے دوران میں سعودی عربیہ کو پانی پی پی کر کوس رہے تھے آج ان کا سر شرم وغیرت کے مارے جھکا ہوا ہے کیونکہ سعودی عربیہ نے کبھی بھی اسلام اور ملت اسلامیہ کے مفاد کے خلاف کسی طاقت سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے سعودی عرب نے ہمیشہ ہی وہ کیا ہے جو مذہب اسلام کے اور ملتِ اسلامیہ کے مفاد پر مبنی ہے اسلام دشمن

طاقتوں نے سعودی عربیہ کے خلاف کبھی یمن عرب کو کھڑا کیا اور اس کے ذریعہ سعودی عربیہ کے خلاف سازشیں کرائیں اور اب عراق کے ایک ضدی ہٹ دھرم اور اپنے اقتدار کو ہر حالت میں قائم رکھنے والے صدّام حسین نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اسلام کے نام کی آڑ میں اسلام کے خلاف کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر سازشوں و ریشہ دوانیوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے مذہب اسلام کے سچے پیرو کار اور عالم اسلام کے زبردست حامی دبہی خواہ سعودی عربیہ کی تباہی و بربادی کا نشانہ بنانے کا کھیل کھیلا۔ اس ملعون صدام نے خانۂ خدا کے تقدس کا بھی خیال نہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سعودی عربیہ کی مدد کی اور عراق کے اس ظالم حکمراں صدّام حسین کی مذموم سازش کو ناکام بنایا۔

اللہ تعالیٰ ہمیشہ سعودی عربیہ کی حفاظت و مدد فرمائے اور وہاں کے حکمراں شاہ فہد کو ہمّت و استقامت اور نصرت عطا کرے۔

(آمین)

زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں؟

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور ۵۲

الحمدللہ پچھلے ابواب میں پیش کردہ مباحث سے قرآن و حدیث کے نصوص نیز مفسرین و محدثین اور ائمہ کرام کی تصریحات کے ذریعہ علمی جہاد کی نوعیت و اہمیت مُدلّل طور پر اور پورے شرح و بسط کے ساتھ سامنے آچکی ہے اور اس کے متعدد گوشے روشنی میں آگئے ہیں۔ مگر پھر بھی اس سلسلے میں چند مزید پہلوؤں پر بحث باقی ہے۔ اور خاص کر معترض نے جو شبہات اور غلط فہمیاں پیدا کی ہیں اُن کا پردہ بھی چاک کرنا ہے۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے مختصر طور پر اس سلسلے میں چند مزید نکات پیش کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ موضوع ایسا وسیع ہے کہ اس پر کئی دفتر سیاہ کئے جاسکتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اتنی فرصت نہ تو مجھے حاصل ہے اور نہ ہمارے قارئین کو اس لئے اختصار سے کام لینے کی کوشش کی جائے گی۔

جہاد کا شرعی مفہوم

جہاد اور فی سبیل اللہ کے مفہوم و مصداق پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں تفصیلی بحث ہوچکی ہے۔ مگر اس موقع پر ایک نئے نقطۂ نظر سے جہاد و قتال کی حقیقت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

چنانچہ بخاری و مسلم کی ایک حدیث کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ جہاد کا اصل مقصد "کلمۃ اللہ" یا "خدا کی بات" کو اونچا کرنا ہے:

جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اَلرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرٰى مَكَانُهُ، فَمَنْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ:

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ ایک شخص مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے لڑتا ہے، دوسرا شخص ناموری کے لئے لڑتا ہے، اور کوئی شخص [illegible]

کے لیے لڑتا ہے، تو ان میں سے اللہ کی راہ میں کون ہے ؟ تو آپ نے فرمایا کہ جس نے اللہ کی بات اونچا کرنے کی غرض سے جنگ کی تو وہ اللہ کی راہ میں ہے۔[1]

نیز بعض دیگر حدیثوں سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ آپ ہر غزوہ (جنگ) میں پہلے اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے :

مَا قَاتَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَوْماً حَتّٰی دَعَاھُمْ : رسول اللہ صلعم نے کسی قوم سے اُس وقت تک جنگ نہیں کی جب تک کہ آپ نے انہیں (دین کی) دعوت نہ دی۔[2]

امام حاکم نے اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (ھذا حدیث صحیح من حدیث الثوری ولم یخرجاہ)[3]

اور یہی مقصد علم دین کی تبلیغ اور اُس کی نشر و اشاعت کا بھی ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں مقصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اور زبان نبوت نے بتا دیا کہ دین کی تعلیم دینے یا اُس کی نشر و اشاعت کرنے والے بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہیں اور وہ بھی مجاہدین ہی کی طرح ہیں۔ بلکہ بعض حدیثوں کے مطابق مجاہدین (عسکری) سے بھی افضل ہیں۔ جیسا کہ تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ہی طبقوں کے ذریعہ دین و شریعت کے بازو مضبوط ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حدیثوں میں "ہاتھ کے ذریعہ جہاد" کے ساتھ ساتھ "زبان کے ذریعہ جہاد" کرنے کے الفاظ بھی متصلاً مذکور ہیں۔ اس اعتبار سے جہاد اور علم کا تعلق بہت گہرا ہے، جس سے شریعتِ اسلامی میں ان دونوں کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اور ان دونوں میں چولی دامن کا سا ساتھ ہے۔ دونوں کو کسی حال میں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اصل میں ان دونوں کی حیثیت گوشت اور خون کی سی ہے۔ مگر ایک اعتبار سے علمی و قلمی جہاد اصل ہے اور بدنی و جسمانی جہاد اس کی ایک فرع۔ جیسا کہ علامہ جصاص رازی حنفیؒ کی تحقیق

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد ۳/۲۰۶، صحیح مسلم کتاب الامارۃ ۳/۱۵۱۲

[2] سُنن دارمی ۲/۲۱۷، مُسند احمد ۱/۱۳۱، مُستدرک حاکم ۱/۱۵

[3] مُستدرک کتاب الایمان ۱/۱۵، دارالمعرفۃ بیروت

ہے جو اسے آزمانی ہے۔

غرض ان دونوں قسم کے جہاد کو ہر دور میں عصری تقاضوں کے مطابق جاری رہنا چاہئے یعنی جس دور میں جس قسم کا جہاد ضروری ہو اسے آزمانا چاہئے۔ اور اس اعتبار سے حسب ذیل حدیث کے مطابق جہاد ہر دور میں جاری رہ سکتا ہے، خواہ وہ "قتالی" ہو یا "غیر قتالی"۔ یعنی جسمانی جہاد ہو یا علمی و قلمی جہاد:

اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِی اللّٰهُ اِلٰی اَنْ یُقَاتِلَ آخِرُ اُمَّتِی الدَّجَّالَ:

جہاد اُس وقت سے جاری ہے جب سے کہ اللہ نے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، یہاں تک کہ میری اُمت کا آخری فرد دجّال سے دو دو ہاتھ کر لے۔[۴]

بدنی و جسمانی جہاد صدیوں سے مُعطّل ہے اور موجودہ دور میں جنگوں کے بنیادی اغراض و مقاصد ہی بدل گئے ہیں۔ اس لئے موجودہ دور کی جنگیں (جو دراصل قومی و جغرافیائی عصبیتوں کے تحت لڑی جاتی ہیں) جہاد نہیں کہلا سکتیں۔ بلکہ جہاد صرف وہی "قتال" ہوگا جو بخاری و مُسلم کی مذکورۂ بالا حدیث کے مطابق "اعلائے کلمۃ اللہ" کے خالص جذبے کے ساتھ عمل میں آئے۔ لہٰذا اب اگر "لسانی" یا علمی و قلمی جہاد کو اس میں شامل نہ کیا جائے تو پھر اُوپر والی حدیث بے معنی بن جاتی ہے کہ جہاد کو ہر دور میں برابر جاری رہنا چاہئے۔

فقہاء کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد جہاد فرض نہیں رہا۔ اور یہ بات حضرت ابنِ عمرؓ کے اس عمل کی بنا پر ہے جو جہاد کو ترک کر کے حج کی پابندی کیا کرتے تھے۔[۵] مگر جیسا کہ شمس الائمہ امام سرخسیؒ نے مذکورۂ بالا حدیث کے ضمن میں تصریح کی ہے کہ مشرکین کے ساتھ جہاد کا فریضہ قیامت تک باقی ہے[۶] اور مالکیہ کے نزدیک جہاد (قتال) کے لئے امام کا عادل اور قریشی ہونا ضروری ہے۔ یعنی جہاد صرف قریشی امام کے حکم ہی سے بروئے کار آسکتا ہے۔ اور اس معاملے میں غیر قریشی کا حکم نافذ نہیں ہو سکتا۔[۷] لیکن ابوداؤد کی مذکورۂ بالا حدیث

---

[۴] ابوداؤد کتاب الجہاد ۳/۴۰، مطبوعہ حمص (شام)

[۵] دیکھئے احکام القرآن از ابن العربی، ۱/۱۰۳، دار المعرفہ (بیروت)

[۶] المبسوط للسرخسی، ۱۰/۲، مطبوعہ کراچی، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء

[۷] احکام القرآن، قاضی ابوبکر ابن العربی، ۴/۱۷۲۱

ہ میں یہ فقرہ بھی موجود ہے کہ جہاد کرنے کے لئے امام وقت کا عادل ہونا ضروری نہیں ہے:

لَا یُبْطِلُہٗ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ، وَالْاِیْمَانُ بِالْاَقْدَارِ : جہاد کو نہ کسی ظالم کا ظلم باطل کرسکتا ہے اور نہ عادل کا عدل ۔ اب رہا ایمان کا معاملہ تو وہ تقدیر کے مطابق ہوگا۔[۸]

لیکن اس حدیث کی شرح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس حدیث کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جب دنیا میں ظلم عام ہو جائے تو اُن کے ساتھ جہاد جاری ہوسکتا ہے ۔ اسی طرح عدل کفر کے ساتھ عام ہو جائے تو اُن کے ساتھ جہاد جاری ہوگا۔[۹]

اس طرح جہادِ عسکری کو جاری رکھنے کے لئے متعدد اشکالات پیش آتے ہیں۔ جہاد کے فرض ہونے کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر یا خلیفہ موجود ہو۔ یعنی کسی جگہ صحیح معنی میں اسلامی حکومت قائم ہو۔ چنانچہ جہاد کا اعلان خلیفہ یا امیر کرے گا ۔ ورنہ ہر شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جہاد شروع کردے ۔ نیز فقہائے احناف نے لکھا ہے کہ جہاد مُسلمانوں پر عمومی حالات میں فرضِ کفایہ اور ہنگامی حالات میں فرضِ عین بن جاتا ہے۔[۱۰] لیکن یہ صرف ایک نظریاتی قانون ہے اور اس کا وجودِ عملی دُنیا میں صدیوں سے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد اس قسم کی کوئی حکومت مُسلمانوں نے کہیں قائم کی ہو اور اُن کے کسی امیر نے اس قسم کا اعلان کیا ہو؟ چنانچہ قرونِ وسطی سے لے کر آج تک مسلمانوں کی جو بھی حکومتیں قائم ہوئیں وہ سب یا تو "مُلوکیت" کے طرز پر خاندانی حکومتیں رہیں یا موجودہ دور کے لحاظ سے "قومی" حکومتیں، جو مختلف قسم کی (لسانی، تہذیبی اور جغرافیائی) عصبیتوں سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ صحیح اسلامی حکومت کہاں قائم ہے اور "امامت" کا اعلان کس نے کیا ہے؟ لہٰذا فقہائے احناف نے "نفیرِ عام" (ہنگامی حالات)

---

۸ ابوداؤد ۳/۴۰

۹ بذل المجہود، مولانا خلیل احمد ۱۲/۲۲، مطبوعہ مکہ مکرمہ

۱۰ دیکھیئے المبسوط، سرخسی ۱۰/۳، نیز ہدایہ اولین کتاب السیر، ص ۵۳۸-۵۳۹

کی جو شرط لگائی ہے اُس کا وجود واقعاتی دُنیا میں کہیں دکھائی بھی دیتا ہے ؟ تو کیا اب جہاد کی اس "تعطیل" کے بعد "فی سبیل اللہ" کی بھی چھٹی کر دی جائے ؟ یا جہاد کے دوسرے مُقتضاء یعنی علمی و قلمی جہاد پر عمل کیا جائے ؟ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

حاصل یہ کہ جب جہادِ عسکری معطّل ہے تو پھر جہاد کی دوسری شکل یعنی علمی و قلمی جہاد کو جاری رہنا چاہئے۔ ورنہ پھر مذکورۂ بالا حدیث کی صداقت پر حرف آئے گا۔ نیز جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا جا چکا مُسلمان اپنی کمزوری کی حالت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکّی زندگی کو نمونہ اور آئیڈیل بنا کر پُرامن طور پر علمی و استدلالی جنگ جاری رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ غالب پوزیشن میں ہوں تو پھر مدنی زندگی کے اُسوہ کے پیشِ نظر ہتھیاروں کے ذریعہ جنگ کر سکتے ہیں۔ مگر موجودہ بین الاقوامی طور پر دُنیا کی جو صُورتِ حال ہے اُس کے پیشِ نظر اہلِ اسلام کے لئے علمی و استدلالی جنگ ہی زیادہ مُناسب اور بہتر نظر آتی ہے۔

ائمہ حدیث و فقہ کی تصریحات

اُوپر جہاد کی جو شکلیں بیان کی گئی ہیں : یعنی بدنی و جسمانی (قتالی) جہاد اور قولی و علمی (غیر قتالی) جہاد، یہ اُس کی دو اہم ترین قسمیں ہیں۔ ورنہ محققین کے نزدیک جہاد کی اور بھی بعض قسمیں ہیں، جن کی صراحت حافظ ابن حجرؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ نے کی ہے۔ اور علمائے احناف میں ملک العلماء علاء الدین کاسانیؒ اور علامہ ابنِ ھمامؒ وغیرہ نے جہاد کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ بھی بڑا فکرانگیز ہے۔ اور ان میں سے اکثر تحریروں کو شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے اپنی "شرح موطا"[۱] میں جمع کر دیا ہے، جو اس سلسلے میں کافی بصیرت افروز ہے۔ ان تحریروں کے مطالعہ سے عمداً پھیلائی گئی ساری غلط فہمیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اور حقیقتِ حال پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ (چنانچہ ان میں سے بعض تحریریں پچھلے مباحث میں پیش کی جا چکی ہیں۔)

اس موقع پر چونکہ معترض کی بعض بدترین قسم کی علمی خیانتیں دکھانی مقصود ہیں اس لئے حافظ ابنِ حجرؒ، علامہ عینیؒ اور علامہ ابنِ ھمامؒ کی تحریریں پیش کی جاتی ہیں۔ کیونکہ معترض

۱۔ [illegible]

نے اپنے مضمون میں لفظ جہاد کی تشریح میں نہ صرف ان ائمہ کا نام لیا ہے بلکہ صراحتاً دجل و تلبیس کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ مدعیٔ تحقیق نے ابنِ حجر کی کتاب فتح الباری سے اُن کی پوری عبارت نقل کرنے کے بجائے صرف اپنے مطلب کی بات اُچک لی ہے۔ اور جو بات اُن کے گمراہ کن نظریہ کے خلاف پڑتی تھی اُسے پوری طرح نظر انداز کر دیا ہے۔ اور پھر اپنے مطلب کی بات میں بھی ڈنڈی مار کر ابن حجر کے مفہوم کو بالکل ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی پر اُنھوں نے اپنے مضمون کی آخری قسط میں جس انداز سے تنقید کی ہے اور جس قسم کی بددیانتی کا الزام اُن پر عائد کیا ہے[۱۲] اُس سے زیادہ بلکہ ایک بدترین قسم کے جرم کا اُنھوں نے خود ہی ارتکاب کیا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ دوسروں کی آنکھوں کا تنکا تلاش کرنے والوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

اب ملاحظہ فرمائیے حافظ ابنِ حجرؒ کی تحقیق کہ اُنھوں نے جہاد کو کفار کے ساتھ "قتال کرنا" بھی قرار دیا ہے اور اُن کے ساتھ "مجاہدہ کرنا" بھی۔ چنانچہ اُنھوں نے پہلے لفظ جہاد کا لغوی مفہوم (مشقت اُٹھانا) بیان کرنے کے بعد اُس کی شرعی تعریف اس طرح کی ہے:

وَشَرْعاً بَذْلُ الْجَهْدِ فِي قِتَالِ الْكُفَّارِ : اور شرعی اعتبار سے اس کا مفہوم ہے کافروں سے جنگ کرنے میں مشقت اُٹھانا۔

پھر اس کے بعد متصلاً فرماتے ہیں: وَيُطْلَقُ اَيْضاً عَلٰى مُجَاهَدَةِ النَّفْسِ وَ الشَّيْطَانِ وَالْفُسَّاقِ : اور اس کا اطلاق نفس، شیطان اور فاسقوں کے ساتھ مجاہدہ کرنے پر بھی ہوتا ہے[۱۳]

مگر معترض نے یہاں پر علمی خیانت سے کام لیتے ہوئے بطور شرح اس مفہوم کو اس طرح بگاڑا ہے: "جہاد کا استعمال کبھی کبھی نفس کے خلاف، شیطان کے خلاف، فساق کے خلاف مجاہدہ کے لئے ہوتا ہے"[۱۴]

---

[۱۲] دیکھئے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، فروری ۱۹۸۹ء ص ۲۳ - ۲۸

[۱۳] فتح الباری، ۶/۳، مطبوعہ دار الافتاء ریاض

[۱۴] الفرقان لکھنؤ، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۲۵

اس مفہوم میں "کبھی کبھی" کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھاکر معترض نے صراحتاً تحریف سے کام لیا ہے اور اصل بات کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ ابنِ حجر یہ بات مطلقاً فرما رہے ہیں کہ جہاد کا لفظ جس طرح کافروں کے ساتھ قتال کے لئے آتا ہے اسی طرح وہ نفس کے ساتھ، شیطان کے ساتھ اور فاسقوں کے ساتھ مجاہدہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ موصوف " وَ يُطْلَقُ اَيْضاً " فرمارہے ہیں نہ کہ " وَ يُطْلَقُ اَحْيَاناً "۔ واضح رہے کہ لفظ "جہاد" اور "مجاہدہ" دونوں مصدر ہیں اور لفظی اعتبار سے ایک ہی معنی و مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔

پھر دوسری سب سے بڑی علمی خیانت ملاحظہ ہو کہ حافظ ابنِ حجر نے جہاد کا شرعی مفہوم (بذل الجهد فی قتال الكفار) اور اُس کے اطلاقات کا بیان کرنے کے بعد اُس کے شرعی مفہوم کی جو مزید تشریح کی ہے اُسے معترض نے صاف طور پر گول کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف اُن کے فاسد نظریہ پر زد پڑتی تھی بلکہ وہ اُن کے حق میں زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ موصوف فرماتے ہیں:

وَاَمَّا مُجَاهَدَةُ الْكُفَّارِ فَتَقَعُ بِالْيَدِ وَالْمَالِ وَاللِّسَانِ وَالْقَلْبِ:

اب رہا کفّار کے ساتھ مجاہدہ کرنا تو وہ ہاتھ کے ذریعہ، مال کے ذریعہ، زبان کے ذریعہ اور قلب کے ذریعہ واقع ہوتا ہے۔[15]

جہاد کی یہ تشریح حدیثِ نبوی کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ تفصیل پچھلے مباحث میں گزر چکی ہے۔ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے اوجز المسالک میں حافظ ابنِ حجر کی یہ پوری تحقیق نقل کی ہے۔[16] نیز اس موقع پر موصوف نے "مجاہدۃ النفس" کی جو تشریح کی ہے وہ بھی "دین کی تعلیم و تحصیل" پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس اعتبار سے گویا کہ اہلِ علم دو حیثیتوں سے جہاد میں شامل ہیں۔ چنانچہ موصوف تحریر کرتے ہیں:

فَاَمَّا مُجَاهَدَةُ النَّفْسِ فَعَلَى تَعَلُّمِ اُمُوْرِ الدِّيْنِ، ثُمَّ عَلَى الْعَمَلِ بِهَا، ثُمَّ عَلَى تَعْلِيْمِهَا: اب رہا نفس کا مجاہدہ تو اس کا اطلاق اُمورِ دین کے سیکھنے پھر اُس پر

---

[15] فتح الباری ج ۶ ص ۳، مطبوعہ ریاض

[16] اوجز المسالک ۸/۱۹۷

عمل کرنے اور پھر ان کی تعلیم دینے پر ہوتا ہے[17]

ظاہر ہے کہ یہ بات طالب علموں اور معلموں کے حق میں جاتی ہے۔ مگر دیکھئے جب کوئی شخص خود غرض اور مفاد پرست بن جاتا ہے تو اس کی نظر سوائے اپنے ذاتی مفادات کے اور کسی چیز پر ٹھہرتی ہی نہیں۔ اور پھر طرفہ یہ کہ اس کے بعد معترض نے علامہ ابن ہمام کا نام لے کر لوگوں کو مزید دھوکا دینے کی کوشش کی ہے کہ موصوف کی تحقیق بھی ابن حجر کی تشریح ہی کے قریب ہے۔ حالانکہ ابن ہمام نے ایک دوسرا مفہوم بیان کیا ہے جو حافظ ابن حجر کے مفہوم سے زیادہ وسیع اور بصیرت افروز ہے۔ مگر یہ مفہوم بھی مدعیٔ تحقیق کے حق میں چونکہ سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے انھوں نے اسے نقل کرنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ بلکہ صرف ان کا نام لے کر آگے بڑھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس پر اپنے "کثرتِ مطالعہ" کا رعب جمانا چاہتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ لوگ ان کے اجمالی حوالوں سے مرعوب ہو کر ان کی "تحقیقِ انیق" پر عش عش کر اٹھیں گے۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:

"محقق ابن ہمام اور صاحب" مُغرب" کی تحقیق بھی اسی سے قریب تر ہے"[18]

مگر اب دیکھئے ابن ہمام اس سلسلے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ چنانچہ موصوف جہاد کی تعریف کرنے سے پہلے بطور مقدمہ دو باتیں بیان کرتے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ هو اخلاء العالم من الفساد: جہاد دُنیا سے فساد دُور کرنے کا نام ہے۔

۲۔ وهو اعلاء کلمة الله تعالی: (اُس کا مقصد) کلمۂ خدائی کو بلند کرنا ہے۔

پھر اس کے بعد تحریر کرتے ہیں:

غلبَ فی عُرفهم علی جهاد الکُفار، وهُو دعوتهم الی الدّین الحقّ، وقتالهم اِن لم یَقبلوا: اس کا اطلاق اہلِ عرب کے عُرف میں زیادہ تر کافروں کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اور جہاد کفار کو دینِ حق کی دعوت دینے اور اسے قبول نہ کرنے پر جنگ کرنے کا نام ہے[19]

---

[17] فتح الباری ۳/۶

[18] ماہنامہ الفرقان، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۲۵-۲۶

[19] فتح القدیر شرح ہدایہ، از ابن ہمام، ۵/۱۸۷، مطبوعہ کوئٹہ

دیکھا آپ نے علامہ موصوف نے اس موقع پر " دعوت " کو مقدم اور " جنگ " کو موخر کیا ہے۔ بالفاظ دیگر " اہلِ علم " کو اگلی صف میں اور " سپاہیوں " کو پچھلی صف میں رکھا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ تشریح و توجیہہ بڑی ہی بصیرت افروز ہے۔ اور صرف اسی ایک تشریح سے معترض کے سارے دعوے ریت کے تودے ثابت ہوتے ہیں اور اُن کے بُنے ہُوئے جال کا تانا بانا پُوری طرح بکھر جاتا ہے۔ چنانچہ اس عبارت سے حسبِ ذیل حقائق ثابت ہوتے ہیں:

۱۔ جہاد کا استعمال اہلِ عرب کے عُرف میں زیادہ تر کفار کے ساتھ مجاہدہ کرنے کے لئے آتا ہے۔

۲۔ اور جہاد کی نوعیت یہ ہے کہ کافروں کو اولین طور پر دینِ حق کی دعوت دی جائے۔

۳۔ اگر کفار و مشرکین دینِ حق کو قبول نہ کریں تب اُن کے ساتھ جنگ کی جائے۔

۴۔ اس اعتبار سے اہلِ علم اگلی صف میں آجاتے ہیں اور لڑنے والے لوگ پچھلی صف میں چلے جاتے ہیں۔ اور یہ بات دراصل قرآن اور حدیث کی تمام تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہے کہ اہلِ اسلام دُنیا کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لائیں۔ اور اس کے لئے علمی، قلمی اور قولی (یعنی تحریری و تقریری) جتنے بھی طریقے ممکن ہوسکتے ہیں ان سب کو اپنائیں۔ تلوار کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا ہے۔ جب کہ " فتنہ " بڑھ جائے اور تلوار اُٹھانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ جائے۔

چنانچہ اس سلسلے میں علامہ ابنِ عابدینؒ نے فتاویٰ شامیہ میں بڑے پتے کی بات بتائی ہے کہ جہاد سے اصل مقصود ایمان باللہ اور اقامت صلاۃ ہے (فساد و خون ریزی نہیں) اس لئے وہ بالذات مقصود نہیں ہے۔ بلکہ بالذات جو چیز مقصود ہے وہ اقامتِ صلاۃ ہے۔

(ولأنّ الجهاد ليس إلّا للإيمان وإقامة الصلاة ، فكان حَسَناً لغيره ، و الصّلاةُ حسنةٌ لعينها)[2]

ظاہر ہے کہ جب یہ مقصود دعوت و تبلیغ کے ذریعہ پُرامن طور پر حاصل ہو جائے تو بلاوجہ جنگ کرنا اور خون بہانا غیر ضروری ہو جاتا ہے۔

---

[2] ردّ المحتار (فتاویٰ شامیہ) ۳/۲۳۷، مطبوعہ کوئٹہ (پاکستان)

[illegible] صحیح بخاری کے ایک دوسرے شارح علامہ بدرالدین عینی حنفی کا نام بھی لیا ہے کہ جہاد کی تشریح کے سلسلے میں ان کی تحقیق بھی حافظ ابنِ حجرؒ کی تحقیق ہی کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں :

" علامہ عینی نے بھی جہاد کے بارے میں وہی تحقیق سپردِ قلم کی ہے جو حافظ ابن حجر کے حوالے سے گزر چکی ہے"۔ [۲۱]

حالانکہ یہ بھی ایک دھوکا اور فریب ہے۔ معترض اگر ان کی عبارت نقل کر کے بتاتے کہ وہ کس طرح ابنِ حجر کی تحقیق کے مطابق ہے تو کچھ بات بنتی۔ حالانکہ موصوف کی عبارت اور اُن کا مفہوم و مدعا ہی سرے سے دوسرا ہے۔ اور چونکہ یہ بات بھی ان کے بنیادی فکر کے خلاف تھی لہٰذا اُنھوں نے اسے بھی نقل کرنے اور حقیقت بیان کرنے کی ہمّت نہیں کی۔ چنانچہ علامہ عینی تحریر کرتے ہیں :

الجهاد فی اللغة الجهد وهو المشقة - وفی الشرع بذل الجهد فی قتال الكفار لاعلاء كلمة الله : جہاد کے معنی لغت میں مشقت کے ہیں۔ اور شریعت میں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے کفار کے ساتھ جنگ کرنے میں مشقت اٹھانا ہے۔ [۲۲]

نیز موصوف نے اس موقع پر جہاد کے دوسرے معنی بھی بیان کئے ہیں جو " جہاد بالنفس " کے ذیل میں آتے ہیں۔ غرض چونکہ اس میں " خُدا کی بات کو بلند کرنے " کا تذکرہ صاف صاف موجود ہے جو جہادِ علمی پر دلالت کرنے کے باعث معترض کے خلاف ایک حُجت ہے، لہٰذا وہ دُور ہی دُور سے اس کا نظارہ کرتے ہُوئے ایک شتر مُرغ کی طرح ریت میں اپنا سر چھپا لینے ہی میں اپنی عافیت تصور کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معترض کو " اعلائے کلمۃ اللہ " کے الفاظ سے ایک چڑھ سی معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ اُنھوں نے اپنے مضمون میں ایک مقام پر اس کا ارتکاب کیا ہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے علمی جہاد کا نعرہ بلند کرنے والوں پر طنز و تعریض سے کام لیا ہے۔ [۲۳]

---

[۲۱] دیکھئے ماہنامہ الفرقان، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۲۵

[۲۲] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، عینی (م ۸۵۵ھ) ۱۴/۷۸، مطبوعہ لاہور

[۲۳] دیکھئے ماہنامہ الفرقان، اپریل ۱۹۸۸ء ص ۲۷

تحریفِ دین کی بدترین مثال

غرض یہ اور اس قسم کی تمام تصریحات چونکہ معترض کے لئے بُرہانِ قاطع اور ننگی تلوار کی حیثیت رکھتی تھیں اس لئے اُنھوں نے تحقیقِ حق کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صراحتاً کتمانِ حق پر کمر کس لی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ وہ دنیا والوں کو تو یہی باور کرا رہے ہیں کہ وہ اہلِ حق میں سے ہیں اور اُن کے سوا ساری دُنیا گمراہ اور بد دیانت ہے۔ تو کیا اس کو یہود و نصاریٰ کی روش قرار دیا جائے یا دجّالی فتنے کا ایک نیا رُوپ؟ ظاہر ہے کہ یہود و نصاریٰ بھی اسی قسم کی تحریف و تلبیس سے کام لیتے تھے۔ جیساکہ ارشادِ باری ہے:

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ : وہ لوگ کلام کو اُس کی (صحیح) جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور جو نصیحت اُن کو کی گئی تھی اُس کا ایک بڑا حصہ اُنھوں نے فراموش کر دیا۔ (مائدہ: ۱۳)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ : اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جو اپنے پاس اللہ کی طرف سے موجود شدہ گواہی کو چھپا ڈالے! (بقرہ: ۱۴۰)

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ : اور تم سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور جان بُوجھ کر حق بات نہ چھپاؤ۔ (بقرہ: ۴۲)

علمی خیانت اور کذب و افتراء کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ معترض کو آیا علم سے دشمنی ہے یا دین سے؟ آیا علمی اداروں سے بغض و عناد ہے یا راقم سطور سے؟ آخر کس کی دشمنی میں وہ حق کو ناحق ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس عیاری و فریب کاری کا مقصد کیا ہے؟ خیانتوں پر خیانتیں اور لغزشوں پر لغزشیں کیوں ہو رہی ہیں؟ پھر الفرقان کے ناپختہ کار ایڈیٹر نے کیا سمجھ کر اتنا گندہ اور واہیات مضمون چھاپ دیا جو چولہے میں جھونکنے کے قابل تھا۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ "علمِ دین" کی نقاب اوڑھ کر علم کے نام پر بے علمی اور دین کے نام پر بے دینی پھیلانا ہے، جو میرے نزدیک الحاد و لادینیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اور معترض نے یہ سارا گھڑاگ محض علمی اداروں کی دشمنی میں پھیلایا ہے۔ اور یہ ... دراصل علمی اداروں کے خلاف ایک "اعلانِ جنگ" ہے جو فریب کارانہ انداز میں پھیلائی گئی

یہ عجیب بات ہے کہ معترض اسلام کا نام لے کر لوگوں کو اسلام سے باہر کرنا اور بڑی عیاری کے ساتھ اپنی دکان چلانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو اسلام ہی سے چڑھ ہو تو یہ الگ بات ہے اور اس کا علاج بہت آسان ہے۔ مگر جب آپ اسلام کے اندر رہنا چاہتے ہوں تو پھر اسلام کی صحیح تشریح و توجیہہ کرنی پڑے گی۔ آپ کتمانِ حق سے کام لے کر دنیا والوں کو فریب نہیں دے سکتے۔

مجھے یہ سب باتیں لکھتے ہوئے انتہائی دکھ اور افسوس ہو رہا ہے۔ مگر کیا کیا جائے، یہ حرکت ہی کچھ ایسی ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی دل گرفتہ ہو کر مجبوراً لکھنا پڑ رہا ہے۔ کیونکہ اس گمراہ کن تحریر اور اس کی فتنہ سامانیوں کی نقاب کشائی بہت ضروری ہے۔ جو دینِ حق اور علمِ صحیح کے خلاف ایک عظیم فتنہ اور سازش ہے۔ اگر یہ تحریر محض ایک علمی تنقید یا مخلصانہ رائے ہوتی تو بندہ اس کو پوری وسعتِ قلبی کے ساتھ برداشت کر لیتا۔ کیونکہ راقم سطور علمی اختلاف کے وجود کا قائل ہے۔ مگر یہاں پر بات علمی اختلاف کے حدود سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور کذب و افتراء اور کتمانِ حق کا ایک پشتارہ لگ گیا ہے۔ لہٰذا اس چیز کو کیسے برداشت کیا جائے؟

معترض کی سب سے بڑی لغزش یہ ہے کہ انھوں نے اس مسئلے میں صرف فی سبیل اللہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر جگہ بعض علماء کے اقوال کو خود ساختہ طور پر "اجماع" کا درجہ دے دیا ہے۔ مگر دوسری طرف لفظ جہاد کو بالکل نظر انداز کر کے نہ صرف قرآن اور حدیث کے نصوص کو [illegible] دیا ہے بلکہ خود ائمہ حدیث و فقہ کی تحقیقات تک کو پوری ڈھٹائی کے ساتھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کے الفاظ میں جو وسعت اور ابہام ہے وہ ایک کلیہ [illegible] رکھتا ہے، جس میں بہت سی جزئیات داخل ہو سکتی ہیں۔ مگر غلطی سے (بلکہ جان بوجھ کر) معترض نے اس کلیہ کو ایک جزئیہ میں مقید کرنے کا ارتکاب کرتے ہوئے بلا وجہ اس پر "اجماع" کا دعویٰ کر دیا۔ مگر دوسری طرف خود فی سبیل اللہ کا جو مترادف (جہاد) موجود ہے [illegible] کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے اُسے بھی یا تو نظر انداز کر دیا یا اُس کی شکل و صورت [illegible] ظاہر ہے کہ ان دونوں مترادفات کو ملانے اور ان کا مطالعہ یکجا کرنے [illegible] اور واضح ہو جاتی ہے اور کسی قسم کا اشکال باقی نہیں رہتا۔

اصل واقعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ معترض نے لفظ جہاد کا صحیح مطالعہ کئے بغیر محض فی سبیل اللہ کی دو چار تاویلیں ادھر اُدھر سے اخذ کر کے مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ اور سختی کے ساتھ اس بات کا ادعا کر دیا کہ اس کا واحد مفہوم نہ صرف جہاد بلکہ جہادِ عسکری ہے اور یہ اُمت کا "اجماعی فہم" ہے۔ نیز یہ کہ اس کا دوسرا مفہوم مراد لینے سے دین میں رخنہ اور شگاف پیدا ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر مضمون شروع کرنے سے پہلے وہ لفظ جہاد کا حقیقی مفہوم معلوم کر لیتے تو انھیں اتنا سخت موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ مگر اپنے مضمون کی چار پانچ قسطیں لکھ چکنے کے بعد اچانک انھیں احساس ہوتا ہے کہ اُن کا موقف غلط ہے۔ لیکن تیر چونکہ کمان سے نکل چکا تھا، اس لئے اب اُنھوں نے بات بنانے (بلکہ اپنے جھوٹ کو نبھانے) کے لئے مزید جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا اب اُن کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ "جھوٹ بولو اور ڈٹ کر بولو" خواہ اس سے دین و ایمان پر آنچ ہی کیوں نہ آجائے! لہٰذا اُنھوں نے "جہاد کا شرعی مفہوم" کے عنوان سے اس سلسلے میں تھوڑی سی وضاحت ضروری سمجھی جس کا حال اُوپر گزر چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے یہ سب کچھ تحریر کرتے ہوئے یہ تصوّر کر لیا ہو کہ یا تو ان کے علاوہ اور کسی کے پاس مذکورۂ بالا حوالے کی کتابیں موجود نہیں ہیں یا پھر لوگ ان کی طرف رجوع کرنے کے بجائے معترض کے فرمان پر پوری طرح "ایمان" لے آئیں گے اور تحقیقِ مزید کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں گے۔ کیونکہ وہ ایک بہت بڑے دار العلوم کے ایک بہت بڑے اُستاد جو ٹھہرے! ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کوئی پاپی ہی ہوگا جو ان کی بات میں شبہ کر سکے!! کوئی مولوی صاحب جھوٹ بھی بولیں گے اس کا کوئی تصوّر بھی کر سکتا ہے؟

بہر حال مدعیٔ تحقیق اگر مذکورۂ بالا ائمہ کرام کا نام نہ لے کر خاموشی کے ساتھ گزر جاتے تو بات پھر بھی ایک حد تک غنیمت ہوتی۔ مگر کہتے ہیں کہ جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اُس کے پر نکل آتے ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے سرِ بازار اپنی رسوائی کا سامان آپ فراہم کر لیا ہے۔

فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ: تو خرابی ہے اُن کے لئے جو کچھ اُن کے ہاتھوں نے لکھا اس کی وجہ سے، اور خرابی ہے اُن کے لئے اُن کی

اس کا ذمہ داری پر۔ (بقرہ : ۷۹)

یہ بڑی عبرت کی بات ہے کہ جو لوگ دین و شریعت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے اور ان کی معلومات درجۂ صفر میں ہیں تو ایسے لوگ اگر شوق میں آ کر میدانِ علم میں کود پڑیں اور اہلِ علم کو للکارنا شروع کر دیں تو کیا یہ بات علاماتِ قیامت میں سے نہ ہوگی؟ تو ایسے ہی موقعوں پر زبانِ رسالت سے نکلی ہوئی بعض پیشین گوئیاں بے ساختہ طور پر یاد آجاتی ہیں، جن کے مطابق اُن "علمائے سُر" کی مذمت کی گئی ہے جو بغیر علم کے فتوے دے کر اور علم کی "پھلجڑیاں" برسا کر عوام کو گمراہ اور بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں :

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَفْتٰی بِفُتْیَا مِنْ غَیْرِ ثَبَتٍ فَاِنَّمَا اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاہُ : حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ جس نے بغیر دلیل کے فتویٰ دیا تو اُس کا گناہ اُسی پر ہے جس نے فتویٰ دیا ہے۔[۲۳]

غَیْرُ الدَّجَّالِ اَخْوَفُ عَلٰی اُمَّتِیْ مِنَ الدَّجَّالِ الْاَئِمَّةُ الْمُضِلِّیْنَ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کے لئے دجال کے علاوہ دجال سے زیادہ خوفناک لوگ گمراہ پیشوا ہوں گے۔[۲۴]

اِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ، وَاِنَّ خَیْرَ الْخَیْرِ خِیَارُ الْعُلَمَاءِ : بدترین شر شریر علماء ہیں اور بہترین خیر نیک علماء ہیں۔[۲۵]

اَکْثَرُ مَا اَتَخَوَّفُ عَلٰی اُمَّتِیْ مِنْ بَعْدِیْ رَجُلٌ یَتَاَوَّلُ الْقُرْاٰنَ یَضَعُهٗ غَیْرَ مَوَاضِعِهٖ : میری اُمت کے بارے میں سب سے زیادہ ڈر مجھے اُس شخص پر ہے جو قرآن کی تاویل اس طرح کرتا ہے کہ اُسے اُس کے صحیح مقامات سے ہٹا دیتا ہے۔[۲۶]

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ : خَطَبَنَا عُمَرُ فَقَالَ اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَیْکُمْ

---

[۲۳] سُنن دارمی ۱/۵۷، مطبوعہ بیروت

[۲۴] مُسند احمد بحوالہ کنز العمال ۱۰/۱۱۳، مطبوعہ حیدرآباد

[۲۵] سُنن دارمی ۱/۱۰۴

[۲۶] طبرانی، منقول از کنز العمال ۱۰/۱۰۷

تَغَيُّرُ الزَّمَانِ، وَزَيْغَةَ عَالِمٍ، وَجِدَالُ مُنَافِقٍ بِالْقُرْآنِ، وَأَئِمَّةٌ مُضِلُّوْنَ يُضِلُّوْنَ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ:

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ہمارے لئے خطبہ دیا اور فرمایا کہ مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خوف زمانے کے تغیر، عالم کی لغزش، منافق کے قرآن میں جھگڑنے اور گمراہ کن پیشواؤں سے ہے جو بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔[27]

موجودہ دور کا سب سے بڑا جہاد

پچھلے مباحث میں جہاد کے صحیح مفہوم اور اُس کی نوعیت و اہمیت پر قرآنِ مجید اور احادیثِ نبوی کی رُو سے کافی روشنی پڑ چکی ہے۔ اور ماہرینِ لُغت، ماہرینِ حدیث اور ماہرینِ فقہ کی تشریح و توجیہہ روزِ روشن کی طرح سامنے آچکی ہے۔ اور ان تمام ملاحظات کی رُو سے اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ جہاد اصلاً دعوتِ اسلامی یا دین کو پھیلانے کا نام ہے۔ اور اس راہ میں جنگ کرنا جہاد کی ایک فرع ہے اصل نہیں۔ بالفاظِ دیگر "قتال" جہاد کی ایک ضمنی شکل ہے، اُس کی مکمل تصویر نہیں۔ مگر مدعیٔ تحقیق عوام الناس کو یہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ قتال جہاد کی واحد اور مکمل تصویر ہے۔ یعنی جہاد سے مراد صرف اور صرف جہادِ عسکری ہے اور اس میں کسی دوسری قسم کی "جدوجہد" شامل نہیں ہوسکتی۔ اور عصرِ جدید کے بعض متجدّدین (مثلاً نواب چراغ علی) نے دعویٰ کر دیا ہے کہ قرآن میں جہاد سے مُراد صرف عمومی "جدوجہد" یا غیر عسکری جہاد مراد ہے[28] ظاہر ہے کہ یہ دونوں دعوے غلط اور لغو ہیں، جو دو انتہائی سروں پر اور افراط و تفریط کے حامل ہیں۔ اور صحیح بات ان دونوں کے درمیان ہے۔ یعنی احوال و کوائف کی مناسبت سے ان دونوں میں سے جو پہلو مناسب ہو وہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق سب سے بہتر اور معتدل ہے، جو آگے آرہی ہے۔ نیز جیساکہ تفصیل گزر چکی علمی جہاد کی حقانیت پر خاص کر امام بخاریؒ کا فتویٰ اس سلسلے میں ایک قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے مقابلے میں کسی

---

[27] کنز العمال ۱۰/۱۶۱

[28] دیکھئے مصنف کی کتاب "تحقیق الجہاد" مطبوعہ [illegible]

خود ساختہ عالم یا " دانشور " کے کسی بھی قول یا گمراہ کن فتوے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی ۔

خلاصہ یہ کہ دین کی دعوت اور اُس کی نشر و اشاعت اصل ہے اور " قتال " یا تلوار اُٹھانا ایک آخری چارۂ کار کے طور پر ہے ، جو اصلاً مطلوب نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی حیثیت ضمنی و فرعی ہے ۔ ورنہ قرآن ، حدیث اور ائمہ کرام کی تمام تصریحات و توجیہات بے معنی (معمہ و چیستان) بن کر رہ جاتی ہیں ۔ چنانچہ اس موقع پر ایک دوسری حیثیت سے غور کیجئے تو یہ حقیقت اور زیادہ نکھر کر آپ کے سامنے آجائے گی ۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ : اور تم ان (کافروں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (شرک و کفر) باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ ہی کا ہو جائے ۔ (بقرہ : ۱۹۳)

اور بعض حدیثوں میں آتا ہے :

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ : مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کرتا رہوں جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت نہ دے دیں ۔[۲۹]

قرآن اور حدیث کے ان واضح احکام کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ہر دور ، ہر ملک اور ہر جگہ منکرینِ خدا کے خلاف علم جہاد بلند کریں ۔ یعنی مشرکین و کافرین کے خلاف فوجی کارروائی کریں ۔ کیونکہ اس موقع پر قرآن اور حدیث دونوں میں لفظ قتال (جنگ) استعمال کیا گیا ہے ۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا آج مسلمان اپنا یہ شرعی فریضہ ادا کر رہے ہیں ؟ یا فوجی و عسکری اور سیاسی نقطۂ نظر سے وہ اس فریضے کو ادا کرنے کے موقف میں ہیں ؟ حالانکہ دنیا میں آج مسلمانوں کی آبادی لگ بھگ ایک ارب ہے ۔ بالفاظِ دیگر دنیا کا ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے ۔ اور پچاس کے قریب اُن کے آزاد ممالک دنیا کے نقشے پر پائے جاتے ہیں ۔ مگر کیا کوئی ایک مسلم ملک بھی ایسا موجود ہے جو کفار و مشرکین (یا ملحدین اور بے دین لوگوں) سے لوہا لے سکتا ہو ؟ حالانکہ ابو داؤد کی جو

۲۹؎ بخاری ۱/۱۱ ، مسلم ۱/۵۱ ، ابو داؤد ۲/۱۹۸ ، ابن ماجہ ۲/۱۲۹۵ ، مسند احمد ۱/۱۱

گلریز کا اخلاقی و عرفانی پہلو

ڈاکٹر مسز صفیہ جاریہ انمس، ریسرچ ایسوسیٹ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

گلریز ضیاء الدین نخشبی بدایونی کی تصنیف ہے جو چودھویں صدی عیسوی کے ایک بزرگ عالم اور دردمند صوفی تھے۔ آپ شہر نخشب میں پیدا ہوئے تھے۔ نخشب جسے نسف بھی کہا جاتا تھا بخارا کا ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ منگولوں کے بخارا پر قبضہ کرنے اور نخشب میں محلات تعمیر کرانے کے بعد اس علاقہ کا نام قرشی پڑ گیا۔[1] قرشی ایک منگولی لفظ ہے جس کے معنیٰ محل کے ہیں۔ آپ نے خود اپنے نخشب میں پیدا ہونے کا ذکر فخریہ انداز میں کیا ہے۔ ؎

بہر شہری و ہر جای یک متاعِ قیمتی خیزد
صبا از نخشب شکر از مصر سعدی از شیراز

آپ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کسی تذکرہ نویس نے کچھ نہیں لکھا ہے اور نہ ہی آپ کی کسی تصنیف سے اس پر روشنی پڑتی ہے البتہ عبدالحق محدث دہلوی نے تاریخ وفات ۷۵۱ھ مطابق ۱۳۵۰ء لکھی ہے۔[2] اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آپ تیرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں منگولوں نے سمرقند، بخارا اور ماوراءالنہر میں قیامت صغریٰ برپا کر رکھی تھی۔ اس افراتفری اور لوٹ مار کے زمانے میں آپ نے مجبوراً اپنا وطن عزیز ترک کر کے ہندوستان ہجرت فرمائی اور بدایوں شہر قیام کے لئے پسند فرمایا اس لیے کہ یہ شہر دارالسلطنت دہلی

---

[1] Encyclopedia of Islam, E. Berthels. vol. II. P. 840 –

[2] اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، از عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۴ ۔

سے دور ایک پُرسکون اور رُوح پرور مقام تھا۔ یہیں کے ایک بزرگ اور مشہور عالم شہاب مہمرہ سے شرف تلمذ حاصل کیا، اور شیخ فریدؒ جو شیخ حمید الدین ناگوریؒ کے پوتے تھے، کے مرید ہوئے آپ نے بدایوں شہر سے باہر قدم نہیں نکالا اور نہ ہی کسی بادشاہ یا امیر کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ صبر وشکر اور قناعت کے ساتھ اپنی تمام عمر تصنیف وتالیف اور دیگر علمی کاموں کو انجام دیتے ہوئے ایک گوشۂ تنہائی میں گزار دی۔ بدایوں میں ہی انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

آپ کی تصانیف کئی ہیں جن کے نام یہ ہیں:۔ طوطی نامہ، سلک السلوک، چہل ناموس، گلریز، لذات النساء، عشرۂ مبشرہ، شرح دعای سریانی، یہ تصانیف مختلف موضوعات کی حامل ہیں جیسے تصوف، مذہب، داستان اور طب وغیرہ۔ سلک السلوک، شرح دعای سریانی اور گلریز مطبوع ہوچکی ہیں۔ گلریز ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سے ۱۹۱۲ء میں طبع ہوئی ہے اس میں ۱۹۱ صفحات ہیں۔ اور عجب ملک اور نوشلب کے عشق کی داستان دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ جہاں تک داستان کے ماخذ کا تعلق ہے تو وہ محض آپ کے ذہن کی اختراع ہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

نبوداست ایں حکایت در زمانہ — تماماً اختراع است این فسانہ
مگر بودایں حکایت در بکارت — بران جستم زحق از وی عبارت
بعالم منتشر نا بودہ ہر گز — عروسش روبکس ننمودہ ہرگز
ورقہا سادہ بود از شرح ایں فن — نگفتہ ہیچ کس ایں قصہ روشن[1]

ادبی اعتبار سے کتاب گلریز کا مرتبہ اعلیٰ وارفع ہے۔ یہ رواں اور شیریں نثر ونظم میں لکھی گئی ہے۔ نثر مسجع ہے۔ موقع اور مناسبت کے اعتبار سے قرآن مجید کی آیتوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، خلفائے کرامؓ اور مختلف اولیاء اللہ کی زندگیوں کے نصیحت آموز واقعات اور اقوال سے استدلال کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ آپ نے اپنے برمحل، خوبصورت اور مؤثر اشعار وقطعات سے عبارت کو مزین فرمایا ہے۔ اس کتاب کا سبب تالیف آپ یہ فرماتے ہیں:

شبی خرم تراز صد روز نو روز — زصبح عید ہم چیزی دل افروز

---

[1] ایضاً ص۸

من و دل یک دگر بودیم خرم | دراں خلوت بجز دل محرمی کم
دریں اندیشہ کیں چرخ خطرناک | بخواہد کرد مارا عاقبت خاک
چو دامن ہا کہ دوراں چاک کردہ است | نہ من تنہا کیا نہا خاک کردہ است
چو زیں منزل حقیقت رفتنی ہست | بسا اندر نہ گل خفتنی ہست
بیاید کرد در آفاق کاری | کہ بعد از ما بماند یادگاری[1]

لیکن آپ کا منشا محض یہ نہیں تھا کہ ایک بے معنی داستان کو اعلیٰ ادبی انداز میں پیش کر دیا جائے اور اس طرح اپنے علمی کمالات کا اظہار کیا جائے، بلکہ آپ نے اسے متصوفانہ رنگ میں لکھا ہے یوں تو آپ کی ہر کتاب میں تصوفانہ رنگ غالب ہے اور سلک السلوک تو خالص تصوف کی کتاب ہے۔ لیکن گلریز میں تصوف اور عرفان کا باقاعدہ درس دیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ سچے سالک کو راہ عشق میں کیا کیا پریشانیاں اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور کن صبر آزما مصائب سے گزرنا پڑتا ہے، تب جا کر منزل وصال تک پہنچتا ہے اور گوہر مراد حاصل کرتا ہے چونکہ صوفیہ حضرات کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ متصوفانہ مضامین اور عرفانی افکار و خیالات کو ہمیشہ اشاروں، کنایوں اور رموز اصطلاحوں کے ذریعہ بیان کیا ہے اسی طرز پر آپ نے بھی عشقیہ داستان کے در پردہ عرفانی مطالب و معانی کو تحریر فرمایا ہے چونکہ عرفانی اور متصوفانہ درسیات میں اخلاقیات کا درس جزو لاینفک ہے اسی لئے بیشمار اخلاقی اوصاف کا نہایت خوبی سے ذکر فرمایا ہے اور منہیات اور برائیوں سے متنبہ کیا ہے۔ گویا آپ کی توجہ تصوف کے عملی پہلو پر بھی مرکوز رہی ہے لیکن اس کتاب کو پند و نصیحت کی خشک کتاب نہیں بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک دلچسپ داستان کو دلنشین انداز بیان کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے پند و نصیحت کے مضامین اتنی خوبصورتی سے منسلک فرماتے ہیں کہ قاری کا ذہن داستان کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اور لاشعوری طور پر وہ پند و نصیحت کے کڑوے گھونٹوں کو آسانی حلق سے اتارتا چلا جاتا ہے اگر آپ کے اخلاقی مضامین کو یکجا کر دیا جائے تو ایک علیحدہ کتاب تیار ہو جائے گی چنانچہ اختصار کے ساتھ اس داستان کے اخلاقی پند و نصیحت اور عرفانی پہلو

---

[1] ایضاً۔ ۷

کا ذکر کیا جاتا ہے۔
نخشب میں ایک بادشاہ تھا جس کا نام طیفور تھا اور وہ ایک وسیع سلطنت پر نہایت جاہ و جلال اور شان و شوکت سے عدل و انصاف اور احسان و اکرام کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ اسی ضمن میں عدل کی تعریف میں فرماتے ہیں:

"خود شہریاران کامل عقل و جہانداران شامل فضل را ہیچ نعمتی بہتر از اکرام و احسان نیست و ہیچ دولتی پاک دستی تر از عدل دامان نہ"

تا توانی پیشۂ خود عدل کن دین نصیحت را نکو بر جای دار
گر نباشد عدل شاہان بر زمین عالم خاکی نباشد برقرار [1]

اس بادشاہ کے کوئی اولاد نہ تھی، وہ ہر وقت لم یلد ولم یولد سے اولاد کے لئے دعا کرتا رہتا تھا اس لئے کہ۔ سے

بر روی زمین عمر دگر کس را نیست گر عمر دگر خواہی فرزند نکو خواہ [2]

کافی وقت گزرنے پر اس کے اولاد ہوئی جس کا نام بادشاہ نے "معصوم شاہ" رکھا۔
جب وہ بڑا ہوا تو علم و ادب کے زیور سے آراستہ کیا۔

و خود علم تاج بیست مرصع جز بر سر کبرای کرام نشاید و ادب دواجیست مکلل جز بر علماء عظام نزیبد کہ اَلْاَدَبُ اَشْرَفُ نَسَبٍ وَاَفْضَلُ مُکْتَسَبٍ وَاَجْلُ مَالٍ وَاَتَمُّ جَمَالٍ [3]

ایک دن ایک خوبصورت مرغ محل کے کنگرہ پر نظر آیا معصوم شاہ اس کے پکڑنے کی کوشش میں لڑکھڑایا تو اس کا مرصع تاج نیچے گر پڑا مرغ نے اس کا تاج لے کر اڑ جانا چاہا تبھی.. گرفتار ہوا اور قفس میں اسیر کر دیا گیا طمع کے بارے میں فرماتے ہیں:

طمع را تا توانی گرد کم گرد بسا سر کز طمع برباد رفتہ است
طمع را سہ حرفی ست و ہر سہ از نقطہ خالی این چیست ؟ نقطہ را نیز ننگ می آید

---

[1] ایضاً صنا [2] ایضاً صنا۔ [3] ایضاً صلا۔

کہ گرد طمع گرد د۔ ؎

برخویش مدہ تو حرص را راہ کز حرص و طمع گدا شود شاہ [1]

مرغ نے قفس میں دانہ نہیں کھایا۔ شہزادے نے ہر ممکن کوشش کی مگر ناکامیاب رہا۔ مایوس ہو کر افسردہ و غمگین پنجرے کے پاس بیٹھ گیا۔

مرغ در حقیقت ایک شہزادی تھی۔ شہزادے کی محبت اور دلداری سے متاثر ہوئی، اور بولی کہ کاش میں اپنی اصلی حالت میں ہوتی تو شہزادے کو اس کی محبت کا صلہ دیتی۔ شہزادے کو اول اس کی گویائی پر حیرت ہوئی اور پھر اس کا حال دریافت کیا تو مرغ نے بتایا کہ میں پریوں کے بادشاہ کی بیٹی نوش لب ہوں، میرے باپ کو مشہور شاہ کہتے ہیں اور ہمارے شہر کو بیت الامان کہا جاتا ہے۔ ملک ترکستان میں ایک بادشاہ ہے جس کا نام شاہ بہ گرد ہے اور اس کے بیٹے کا نام عجب ملک ہے۔ عجب ملک دولت کی فراوانی اور اپنے حسن کی تابانی سے مغرور ہو گیا تھا۔

"ہر کہ بچشم رعونت در خود نگریست صد گونہ ابواب تعب بر وکشادند و ہر کہ دیدہ غرور بخود بدید خرمن شادمانی او را بباد بی نیازی بر دادند" [2]

اسی مجلس عیش و نشاط میں ایک بوڑھے شخص نے نوش لب کے بے مثال حسن و جمال کی تعریف اتنے موثر انداز سے کی کہ عجب ملک بغیر دیکھے ہی اس پر عاشق ہو گیا۔ ؎

مہر کس در دل چو صادق میشود گوش پیش از چشم عاشق میشود

ولہذا علمای تحقیق و بلغای تدقیق سمع را بر بصر ترجیح نہادہ اند و گوش را بر چشم دادہ و می گویند کہ سمع از ہر جوانب بشنود و بصر یکجانب بیش نہ بیند و چیزیکہ ہمہ جوانب ادراک کند فاضل تر از آں باشد کہ از یکجانب بہ بیند۔" [3]

جب اس مرد پیر نے عجب ملک کی حالت دگرگوں دیکھی تو اپنی کہی ہوئی بات پر شرمندہ ہوا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ "موبستان اساس بلاغت گوہر من کثر کلامہ کثر لغوا لمہ بہرزہ نسفتہ اند و مہندسان ہندسہ بلاغت قول اِلزم الصمت ما استطعت فانہ"

---

[1] ایضاً ص۱۱۔ [2] ایضاً ص۱۹۔ [3] ایضاً ص۲۴۔

ستیّۃ الانبیاء ، بگزاف نگفتہ اند"[۱] عجب ملک کے باپ شاہ گردکو جب اس کی پریشان حالی کی خبر ملی تو وہ اول خود اس کا حال دیکھنے آیا اور پھر ایک طبیب حاذق کو اس کے علاج کے لئے بھیجا طبیب نے اس کے مرض کو لاعلاج قرار دیا۔ زیرا کہ دردِ عاشق را ہیچ معالج فائق و حواس صادق مداوات نتوان کرد و علت مشتاق را ہیچ لبیب عزیب و طبیب عجیب معالجت نتواں آورد۔ داعیاً من دواء المَوتِ کُلُّ طبیبٍ ذٰلَ ۔ دلی صنوبری انسانی چوں از عشق تاب یافت ہیچ مفرح بہ نشود دیگر ہلالی حیوانی چوں از شوق پژمردہ شد ہیچ شربت باز نیاید"[۲]

آخر کار وزیر نے ہمدردی کی باتیں کیں اور شہزادے کے غم واندوہ کا سبب جان کر اسے سمجھایا کہ" دل بر موالات زنان داشتن محض خطا است و جان بر مصافات نسار گماشتن عین عنا ، داغ بیوفائی بر جبین وقت ایشاں لائح است و نکہت بر دغائی از ریاحین عہد ایشاں رائج "[۳] لیکن عجب ملک نے اس کی نصیحت نہ سنی اور جواب دیا کہ "بی ہوسان خود پرستان را وفا از عشق چشم باید داشت نہ از معشوق۔ پیشۂ معشوق ہمہ وقت ملتاز یست و شیوۂ عاشق ہمہ گاہ وفا و سرباز یست"[۴] وزیر نے شہزادے کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن بے سود، مایوس ہو کر بادشاہ کی خدمت میں گیا اور عجب ملک کے راز نہانی سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے اسے اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا اور اسے اس طرح سمجھایا۔ "ای پسر چشم بر مودت انسانی داشتن عین عنا ست و ہوس بر محبت مجازی گماشتن محض خطا است ، فرزند خلعت برای آں باید تا نام اجداد زندہ گرداند و بعد ایشاں جای ایشاں تاریک نگذارد کہ مقصود ز توالد و تناسل ہمیں بیش نیست"[۵] عجب ملک نے باپ کی پند و نصیحت و گریہ وزاری کا کوئی اثر نہ لیا اور جواب دیا۔ "درسری کہ سودای عشق افتادہ بتاج شاہی کی فرو آید و در دلی کہ سودای شوق برخاست بدواج شہنشاہی کی التفات نماید۔ دعوای محبت کردن کارِ

---

[۱] ایضاً ص ۲۵ ۔ [۲] ایضاً ص ۳۳ ۔ [۳] ایضاً ص ۳۸

[۴] ایضاً ص ۴۶ ۔ [۵] ایضاً ص ۵۲ ۔

بالعقان کو می وفا است نہ پیشۂ طفلان بی ادب وشاہراہ مودت سپردن نشان سالکان
راہ رضا است نہ شیوہ کودکان مکتب ۔ عشق آتشی است کہ از زبانۂ سوزش هزار دل را تاب
دادہ است واز شعلۂ فراق فروزاں ہزار جگر را داغ نہادہ ۔ ؎

آنرا کہ ہوای یار در سر افتاد
گر سر برود ہواش از سر نرود [1]

الغرض بادشاہ کا سمجھانا بھی کارگر نہ ہوا۔ عجب ملک نے بادشاہ سے اجازت طلب
کی کہ اپنے محبوب کی تلاش میں وہ بھی مجنون کی طرح صحرا کی خاک چھانے اور در بدر مارا مارا پھرے
شاید مطلوب کا چہرہ دیکھے۔ بادشاہ نے اجازت نہ دی تو عجب ملک نے اپنی دایہ کے لڑکے
راسخ کو اپنا راز دار بنایا اور شکار کے بہانہ جنگلوں کی راہ لی ۔ ضیاء الدین نخشبی نے چونکہ
عجب ملک کو سالک دکھایا ہے اور سلوک کے راستے میں پہلی وادی طلب کی آتی ہے ۔ عجب ملک
اس وادی سے اس وقت گزرا جب مرد پیر سے نوشلب کی تعریف سنی اور بغیر دیکھے ہی اس
پر عاشق ہوگیا اور محبوب کی تلاش اور اس کے حصول کی تمنا میں محو ہوگیا ۔ دوسری عشق کی
وادی ہے جب دل میں سچا عشق پیدا ہوگیا تو تاج و تخت اور عیش و آرام کو خیرآباد کیا اور
جلوۂ حق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ " ایں راہیست تا پای بر سر نہ نہی دست بسلسلۂ مسلسل
خوبروی نرسد و تا جان بجائے دل ندہی عشق بازی مسلّم نشود۔" [2] راستے کی سختیوں
اور غربت کی تنگیوں کو برداشت کیا ، دہشتناک صحراؤں اور خوفناک بیابانوں کو عبور
کیا، فراق یار کی تڑپ اور بیقراری میں گریہ کرتا ہوا دنیا کی شکایت میں کہتا ہے ۔ " دنیا
معشوقہ ایست بیوفا کہ شیوہ او ہمہ خونریزیست و عادت او ہمہ مردم بیزیست ۔ بخنجر بلا
خون ہزار عاشق ریختہ است و بہ کنگرۂ عناصر ہزار وامق بیاویختہ" [3] دشوار گزار گھاٹیوں سے
گزرتا ہوا ایک ہولناک دریا تک پہنچا اور دریای سفر کا آغاز کیا۔ جہاں بھی کوئی شہر
نظر آیا وہاں پہنچ کر نوشلب اور بیت الامان کا پتہ پوچھا مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا ایک دن

1۔ ایضاً ص ۵۴ و ص ۵۵ ۔ 2۔ ایضاً ص ۵۱ ۔ 3۔ ایضاً ص ۵۲ ۔

دریا میں ایک زبردست طوفان آیا اور کشتی ڈوب گئی۔ عجب ملک تیرتا ہوا کنارے پر پہنچا۔ راستے جو ساتھ تھا اس کا کچھ پتہ نہ چلا تو آنسو بہاتا معشوق کی یاد میں گریہ وزاری کرتا ہوا پیادہ پا روانہ ہوا۔ "واز رنج رفتن خون پای درسر معرفت وخون سرده پای می افتاد، بر بساط بیط بوقلمون و در اطراف اکناف ربع مسکون چو آب درہمہ اعضا میدوید وچوں باد درہمہ تن می پرید

سے نی نکتۂ عشق را ادیباں دانند　　　نی علت شوق را طبیباں دانند
اندوہ غریبی بکسی نتواں گفت　　　وردیست غریبی کہ غریباں دانند ۱؎

ایک جانگداز صحرا سے گزرتے دقت ایک بلند محل نظر آیا۔ دروازے پر کوئی دربان نہ تھا اندر داخل ہوا تو ایک خوبصورت دوشیزہ کو ایک تخت پر سوپا ہوا پایا۔ جب وہ بیدار ہوئی تو عجب ملک کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ سپہ سالار بحرین کی بیٹی ہے اور اس کا نام نازمست ہے اور اس وقت وہ ایک عفریت کے قبضہ میں ہے پھر عجب ملک سے اس تنہا اور ویران مقام پر آنے کا سبب دریافت کیا تو عجب ملک نے اپنی روئیداد غم سنائی جسے سُن کر نازمست نے بتایا کہ نوش لب میری منہ بولی بہن ہے وہ ہر سال بیت الامان سے ملک بحرین اپنی ماں کے ساتھ آتی ہے۔ اور ہم تینوں یعنی میں اور میری چھوٹی بہن مست ناز جو نوش لب کی ہم عمر ہے اور نوش لب کچھ دن ساتھ رہتے ہیں۔ یہ سنکر عجب ملک نازمست کے قدموں پر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔ نازمست نے کہا۔ سے

طبیبی رانشاں دادم کنوں خیز　　　دومژدہ درعنانِ اکدرآمیز
مشو یک لحظہ دوراز کوی اوپیش　　　کزدیابی علاج اندہ خویش ۲؎

عجب ملک نے اب وادی معرفت میں قدم رکھا ہے اس لئے اب وہ کائنات اور اس کی ہر شے سے بے نیاز ہو گیا ہے اور اس پر بے خودی کا عالم طاری ہے۔ وہ اسرار حق سے واقف ہو گیا ہے۔ اور محبوب کے آستانے کا پتہ مل گیا ہے اس وادی کو طے کرنے کے بعد چوتھی منزل استغنا کی آتی ہے جس میں نہ تو اسے اپنی جان کی پرواہ ہے نہ موت کا خوف۔ اور

۱؎ ایضاً ص۸۳ ۔　　۲؎ ایضاً ص۹۱

وہ عفریت سے جو اس سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہے مقابلہ کیا اور اسے ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد نازمست اور عجب ملک دشوار گزار راستوں کو طے کر کے ملک بحرین پہنچ گئے۔ سپہ سالار اپنی بیٹی کو صحیح سلامت پا کر نہایت خوش ہوا۔ اور جب اس نے عجب ملک کی روئیداد غم سنی تو اپنی بیٹی سے اس کی مدد کرنے کے لیے کہا اور اسے ایک مقام فاخر رہنے کے لئے دیا اور اس کی عزت اور دل داری میں کوئی کمی نہیں کی، اس طرح کچھ دن گزر گئے، ایک دن عجب ملک بازار سے گزر رہا تھا کہ ناگاہ اپنے دودھ شریک بھائی راسخ کو دیکھا جو دریائی سفر میں اس سے بچھڑ گیا تھا۔ دونوں باہم گلے ملے اور پھر عجب ملک نے نازمست کو عفریت کے ہاتھوں آزاد کرانے اور ملک بحرین تک پہنچنے کا واقعہ سنایا اور یہاں قیام کرنے کا سبب بتایا، پھر اسے ساتھ لے کر سپہ سالار بحرین کے پاس گیا اور اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت چاہی جسے سپہ سالار بحرین نے بخوشی منظور کر لیا۔ ضیاء الدین نخشبی نے اس موقع پر بادشاہوں کے احسان و کرم کی تعریف فرمائی اور بخل کی مذمت کی کہ "آری شہریاران جہاندار و بختیاران کامگار را اکرام و احسان درجہ ایست عظیم و امساک و بخل واقع الیم، قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اَلْبَخِیْلُ لَا یُسْعَدُ بِالشَّہَادَۃِ۔ یعنی بخیل ہرگز سعادت شہادت نیابد زیرا کہ او در راہ حق نان نمی تواند داد، جان بجان دہ چگونہ خواہد داد" [1]

عجب ملک نے چند عرصہ نوشلب کے انتظار میں بے قراری کے ساتھ گزارا آخر جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو نازمست سے اپنے دل کی بے قراری کا حال بتایا، نازمست نے اسے خوشخبری دی کہ کل نوشلب آئے گی۔ یہ سن کر عجب ملک خوشی سے پھول کی طرح کھل گیا۔ "آری تو آں دانست کسی کہ از عشق محبوبی و شوق مطلوبی سالہا در عبارت نہفتہ باشد و شبہا از قلق و اضطراب نخفتہ۔ چوں ناگاہ مبشر سعادت و ملقن کرامت بگوش او رساند کہ فردا روز وصل شما است او را ازیں کلمات چہ فرحت حاصل شود و ازیں نغمات چہ بہجت واصل گردد؟" [2]

(جاری)

---

[1] ایضاً ص۱۰۱ ۔
[2] ایضاً ص۱۰۲ ۔

مولانا برکات احمد

اور اُن کی تصانیف

مولوی سعید احمد خاں صاحب ایم۔اے (تاریخ اُردو) مبارک منزل پانچ بتی
ٹونک۔ ۳۰۴۰۰۱

یونانی کتابوں کے ترجمہ ہونے کے بعد مسلمانوں کو نئے علمی اور فلسفیانہ مسائل و شکوک و شبہات کا سامنا کرنا پڑا۔ بنو امیہ کے دور سے اس وقت تک کسی نہ کسی شکل میں یہ سلسلہ جاری ہے۔ علماء نے کبھی علم کلام اور کبھی قرآن و حدیث کی روشنی میں ان شکوک و شبہات کا ازالہ کیا اور علمی و فلسفیانہ مسائل کا حل بڑے تدبر و تفکر سے دیا۔ اپنے ذوق و شوق کے مطابق علماء مختلف علوم میں اختصاص رکھتے تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادہ مولانا عبدالحق خیرآبادی معقولات میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ استاد کا کمال یہ ہے کہ شاگردوں میں اُس کا ذوق سرایت کر جائے۔ خیرآبادی علماء میں یہ خوبی تھی۔ مولانا برکات احمد آپ کے شاگرد تھے۔ تقریباً نصف صدی تک ریاست ٹونک میں درس و تدریس کا فرض انجام دیتے رہے۔ معقولات میں استاد کے صحیح جانشین تھے۔ ان کی تصانیف میں منطقی طرز استدلال اور فلسفیانہ مباحث ملتے ہیں۔ مولانا کے شاگرد رشید مولانا محمد علی صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ حدیث و قرآن کی توضیح و تشریح میں منطقی و معقولی طرز استدلال صاف نظر آتا تھا۔

مولانا کا ایک فوٹو

مولانا برکات احمد کے والد مولانا دائم علی صاحب میر نگر (بہار) کے سادات میں سے تھے۔ طب کی تعلیم حاصل کر کے ٹونک میں ہی نواب صاحب کے معالج خاص مقرر ہوئے۔ ان کی شادی مظفر نگر کے شیخ ولی محمد پھلتی کی لڑکی سے ہوئی تھی جس کے بطن سے ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۴ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جو نام سے ہی نہیں بلکہ کام سے بھی برکات احمد ثابت ہوا۔... ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کر کے درس نظامی کی کچھ کتابیں مولانا لطف علی بہاری (تلمیذ مولوی فضل حق خیرآبادی) اور مولانا محمد محسن (تلمیذ صدرالدین آزردہ) سے پڑھیں پھر تقریباً پندرہ سال ریاست رامپور میں رہ کر مولانا عبدالحق خیرآبادی سے تمام مروّجہ علوم کی تعلیم حاصل کی۔ یہ پندرہ سال کی عمر کا عرصہ حقیقتاً تعلیم حاصل کرنے میں نہیں گذرا کیونکہ مولانا عبدالحق کا طریقہ درس بڑا صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا۔ مولانا عبدالشاہد صاحب شیروانی لکھتے ہیں کہ:

"شرح ہدایتہ الحکمۃ شروع ہوئی۔ ایک شوال میں اس کا پہلا سبق اور سال آئندہ کے دوسرے شوال میں جا کر دوسرا سبق۔ اس ایک سال کی مدت میں کیا لائق شاگرد کو یہ جرأت ہو سکتی تھی کہ استاد سے اپنے تضیع اوقات کا گلہ کر سکے۔"

ایک بار قرأت کی معمولی غلطی کی وجہ سے دو سال سے زائد عرصہ تک درس سے باہر رکھا۔ علاوہ ازیں مولانا کے نوکر اکثر بیشتر طلباء سے بڑی رقم اینٹھنے کے لیے عجیب حرکات کیا کرتے تھے۔ بہرحال برکات احمد نے حصول علم کی خاطر یہ سب برداشت کیا۔ صحاح ستہ کی قرأت قاضی محمد ایوب پھلتی سے کی۔ حکیم احسن اللہ خاں دہلوی کے شاگرد حکیم نجف علی خاں صاحب سے طب کی عملی تربیت حاصل کی۔

ریاست ٹونک میں نواب حافظ محمد ابراہیم علی خاں صاحب بہادر کے معالج خاص ہوئے اور یہیں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ نواب موصوف کے نام سے مدرسہ جاری کیا۔ "رباط الحکمۃ" کے نام سے ایک سرائے نادار اور غریب طلباء کے قیام کے لئے بنائی گئی۔ نواب صاحب موصوف اور امرائے ٹونک نے اس سلسلہ میں کافی معاونت کی۔ پھر بھی مولانا اپنی آمدنی کا معتدبہ حصہ طلباء پر خرچ کیا کرتے تھے۔

۱۳۳۱ھ/۱۹۱۹ء میں فریضہ حج ادا کرنے گئے۔ اس وقت مصر، شام، فلسطین بھی گئے۔ دوسری بار ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء میں حج ادا کیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء میں مولانا کا انتقال ہوگیا۔

آپ کی اڑتالیس تصانیف ہیں۔ ان میں نصف سے زائد معقولات پر ہیں۔ آپ کا رسالہ القان العرفان فی ماہیتہ الزمان موضوع کے لحاظ سے علامہ اقبال کے ذوق کا تھا۔ اس لئے سید سلیمان ندوی نے اس کی اطلاع آپ کو دی۔ اقبال نے اسے پڑھا مگر انھیں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ یہ رسالہ اپنے موضوع زمان و مکان کی وجہ سے بعد میں دوبارہ اقبال اکادمی کراچی سے شائع کیا گیا۔

تقدیم میں مولانا کے پوتے محمود احمد برکاتی نے عجیب انداز اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں ..... اور پھر اس کو درسا درسا پڑھا (ص ۱۶۸ اقبال نامہ جلد اول) رسالہ کے مخاطب چونکہ فلسفہ قدیم کے طلباء نہیں بلکہ وہ فضلاء و اساتذہ تھے جو کتب قدما و متاخرین کے درس و مطالعہ کی مزاولت کی بناء پر مسئلہ کے مالہ و ماعلیہ اور مختلف مذاہب کے اختلافات وغیرہ پر نظر رکھتے ہوں، اس لیے اقبال (جیسا کہ ان کی بعد کی تحریروں سے خصوصاً تشکیل جدید سے اندازہ ہوتا ہے۔) اس رسالہ سے مستفید و متاثر نہ ہوسکے۔"

تقدیم نگار نے اپنے جد امجد سے عقیدت کا اظہار کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ رسالہ انتہائی عالمانہ اور نئے فلسفیانہ افکار اور قدیم مذاہب کی سیر حاصل بحث پر مشتمل ہے۔ اور اقبال اپنی کم علمی اور محدود مطالعہ کی وجہ سے اس سے مستفید نہیں ہوسکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے قدیم فرسودہ افکار و آراء کو اس رسالہ میں ژولیدہ انداز میں لکھا ہے۔ اس میں نہ نئی فکر تھی اور نہ نیا انداز، نہ ہی کچھ ایسی باتیں جو علامہ کے علم میں اضافہ کرسکے اس لئے وہ اس رسالہ سے کس طرح متاثر ہوسکتے تھے۔

اس رسالہ کے علاوہ مولانا مرحوم کی تیرہ کتابیں اور مطبوعہ ہیں جن کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے

(۱) العقول الضابط مطبع علوی لکھنؤ ۱۳۱۴ھ (منطق)

(۲) عشرۂ کاملہ	مطبع المطابع دہلی	۱۳۱۸ھ	(فلسفہ)
(۳) امام الکلام فی تحقیق الاجسام	انتظامی پریس کانپور	۱۳۲۲ھ	(فلسفہ)
(۴) رسالہ وجود رابطی	ایضاً	۱۳۲۳ھ	(منطق)
(۵) نبراس الحرکتہ	انوار احمدی الہ آباد	۱۳۳۲ھ	(فلسفہ)

۳۲ صفحات کا رسالہ ہے۔ اقبال اکادمی سے شائع شدہ اتقان العرفان فی ماہیۃ الزماں میں مطبع کا نام سہواً انوار محمدی تحریر ہو گیا۔

(۶) الحجتہ البازغہ	عثمانی پریس دکن	۱۳۳۴ھ	(فلسفہ)
(۷) حسرت العلماء	مطبع المطابع دہلی	۱۳۱۸ھ	(تذکرہ)

(۸) الصمصام القاضب راس المفتری علی اللہ الکذب نو بہار برقی پریس ملتان

مولانا موصوف کے صاحبزادہ مولانا احمد برکاتی نے ۱۳۴۸ھ میں شائع کرایا۔ نسخہ پر سنہ اور اشاعت درج نہیں ہے۔

(۹) فصل الخطاب کلام و عقائد

یہ سب کتابیں عربی میں تحریر کی گئی ہیں۔ اُردو میں چار رسائل آپ کی یادگار ہیں۔

(۱) الہدایتہ البرکاتیہ کلام و عقائد شمس الاسلام پریس دکن ۱۳۳۴ھ

(۲) التلغراف فقہ جید برقی پریس دہلی

تار کی خبر پر اعتماد و عدم اعتماد پر بحث ہے۔

(۳) مکتوب علم غیب کلام و عقائد کریمی پریس کلکتہ ۱۳۳۲ھ

(۴) صدقہ جاریہ فی ردّ آریہ

دیانند سرسوتی کے فلسفیانہ اصول کی تردید میں تحریر کیا گیا۔ مصنف کے صاحبزادے مولانا محمد احمد برکاتی نے مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔

ثورۃ الہندیہ کے مرتب و مترجم مولانا عبدالشاہد صاحب شیروانی نے لکھا ہے کہ ایک رسالہ نوٹوں کے ہنڈی ہونے یا نہ ہونے پر بھی تصنیف فرمایا تھا۔

مولانا مرحوم کی غیر مطبوعہ تصانیف کا یہاں اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) المعارف الالٰہیہ		عربی الٰہیات

(۲) تقریر ترمذی		عبدالشاہد صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ترمذی شریف کی ایک ضخیم شرح کا بھی آپ نے آغاز کیا تھا۔ شاید یہ اسی کے اجزاء ہوں۔

(۳) تکملہ حاشیہ مفتاح الجمعی		(منطق)

(۴) تحقیق مسئلہ جبر و قدر		(کلام)

(۵) حاشیہ بر حاشیہ عبدالحق بر حاشیہ شرح مواقف		کلام

(۶) میر زاہد		(امور عامہ)

(۷) حاشیہ بر حاشیہ رسالہ قطبیہ میر زاہد		(منطق)

(۸) رسالہ امتناع النظیر		کلام و عقائد

(۹) تنویر المنار		یہ مولانا بحر العلوم کی شرح منار فارسی کا عربی ترجمہ ہے۔

(۱۰) تحقیق انیق

یہ سب تصانیف عربی میں ہیں۔ رسالہ نصایح و احکام اور رسالہ تماثیل بھی تصوف کے موضوع پر عربی میں ہیں۔ تصوف کے موضوع پر ہی دو رسالے تحقیق انیق عربی اور رسالہ وحدۃ الوجود فارسی زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ مرتب القان العرفان فی ماہیتہ الزمان نے وحدۃ الوجود کے بجائے رسالہ در بحث وجود تحریر کیا ہے۔ شاید یہ رسالہ ان کی نظر سے نہیں گذرا۔ مولانا وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ اس رسالہ میں وحدۃ الوجود کے حق میں دلائل دیے گئے ہیں اور اس کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ عبارت عربی آمیز ہے۔ مولانا کی عمر درس و تدریس میں صرف ہوئی تھی۔ انداز تحریر مدرسانہ ہے۔ مختلف طریقوں سے وحدۃ الوجود کے حق میں دلائل دے کر قایل کرتے ہیں۔

مولانا ایک حاذق حکیم بھی تھے۔ رموز الاطباء میں آپ کی طبی مہارت کے کئی قصے درج ہیں۔ طب کے موضوع پر آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) بیاض جامع البرکات

(۲) سرور المعالجین

(۳) کتاب التنکابیس

(۴) رحمتہ الٰہی فی الباہ

(۵) کتاب الامانت فی الطب

(۶) رسالہ تپ کہ بعد سہلات باقی ماند

(۷) رسالہ آتشک

(۸) رسالہ ماء الجبن

(۹) ملاج النساء

(۱۰) القول المتین فی مایتعلق بالجلی ادا لجنین

مولانا عبدالشاہد صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کی کل کتابیں عربی میں ہیں لیکن اُن کی کتابیں فارسی، عربی اور اُردو تینوں زبانوں میں ہیں جیسا کہ اُن کی تصانیف کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے خود شاہد صاحب نے ثورۃ الہندیہ میں آگے تحریر کیا ہے کہ اُردو میں اگر حضرت کی یادگار ہے تو یہی (صدقہ جاریہ فی ردّ آریہ) ہے۔ ہم موضوع اور زبان اُن کی تصانیف کے آگے درج کر چکے ہیں۔

مولانا برکات احمد صاحب کی تصانیف مختلف موضوعات پر ہیں۔ مگر بقول عبدالشاہد صاحب شیروانی ..... بہر حال حدیث و تصوّف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جس کی مانگ علم کے جدید دور میں مشکل سے ہوگی۔ شاہد صاحب کے بیان پر میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ موضوع کے علاوہ مولانا کا مغلق طرز نگارش بھی عدم دلچسپی کا باعث ہے۔ اقبال شناسی کے دور میں لوگوں کو فلسفہ زمان و مکان سے دلچسپی ہوئی تو اتقان فی ماہیۃ الزمان ترجمہ ہو کر شائع ہو گئی۔ نبراس الحرکتہ کا بھی ترجمہ ہونا چاہیئے۔

مولانا مرحوم کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔ اُن میں قابلِ ذکر آپ کے فرزند مولانا محمد احمد[۴۳]، کلیم رضی الدین خاں دہلوی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد علی صاحب عرف مولوی ننھے، مولانا محمد شریف اعظم گڑھی، مولانا عرفان صاحب[۴۴]،

مولانا عبدالقدیر بدایونی[۵] مولانا عبدالواسع صاحب[۶]، مولانا عبدالرحمٰن چشتی ہیں ۔ مولانا سے ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ بلخ و بخارا و سمرقند وغیرہ کے طلباء بھی ٹونک آکر تحصیل علم کیا کرتے تھے ۔

مولانا موصوف کے دور میں تقلید و عدم تقلید اور چند کلامی مسائل اور فروعی موضوعات کا بڑا غلغلہ تھا چنانچہ ایک مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا بھی تھا ۔ چنانچہ اس مسئلہ پر بھی اظہار خیال کیا گیا ۔

بقول خواجہ حمید ...... " لیکن اس کے باوجود ۱۸۵۷ء سے قبل امام المتکلمین مولانا فضل حق خیرآبادی ..... اور ۱۸۵۷ء کے بعد ...... مولانا برکات احمد ٹونکی ...... اور دیگر علماء نے عدم تقلید کے فتنہ کی سرکوبی کے لئے کھل کر کام کیا ۔"

باری تعالیٰ کا صفت کذب کے ساتھ اتصاف محال و ممتنع بذاتہ ہے کیونکہ کذب صفات کمالیہ میں سے نہیں ہے بلکہ نقص ہے ۔ نقص کے ساتھ باری تعالیٰ کا اتصاف مستحیل لذاتہ ہے اور مستحیل داخل تحت قدرت نہیں ۔ اس مسئلہ پر بالعصام القاضب لراس المفتری علی اللہ الکذب تصنیف فرمایا ۔

اس دور میں ان مباحث کا بازار سرد ہو چکا ہے ۔ لہٰذا ان موضوعات پر تصنیف شدہ کتابیں علمی یادگار ہیں ۔ نیز مولانا کی بیشتر تصانیف عربی و فارسی میں ہیں جن کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے ۔ اس لئے ان کتب کی مانگ جدید دور میں کس طرح ہو سکتی ہے ۔!

فقہی مسائل ۔۔ تار کی خبر پر اعتماد و عدم اعتماد، ہنڈی وغیرہ کے مسائل طے ہو چکے ہیں ۔ فلسفہ و طبیعات کا میدان و موضوع بالکل بدل گیا ہے اس لئے ان ... موضوعات پر کی گئی تصنیفات اُس دور کے آثار و یادگار کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل ہو گئی ہیں ۔ بہرحال یہ تاریخی ہیں اور علمی مباحث پر مبنی ہیں جو مولانا مرحوم کے علمی تبحر کی نشان دہی کرتی ہیں ۔

مولانا علم پرور، مرنجاں مرنج اور سادہ طبیعت کے مالک تھے ۔ مولانا کا ایک فوٹو

(۳) کتاب التکایس

(۴) رحمتہ الہٰی فی الباہ

(۵) کتاب الامانت فی الطب

(۶) رسالہ تب کہ بعد مسہلات باقی ماند

(۷) رسالہ آتشک

(۸) رسالہ ماء الجبن

(۹) علاج النساء

(۱۰) القول المتین فی ما یتعلق بالحبلی او الجنین

مولانا عبدالشاہد صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کی کل کتابیں عربی میں ہیں لیکن اُن کی کتابیں فارسی، عربی اور اُردو تینوں زبانوں میں ہیں جیسا کہ اُن کی تصانیف کی فہرست سے ظاہر ہوتا ہے خود شاہد صاحب نے ثورۃ الہندیہ میں آگے تحریر کیا ہے کہ اُردو میں اگر حضرت کی یادگار ہے تو یہی (صدقہ جاریہ فی ردّ آریہ) ہے۔ ہم موضوع اور زبان اُن کی تصانیف کے آگے درج کر چکے ہیں۔

مولانا برکات احمد صاحب کی تصانیف مختلف موضوعات پر ہیں۔ مگر بقول عبدالشاہد صاحب شیروانی ..... بہر حال حدیث و تصوّف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جس کی مانگ علم کے جدید دور میں مشکل سے ہوگی۔ شاہد صاحب کے بیان پر میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ موضوع کے علاوہ مولانا کا مغلق طرز نگارش بھی عدم دلچسپی کا باعث ہے۔ اقبال شناسی کے دور میں لوگوں کو فلسفہ زمان و مکان سے دلچسپی ہوئی تو اتقان فی ماہیۃ الزمان ترجمہ ہو کر شائع ہو گئی۔ نبراس الحرکتہ کا بھی ترجمہ ہونا چاہیئے۔

مولانا مرحوم کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے۔ اُن میں قابلِ ذکر آپ کے فرزند مولانا محمد احمد، کلیم رضی الدین خاں دہلوی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد علی صاحب عرف مولوی ننھے، مولانا محمد شریف اعظم گڑھی، مولانا عرفان صاحب،

مولانا عبدالقدیر بدایونی ؒ مولانا عبدالواسع صاحبؒ، مولانا عبدالرحمٰن چشتی ہیں۔ مولانا سے ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ بلخ و بخارا و سمرقند وغیرہ کے طلباء بھی ٹونک آکر تحصیل علم کیا کرتے تھے۔

مولانا موصوف کے دور میں تقلید و عدم تقلید اور چند کلامی مسائل اور فروعی موضوعات کا بڑا غلغلہ تھا چنانچہ ایک مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا بھی تھا۔ چنانچہ اس مسئلہ پر بھی اظہار خیال کیا گیا۔

بقول خواجہ حیدر...... "لیکن اس کے باوجود ۱۸۵۷ء سے قبل امام المتکلمین مولانا فضل حق خیر آبادی...... اور ۱۸۵۷ء کے بعد...... مولانا برکات احمد ٹونکی...... اور دیگر علماء نے عدم تقلید کے فتنہ کی سرکوبی کے لئے کھل کر کام کیا" ۔

باری تعالیٰ کا صفت کذب کے ساتھ اتصاف محال و ممتنع لذاتہ ہے کیونکہ کذب صفات کمالیہ میں سے نہیں ہے بلکہ نقص ہے۔ نقص کے ساتھ باری تعالیٰ کا اتصاف مستحیل لذاتہ ہے اور مستحیل داخل تحت قدرت نہیں۔ اس مسئلہ پہ بالعصام القاضب راس المفتری علی اللہ الکذب تصنیف فرمایا۔

اس دور میں ان مباحث کا بازار سرد ہو چکا ہے۔ لہٰذا ان موضوعات پر تصنیف شدہ کتابیں علمی یادگار ہیں۔ نیز مولانا کی بیشتر تصانیف عربی و فارسی میں ہیں جن کا رواج کم ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے ان کتب کی مانگ جدید دور میں کس طرح ہو سکتی ہے۔!

فقہی مسائل ـــ تار کی خبر پر اعتماد و عدم اعتماد، ہنڈی وغیرہ کے مسائل طے ہو چکے ہیں۔ فلسفہ و طبیعات کا میدان و موضوع بالکل بدل گیا ہے اس لئے ان... موضوعات پر کی گئی تصنیفات اس دور کے آثار و یادگار کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل ہو گئی ہیں۔ بہر حال یہ تاریخی ہیں اور علمی مباحث پر مبنی ہیں جو مولانا مرحوم کے علمی تبحر کی نشان دہی کرتی ہیں۔

مولانا علم پرور، مرنجاں مرنج اور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ مولانا کا ایک فوٹو

رموز الاطباء میں ہے۔ یہ فوٹو حاجی کرنیل عبدالرحمن خاں صاحب نے بطور مذاق دھوکہ دے کر اتارا تھا۔

مولانا مرحوم کی زندگی تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں گذری۔ ٹونک ریاست اُن کے دور میں تشنگان علم کے لئے سرچشمۂ خیر و برکات تھا جس سے ہندو بیرون ہند کے طلباء فیضیاب ہوتے تھے۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں صاحب نے تحریر کیا ہے کہ "اُن کی زندگی فضل و کمال کی زندگی تھی اور اُن کی موت فضل و کمال کی موت ہے"[۹]

حواشی۔ [۱] مولانا محمد علی عرف ننھے (وفات ۱۹۶۹ء) سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ صوفی مولانا ابراہیم خانصاحب رؔدی کے مرید تھے۔ دارالعلوم ناصریہ میں صدر مدرس تھے۔

[۲]۔ نواب امین الدولہ حافظ محمد ابراہیم علی خانصاحب بہادر ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۸ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ خلیل تخلص تھا۔ ٹونک کے مشہور و معروف میلاد شریف میں آپ کی غزلیں ہیں۔ خیابان خلیل مرتبہ اصغر علی ناظم میں آپ کا کچھ کلام محفوظ ہے۔

[۳] مشہور و معروف مصنف صدر شعبہ دینیات جامعہ حیدرآباد۔

[۴]۔ ناظم و مفتی شرح شریف ریاست ٹونک۔ [۵]۔ مفتی اعظم دکن۔ [۶]۔ شیخ الفقہ جامعہ عثمانیہ۔ [۷]۔ محدث سورتی مطبوعہ کراچی۔ [۸]۔ کرنیل افواج ریاست ٹونک۔ مصنف رہنمائے شکار و دستور اکبری۔ [۹]۔ رہنمائے شکار۔

مراجع۔

(۱) باغی ہندوستان (ثورۃ الہندیہ) مولانا عبدالشاہد شیروانی
(۲) اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان مترجمہ۔ محمود احمد برکاتی
(۳) نبراس الحرکتہ مولانا برکات احمد
(۴) بالصمصام القاضب راس المفتری علی اللہ الکذب مولانا برکات احمد
(۵) وحدۃ الوجود (قلمی) مولانا برکات احمد

برہان

| جلد [illegible] | جون ۱۹۹۱ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ | شمارہ ۶ |

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۱۹۹۱ء کے وسط مدتی انتخابات بھی ہو گئے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ میں مختلف جماعتوں کی جو پوزیشن سامنے آئی ہے اس کے مطابق کانگریس پارٹی نشستوں کے لحاظ سے سب سے بڑی پارٹی ہے۔ اس کو پارلیمنٹ میں دو سو چالیس کے قریب نشستیں حاصل ہوئی ہیں۔ اس کے بعد جو دوسری بڑی پارٹی ابھر کر سامنے آئی ہے وہ بھارتیہ جنتا پارٹی ہے۔ اس کے ممبران کی تعداد ایک سو تیئیس کے قریب ہے۔ جنتا دل، کمیونسٹ، مارکسوادی کمیونسٹ، تیلگو دیشم، سماج وادی جنتا دل اور دیگر آزاد ممبران کی تعداد کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی سے بہت کم ہے۔

چالیس سال کی محنت، جدوجہد، تگڑم اور ہر طرح کے پاپڑ بیلنے کے بعد ۱۹۹۱ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو آخر اپنے مقصد میں اس حد تک تو کامیابی نصیب ہو ہی گئی کہ وہ پارلیمنٹ میں واحد اپوزیشن پارٹی کی صورت میں اپوزیشن کو ملنے والی تمام سہولیات کی حقدار ہو گی۔ اپوزیشن لیڈر کو کابینی وزیر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے پارلیمنٹری لیڈر کو بھی وہی درجہ حاصل ہوگا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے انتخابات کے دوران میں مذہبی نعروں کا جس طرح استعمال کیا اور سیکولرزم کے بارے میں اپنے خیالات کو جس طرح ظاہر کیا اس سے

کمشنر کو آگاہ بھی کر رہے تھے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اپنا پورا زور مذہبی نعروں کے ساتھ الیکشن لڑنے اور جیتنے میں لگا رہی ۔ اس نے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی کہ اس کے مذہبی نعروں کو الیکشن میں استعمال کرنے کے خلاف کون کیا کچھ کہہ رہا ہے۔

۱۹۹۱ء کے وسط مدتی انتخاب کا اور اس سے پہلے ۱۹۸۴ء و ۱۹۸۹ء کے عام انتخابات کا اگر ہم تجزیہ کریں تو ہمیں ملک و قوم کے مفاد کے نظریہ کے تحت افسوس و تاسف اور مایوسی ہی ہاتھ لگے گی۔

ان تینوں الیکشنوں میں کہیں بھی سیکولرزم یا سوشلزم کی فتح یابی نہیں ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں شریمتی اندرا گاندھی کے قتل سے کانگریس کے لئے عوام میں ہمدردی پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں شری راجیو گاندھی کی قیادت میں کانگریس پارٹی کو پنڈت جواہرلال نہرو کے زمانے سے بھی زیادہ پارلیمنٹ میں نشستیں دستیاب ہوئیں۔ اور ۱۹۸۹ء میں کانگریس کے خلاف غصہ نے مرکزی حکومت سے کانگریس کو بے دخل کر دیا اور ۱۹۹۱ء نے ایک عجیب وغریب منظر ہی پیش کیا۔ کانگریس کے خلاف ایک طرف جنتا دل، کمیونسٹ اور مارکسوادی کمیونسٹ تھے تو دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی کا جذبات انگیز مذہبی محاذ تھا۔

اس سارے چکر میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنے آپ کو جس طرح سنبھالا وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک انہونی کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ مرکز میں تو بھارتیہ جنتا پارٹی حکومت بنانے سے کسی طرح رہ ہی گئی ہے۔ لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ یوپی میں اس کی حکومت کی تشکیل ہو گئی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ بہت بڑی بات ہے۔ ملک کے سیکولرازم کے جاں نثاروں کے لئے سخت تشویش کی بات بھی ہے۔ جو پارٹی ۱۹۸۴ء میں صرف ۲ نشستیں ہی پارلیمنٹ کی حاصل کر پائی تھی وہ ۱۹۸۹ء میں ۸۶ اور ۱۹۹۱ء میں ایک سو تئیس حاصل کر گئی۔ اس سے بڑھ کر اس کے لئے کامیابی کی رفتار اور کیا ہو سکتی ہے مستقبل میں

[illegible] پاس سے بھی زیادہ نشستیں حاصل کرے اور تمام سیکولر پارٹیوں [illegible]
[illegible] کا اقتدار [illegible] اب ان کا [illegible] کوئی کردار [illegible] ہو۔
ہمارے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تمام سیکولر نظریات کے حامل اصحاب اور
جماعتیں اس حقیقت کو باور کر لیں کہ ہندوستان کے سیکولرزم کی بقا اور حفاظت
کے لئے انھیں اپنے تمام اختلافات کو مٹا کر کوئی متحدہ پلیٹ فارم بنا لینا چاہئے۔
بھارتیہ جنتا پارٹی ابھی جگہ بنا چکی ہے۔ اور جتنی جگہ اس نے بنالی ہے اس کا منصوبہ
اس سے بڑی جگہ بنانے کا ہے۔ اس کے اس منصوبہ کو کس طرح ناکام بنایا جائے اس
کی زبردست ضرورت ہے۔ اب سیکولر نظریات کی حامل جماعتوں کے لئے ضروری ہے
کہ انھیں ذاتی و سیاسی اختلافات فی الفور ختم کر دینے چاہئیں اور خطرہ کا مقابلہ
وہ جب ہی کر سکتے ہیں کہ جب وہ متحد ہوں گے۔ ان کا الگ الگ رہنا ہی بھارتیہ
جنتا پارٹی کی تقویت کا باعث ہے۔

اگر خدانخواستہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنے الیکشن مینی فسیٹو کے مطابق
عمل درآمد شروع کیا تو ملک میں زبردست انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ بابری
مسجد، رام جنم بھومی کے سلسلے میں اس نے اپنے جس عزم کا اظہار کیا ہے وہ ملک کی
فلاح کے لئے نیک شگون قطعاً نہیں ہے۔

شکر ہے خدا کا کہ مرکز میں اقتدار کانگریس پارٹی کے ہاتھ میں ہے اس لئے
کانگریس کی ذمہ داری ہے کہ وہ سیکولر قدروں کی نگہداشت کرے۔ اگر یوپی
میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے کوئی اینٹی سیکولر حرکت کی تو مرکز کو اپنی
پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہونا ہے۔ یہ وقت کانگریس
کے امتحان کا ہے، کانگریس کے سیکولرزم کے دعوٰی کی حقیقت کو پرکھنے کا ہے
ہمیں امید ہے کہ کانگریس اپنے اس امتحان میں کامیاب ہوگی کیونکہ اسی میں ملک و
قوم کا فلاح و بہبود [illegible] گاندھی، نہرو، مولانا آزاد [illegible]

بہرحال جنگ آزادی کے شہیدوں ومجاہدوں کی وارث کانگریس کی سب سے کڑی آزمائش کا یہ دور ہے۔ اور ہر محب وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اس مشکل گھڑی میں ملک وقوم کے مفاد کے خاطر اتحاد واتفاق کے ساتھ ملک وقوم کی تعمیر وترقی میں کوشاں رہے۔!

بہرحال یہ وقت ہے اور صحیح وقت ہے کہ کانگریس سیکولرزم کے اصولوں پر ایمانداری کے ساتھ عمل کرے۔ کانگریس کے لئے، ملک کے لئے اور ملک کے عوام کی بھلائی کے لئے کانگریس کو ہر قیمت پر پوری پوری ایمانداری کے ساتھ... سیکولرزم کے اصولوں پہ عمل کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ.....!

گذارش

جوابی امور و خط وکتابت نیز منی آرڈر کرتے وقت اپنا خریداری نمبر حوالہ دینا نہ بھولیں خریداری یاد نہ ہونے کی صورت میں کم از کم جس نام سے آپ کا رسالہ جاری ہے۔ اس کی وضاحت ضرور فرمائیں۔

چیک سے رقم نہ روانہ کریں صرف ڈرافٹ سے روانہ کریں۔ اور اس نام سے بنائیں۔ ڈ "برہان دہلی" "BURHAN DELHI"

پتہ۔ ماہنامہ برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

زکوۃ کے مستحق کون ہیں؟

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

(۲)

ظاہر ہے کہ جہاد کا قتالی (جنگی) مفہوم لے کر ہم موجودہ دور میں اس میدان میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ فوجی و عسکری اور سیاسی میدان میں آج ہم پوری طرح مغلوب بلکہ شکست خوردہ قوموں کے مقام پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ لہٰذا جہاد کا دوسرا مفہوم (جو دراصل جہاد کی تعریف اور اُس کے مقصد کے لحاظ سے اول نمبر پر آتا ہے) اختیار کئے بغیر چارہ نہیں، ہے۔ اور اسی میں آج نہ صرف ہماری سلامتی بلکہ پوری انسانی دنیا کی سلامتی ہے۔ کیونکہ موجودہ دور "بین الاقوامی تعلقات" "حقوقِ انسانی" اور "فکر و نظر کی آزادی" کا دور ہے۔ اور پوری دنیا سمٹ کر ایک شہر اور ایک قبیلے کی طرح ہوگئی ہے۔ لہٰذا ان تمام اعتبارات سے موجودہ دور میں "قتالی جہاد" ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس قسم کا اقدام مسلمانوں کی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس طرح اب جہاد کی واحد شکل "علمی جہاد" کی باقی رہ جاتی ہے، جس کو ہر دور، ہر ملک، ہر وقت اور ہر حال میں جاری رکھا جاسکتا ہے۔ اور یہی چیز جہاد کی اصل رُوح اور اس کی اسپرٹ ہے۔ چنانچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں اسی قسم کے جہاد کا مظاہرہ "پُرامن طریقے سے" کیا تھا، جو ہمارے لئے ایک مثال اور نمونہ ہے کہ ہم مغلوب ہونے کی صورت میں یہی طریقہ اپنائیں۔

اب اس کے برعکس اگر معترض کو "قتالی جہاد" ہی پر اصرار ہے تو پھر اُن کے لئے خاموش ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اُنہیں قرآن اور حدیث کے حکم کے مطابق فوراً جہادِ عسکری کا بازار گرم کرنا چاہئے۔ ورنہ وہ خُدا کی نافرمانی کے مرتکب ہوں گے۔ نیز اس سلسلے میں اُن پر یہ بھی لازم ہوگا کہ وہ موجودہ دور میں بھی جہاد یا تو "ہاتھ سے کریں یا زیادہ سے زیادہ "تلوار" سے۔ جدید ہتھیاروں کو وہ ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اُن کی نظر میں کسی "علّتِ مشترکہ" کی بنا پر قیاس کرنا اور کسی منصوص حکم سے کسی غیر منصوص حکم پر استدلال کرنا جائز

کے مطابق جنگ صرف ہاتھ یا تلوار ہی سے کرنی پڑے گی اور جدید ہتھیاروں کا استعمال ان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ (کیونکہ علمی جہاد کو لسانی جہاد پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان دونوں میں "اعلائے کلمۃ اللہ" کو مشترکہ علت قرار دینے سے معترض کی نظر میں شریعت پر قیامت آ جاتی ہے)

بہرحال اب خود اُن کے فتوے کے مطابق ضروری ہے کہ وہ ہاتھ میں تلوار لے کر نکلیں اور لوگوں کو اس کے زور پر کلمہ پڑھوائیں۔ اگر ساری دنیا کے "کفار" کو نہ سہی صرف لکھنؤ ہی کے کافروں کو وہ اس طرح کلمہ پڑھوا دیں تو واقعی اُن کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ مگر اس موقع پر یہ بھی یاد رہے کہ آپ کو صرف اصطلاحی کافروں ہی کو قتل کرنا پڑے گا۔ کسی مُلحد یا بے دین کو آپ ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ وہ اصطلاحاً "کُفار" کی تعریف میں آتے ہی نہیں۔ اور چونکہ آپ کے نزدیک قیاس ناجائز ہے، لہٰذا آپ جدید قسم کے "منکرینِ خُدا" کو کفار پر قیاس نہیں کر سکتے: ورنہ اس سے خود آپ ہی کے نقطۂ نظر سے "خرقِ اجماع" لازم آئے گا۔ کیونکہ تمام مفسرین، محدثین، فقہاء اور قدیم علماء نے کفار کا جو اصطلاحی مفہوم مراد لیا ہے وہ وہی ہو سکتا ہے جو دورِ رسالت میں تھا۔ یعنی مشرکین جو "کئی خُداؤں" کے قائل تھے۔ مگر جدید ملحدین چونکہ سرے سے خُدا کے قائل ہی نہیں ہیں، لہٰذا آپ کے نقطۂ نظر سے کسی مُلحد کو قتل کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ اب آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

مگر یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ معترض اس قسم کا جہاد تو ہرگز نہیں کر سکتے اور نہ اس کا ارادہ ہی کر سکتے ہیں۔ ورنہ اُن کا جو حشر ہوگا وہ سامنے کی بات ہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اب جہاد کی جو دوسری شکل باقی رہ گئی ہے وہ بھی معطل و منسوخ ہو جائے۔ یعنی "نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری"۔

قارئینِ کرام! آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد (چاہیے

نوٹ چنانچہ معترض نے ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے ایک درست قیاسی استدلال پر خواہ مخواہ تنقید کرتے ہوئے اسے "شریعت پر قیامت ڈھانے والی بات" قرار دیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اگلے باب میں آ رہی ہے۔ اور اس بحث کا

نظرات

۱۹۹۱ء کے وسط مدتی انتخابات بھی ہو گئے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ میں مختلف جماعتوں کی جو پوزیشن سامنے آئی ہے اس کے مطابق کانگریس پارٹی نشستوں کے لحاظ سے سب سے بڑی پارٹی ہے۔ اس کو پارلیمنٹ میں دو سو چالیس کے قریب نشستیں حاصل ہوئی ہیں۔ اس کے بعد جو دوسری بڑی پارٹی ابھر کر سامنے آئی ہے وہ بھارتیہ جنتا پارٹی ہے۔ اس کے ممبران کی تعداد ایک سو تیئیس کے قریب ہے۔ جنتا دل، کمیونسٹ، مارکسوادی کمیونسٹ، تیلگو دیشم، سماج وادی جنتا دل اور دیگر آزاد ممبران کی تعداد کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی سے بہت کم ہے۔

چالیس سال کی محنت، جد و جہد، تگ و دو اور ہر طرح کے پاپڑ بیلنے کے بعد ۱۹۹۱ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو آخر اپنے مقصد میں اس حد تک تو کامیابی نصیب ہو ہی گئی کہ وہ پارلیمنٹ میں واحد اپوزیشن پارٹی کی صورت میں اپوزیشن کو ملنے والی تمام سہولیات کی حقدار ہو گی۔ اپوزیشن لیڈر کو کابینی وزیر کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے پارلیمنٹری لیڈر کو بھی وہی درجہ حاصل ہو گا۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے انتخابات کے دوران میں مذہبی نعروں کا جس طرح استعمال کیا اور سیکولرزم کے بارے میں اپنے خیالات کو جس طرح ظاہر کیا اس سے

کمشنر کو آگاہ بھی کر رہے تھے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اپنا پورا زور مذہبی نعروں کے ساتھ الیکشن لڑنے اور جیتنے میں لگا رہی ہے۔ اس نے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی کہ اس کے مذہبی نعروں کو الیکشن میں استعمال کرنے کے خلاف کون کیا کچھ کہہ رہا ہے۔

۱۹۹۱ء کے وسط مدتی انتخاب کا اور اس سے پہلے ۱۹۸۴ء و ۱۹۸۹ء کے عام انتخابات کا اگر ہم تجزیہ کریں تو ہمیں ملک و قوم کے مفاد کے نظریہ کے تحت افسوس و تاسف اور مایوسی ہی ہاتھ لگے گی۔

ان تینوں الیکشنوں میں کہیں بھی سیکولرزم یا سوشلزم کی فتح یابی نہیں ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں شریمتی اندرا گاندھی کے قتل سے کانگریس کے لئے عوام میں ہمدردی پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں شری راجیو گاندھی کی قیادت میں کانگریس پارٹی کو پنڈت جواہر لال نہرو کے زمانے سے بھی زیادہ پارلیمنٹ میں نشستیں دستیاب ہوئیں۔ اور ۱۹۸۹ء میں کانگریس کے خلاف غصہ نے مرکزی حکومت سے کانگریس کو بے دخل کر دیا اور ۱۹۹۱ء نے ایک عجیب و غریب منظر ہی پیش کیا۔ کانگریس کے خلاف ایک طرف جنتا دل، کمیونسٹ اور مارکسوادی کمیونسٹ تھے تو دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی کا جذبات انگیز مذہبی محاذ تھا۔

اس سارے چکر میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنے آپ کو جس طرح سنبھالا وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک انہونی کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ مرکز میں تو بھارتیہ جنتا پارٹی حکومت بنانے سے کسی طرح رہ ہی گئی ہے۔ لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ یوپی میں اس کی حکومت کی تشکیل ہو گئی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ بہت بڑی بات ہے۔ ملک کے سیکولرازم کے جاں نثاروں کے لئے سخت تشویش کی بات بھی ہے۔ جو پارٹی ۱۹۸۴ء میں صرف ۲ نشستیں ہی پارلیمنٹ کی حاصل کر پائی تھی وہ ۱۹۸۹ء میں ۸۶ اور ۱۹۹۱ء میں ایک سو تئیس حاصل کر گئی۔ اس سے بڑھ کر اس کے لئے کامیابی کی رفتار اور کیا ہو سکتی ہے مستقبل میں

یا اس سے بھی زیادہ نشستیں حاصل کر کے اقتدار سیکولر پارٹیوں کو آپس میں
لڑا کر مرکز میں اقتدار حاصل کر لے۔ اب اس حقیقت کو کسی کو شاید ہی انکار ہو۔
ہمارے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تمام سیکولر نظریات کے حامل اصحاب اور
جماعتیں اس حقیقت کو باور کر لیں کہ ہندوستان کے سیکولرزم کی بقا و حفاظت
کے لئے انہیں اپنے تمام اختلافات کو مٹا کر کوئی متحدہ پلیٹ فارم بنا لینا چاہیے۔
بھارتیہ جنتا پارٹی اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ اور حقیقت یہ کہ اس نے چال چلی ہے اس کا منصوبہ
اس سے بڑی جگہ بنانے کا ہے۔ اس کے اس منصوبہ کو کس طرح ناکام بنایا جائے اس
کی زبردست ضرورت ہے۔ اب سیکولر نظریات کی حامل جماعتوں کے لئے ضروری ہے
کہ انہیں ذاتی و سیاسی اختلافات فی الفور ختم کر دینے چاہئیں اور خطرہ کا مقابلہ
وہ جب ہی کر سکتے ہیں کہ جب وہ متحد ہوں گے۔ ان کا الگ الگ رہنا بھی بھارتیہ
جنتا پارٹی کی تقویت کا باعث ہے۔

اگر خدانخواستہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اپنے الیکشن مینی فسیٹو کے مطابق
عمل درآمد شروع کیا تو ملک میں زبردست انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ بابری
مسجد، رام جنم بھومی کے سلسلے میں اس نے اپنے جس عزم کا اظہار کیا ہے وہ ملک کی
فلاح کے لئے نیک شگون قطعاً نہیں ہے۔

شکر ہے خدا کا کہ مرکز میں اقتدار کانگریس پارٹی کے ہاتھ میں ہے اس لئے
کانگریس کی ذمہ داری ہے کہ وہ سیکولر قدروں کی نگہداشت کرے۔ اگر یو۔پی
میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے کوئی اینٹی سیکولر حرکت کی تو مرکز کو اپنی
پوری طاقت سے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہونا ہے۔ یہ وقت کانگریس
کے امتحان کا ہے، کانگریس کے سیکولرزم کے دعوے کی حقیقت کو چمکانے کا ہے
ہمیں امید ہے کہ کانگریس اپنے اس امتحان میں کامیاب ہوگی کیونکہ اسی میں ملک و
قوم کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ گاندھی و نہرو، مولانا آزاد و دوسرے سیکولروں

پہلا یعنی جنگ آزادی کے شہیدوں و مجاہدوں کی وارث کانگریس کی سب سے کڑی آزمائش کا یہ وقت ہے۔ اور ہر محب وطن ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ اس مشکل گھڑی میں ملک و قوم کے مفاد کے خاطر اتحاد و اتفاق کے ساتھ ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں کوشاں رہے۔!

بہرحال یہ وقت ہے اور صحیح وقت ہے کہ کانگریس سیکولرزم کے اصولوں پر ایمانداری کے ساتھ عمل کرے۔ کانگریس کے لئے، ملک کے لئے اور ملک کے عوام کی بھلائی کے لئے کانگریس کو ہر قیمت پر پوری پوری ایمانداری کے ساتھ ... سیکولرزم کے اصولوں پر عمل کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ .....!

گذارش

جوابی امور و خط و کتابت نیز منی آرڈر کرتے وقت اپنا خریداری نمبر حوالہ دینا نہ بھولیں خریداری یاد نہ ہونے کی صورت میں کم از کم جس نام سے آپ کا رسالہ جاری ہے۔ اس کی وضاحت ضرور فرمائیں۔

چیک سے رقم نہ روانہ کریں صرف ڈرافٹ سے روانہ کریں۔ اور اس نام سے بنائیں۔ "برہان دہلی" "BURHAN DELHI"

پتہ ۔ ماہنامہ برہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں؟

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور ۲۶

(۲)

ظاہر ہے کہ جہاد کا قتالی (جنگی) مفہوم لے کر ہم موجودہ دور میں اس میدان میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ فوجی و عسکری اور سیاسی میدان میں آج ہم پوری طرح مغلوب بلکہ شکست خوردہ قوموں کے مقام پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ لہٰذا جہاد کا دوسرا مفہوم (جو دراصل جہاد کی تعریف اور اُس کے مقصد کے لحاظ سے اول نمبر پر آتا ہے) اختیار کئے بغیر چارہ نہیں، ہے۔ اور اسی میں آج نہ صرف ہماری سلامتی بلکہ پوری انسانی دنیا کی سلامتی ہے۔ کیونکہ موجودہ دور "بین الاقوامی تعلقات" "حقوقِ انسانی" اور "فکر و نظر کی آزادی" کا دور ہے۔ اور پوری دنیا سمٹ کر ایک شہر اور ایک قبیلے کی طرح ہوگئی ہے۔ لہٰذا ان تمام اعتبارات سے موجودہ دور میں "قتالی جہاد" ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس قسم کا اقدام مُسلمانوں کی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ اس طرح اب جہاد کی واحد شکل "علمی جہاد" کی باقی رہ جاتی ہے، جس کو ہر دور، ہر ملک، ہر وقت اور ہر حال میں جاری رکھا جاسکتا ہے۔ اور یہی چیز جہاد کی اصل رُوح اور اس کی اسپرٹ ہے۔ چنانچہ رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے مکی زندگی میں اسی قسم کے جہاد کا مظاہرہ "پُرامن طریقے سے" کیا تھا، جو ہمارے لئے ایک مثال اور نمونہ ہے کہ ہم مغلوب ہونے کی صُورت میں یہی طریقہ اپنائیں۔

اب اس کے برعکس اگر معترض کو "قتالی جہاد" ہی پر اصرار ہے تو پھر اُن کے لئے خاموش ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ اُنہیں قرآن اور حدیث کے حکم کے مطابق فوراً جہادِ عسکری کا بازار گرم کرنا چاہئے۔ ورنہ وہ خُدا کی نافرمانی کے مرتکب ہوں گے۔ نیز اس سلسلے میں اُن پر یہ بھی لازم ہوگا کہ وہ موجودہ دور میں بھی جہاد یا تو "ہاتھ سے کریں یا زیادہ سے زیادہ "تلوار" سے۔ جدید ہتھیاروں کو وہ ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اُن کی نظر میں کسی "علّتِ مشترکہ" کی بنیاد پر قیاس کرنا اور کسی منصوص حکم سے کسی غیر منصوص حکم پر استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ بقول خود اس [illegible] عبادات کی شکل [illegible] رہ جاتی ہے۔ لہٰذا معترض کی منطق

کے مطابق جنگ صرف ہاتھ یا تلوار ہی سے کرنی پڑے گی اور جدید ہتھیاروں کا استعمال ان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ (کیونکہ علمی جہاد کو لسانی جہاد پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اوران دونوں میں "اعلائے کلمۃ اللہ" کو مشترکہ علت قرار دینے سے معترض کی نظر میں شریعت پر قیامت آجاتی ہے)

بہرحال اب خود اُن کے فتوے کے مطابق ضروری ہے کہ وہ ہاتھ میں تلوار لے کر نکلیں اور لوگوں کو اس کے زور پر کلمہ پڑھوائیں۔ اگر ساری دنیا کے "کفار" کو نہ سہی صرف لکھنؤ ہی کے کافروں کو وہ اس طرح کلمہ پڑھوادیں تو واقعی اُن کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ مگر اس موقع پر یہ بھی یاد رہے کہ آپ کو صرف اصطلاحی کافروں ہی کو قتل کرنا پڑے گا۔ کسی ملحد یا بے دین کو آپ ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ وہ اصطلاحاً "کفار" کی تعریف میں آتے ہی نہیں۔ اور چونکہ آپ کے نزدیک قیاس ناجائز ہے لہٰذا آپ جدید قسم کے "منکرینِ خدا" کو کفار پر قیاس نہیں کرسکتے۔ ورنہ اس سے خود آپ ہی کے نقطۂ نظر سے "خرقِ اجماع" لازم آئے گا۔ کیونکہ تمام مفسرین، محدثین، فقہاء اور قدیم علماء نے کفار کا جو اصطلاحی مفہوم مراد لیا ہے وہ وہی ہوسکتا ہے جو دورِ رسالت میں تھا۔ یعنی مشرکین جو "کئی خداؤں" کے قائل تھے۔ مگر جدید ملحدین چونکہ سرے سے خدا کے قائل ہی نہیں ہیں، لہٰذا آپ کے نقطۂ نظر سے کسی ملحد کو قتل کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ اب آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

مگر یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ معترض اس قسم کا جہاد تو ہرگز نہیں کرسکتے اور نہ اس کا ارادہ ہی کرسکتے ہیں۔ ورنہ اُن کا جو حشر ہوگا وہ سامنے کی بات ہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ اب جہاد کی جو دوسری شکل باقی رہ گئی ہے وہ بھی معطل و منسوخ ہو جائے۔ یعنی "نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری"![1]

قارئینِ کرام! آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد (چاہے

---

[1] چنانچہ معترض نے ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے ایک درست قیاسی استدلال پر خواہ مخواہ تنقید کرتے ہوئے اسے "شریعت پر قیامت ڈھانے والی بات" قرار دیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اگلے باب میں آرہی ہے۔ اور اس بحث کا ایک حصہ گیارہویں باب میں بھی گزر چکا ہے۔ موصوف کی قرضاوی پر تنقید کے لئے ملاحظہ ہو ماہنامہ الفرقان، دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۲۶

وہ قتالی ہو یا غیر قتالی) جب پوری طرح منسوخ ہو جائے گا تو پھر " فی سبیل اللہ " کے تحت زکاۃ کا کوئی بھی دعویدار میدان میں باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا ساری زکاۃ پر " مدرسوں " کا قبضہ برحق ہو جائے گا۔ یہ ہے ایک عالم نما مولوی کی عیارانہ ذہنیت۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

اُوپر کے مباحث سے جہاد کی حقیقت و اہمیت پوری طرح روشنی میں آگئی۔ اور یہ بھی اچھی طرح ظاہر ہو گیا کہ دین کی تبلیغ و اشاعت کی راہ میں علمی و قلمی جدوجہد بھی جہاد کے مفہوم و معنا اور اُس کے مزاج میں شرعی اعتبار سے پوری طرح شامل و داخل ہے۔ بلکہ موجودہ دور کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا جہاد ہے جس کا واحد مقصد اعلائے کلمۃ اللہ یعنی خدا کی بات کو اُونچا اور کفر کی بات کو نیچا کرنا ہے۔ اور جہاد چونکہ ہر دور میں مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے[۳۱] اس لئے ہر دور کے تقاضے کے مطابق اسے جاری رہنا چاہئے۔ بلکہ اس میں خوب مبالغہ بھی ہونا چاہیے (جیسا کہ جہاد کے لغوی مفہوم کا تقاضا ہے)۔ صاحب ہدایہ امام مرغینانیؒ تحریر کرتے ہیں:

ولا یجوز أن یقاتل من لم تبلغه الدعوة الی الاسلام الا أن یدعوه: اور کسی ایسی قوم کے ساتھ جنگ کرنا جسے اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو جائز نہیں ہے۔ جب تک کہ اُسے دعوت نہ دی جائے۔[۳۲]

اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے صراحت کی ہے کہ جس قوم کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو اُس کے ساتھ جنگ کرنا قرآن اور حدیث کی رُو سے جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں:

فان کانوا یقاتلون قوماً لم تبلغهم الدعوة فلا یحل قتالهم حتی یدعوا، لقوله تعالی: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ وقال ابن عباس رضی اللہ عنهما: ما قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قوماً حتی دعاهم الی الاسلام۔[۳۳]

---

۳۱ دیکھئے ہدایہ مع فتح القدیر ۵/۱۸۹، بدائع الصنائع ۷/۹۸، مطبوعہ کراچی

۳۲ ہدایہ مع فتح القدیر ۵/۱۹۷، مطبوعہ کوئٹہ

۳۳ المبسوط للسرخسی: ۱۰/۶، مطبوعہ کراچی، ۱۴۰۷ھ

اس لحاظ سے جہاد کی آخری شکل "قتال" اختیار کرنے سے پہلے جہاد کی اولین شکل "دعوت الی الاسلام" ضروری ہے۔ بغیر دعوت کے قتال جائز نہیں ہے۔ لہٰذا دعوت اصل ہوئی اور قتال [illegible]۔ پھر کسی بھی دور میں دعوت الی الاسلام کے لئے چونکہ عصری مزاج اور عصری علوم سے کما حقہٗ واقفیت اور ان میں بصیرت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ مؤثر نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ یہ حقیقت کلام الٰہی سے بخوبی ثابت ہوتی ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ : (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے بہترین طریقے سے مباحثہ کرو۔ (نحل: ۱۲۵)

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دین کو مؤثر طور پر پیش کرنے کے تین طریقے ہیں: (۱) حکیمانہ طریقہ (۲) اچھی نصیحت (۳) بہترین مباحثہ۔ یہ در اصل دعوتِ اسلامی کے تین مرحلے ہیں جو مخاطب کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ اور اس دعوتِ حق کے دو مقاصد ہیں:

۱۔ حق بات دلیل و استدلال کی روشنی میں پوری طرح کھل کر سامنے آجائے۔

۲۔ حق بات واضح ہوجانے کے بعد مخاطب پر اتمام حجت ہوجائے۔

اس لحاظ سے دعوتِ حق عصری مزاج کے مطابق ہونی چاہئے۔ ورنہ پھر وہی بات صادق آئے گی کہ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم"۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص تاریخ کا ماہر ہے تو اس کے لئے استدلال تاریخی موضوعات ہی کے ذریعہ مؤثر ہوسکے گا۔ کسی دوسرے علم و فن کے ذریعہ وہ متاثر نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس پر حجت قائم نہیں ہوسکے گی۔ اور یہ بات خود قرآنی نقطۂ نظر سے بھی "غیر حکیمانہ" ہوگی۔ اسی طرح کوئی سائنس کا ماہر ہے تو اس کے ساتھ صرف سائنسی علوم و مسائل ہی کے ذریعہ بحث و مباحثہ کیا جاسکتا ہے۔ معاشیات و سیاسیات وغیرہ کے ذریعہ اسے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ وقس علیٰ ذالک۔

غرض اس اعتبار سے اسلام کی صحیح دعوت پیش کرنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے موجودہ دور کے تمام علوم پر شعور اور ان میں مہارت ضروری ہے۔ ورنہ دعوتِ اسلامی

نہ مؤثر ہو سکتی ہے اور نہ وہ قابلِ حجت بن سکتی ہے۔ اور جب علمی میدان میں اسلام اور مسلمان فیل ہو جائیں تو پھر اُن کے لئے قتال کرنے یا "قتالی جہاد" کرنے کا بھی کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ بلکہ بغیر دلیل و حجت کے اس قسم کا قتال بجائے خود ایک فتنہ و فساد اور خونریزی کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ بلکہ وہ شرعی حیثیت سے قابلِ مذمت ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو دلیل و استدلال کے میدان میں شکست دئے بغیر میدانِ قتال برپا کر کے ناحق اُن کا خون بہایا جائے۔

جہاد چونکہ فرضِ کفایہ ہے اس لئے اگر جہاد کی یہ شکل یعنی علمی و قلمی جہاد موجودہ دور میں صحیح طور پر انجام نہ پائے تو پھر تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔ فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں پر فرض تو ہے مگر اس کو چند مسلمان بھی ادا کر دیں تو وہ سب کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔ لیکن اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو سب کے سب گنہگار ہو جائیں گے۔ اس لحاظ سے اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ فرض موجودہ دور میں صحیح طور پر انجام پا رہا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ علمی دنیا میں ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اور کیا مدرسے اور کیا ادارے سب کے سب اس راہ میں غافل اور پوری طرح بے پرواہ دکھائی دے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ عصری مزاج کے مطابق صحیح تحقیقی لٹریچر (جو پوری نوعِ انسانی کے ذہن و دماغ کو اپیل کر سکے) تیار نہ کر کے محض "وعظ و نصیحت" یا "فضائلِ اعمال" کی کتابیں شائع کرنا نہ تو صحیح معنی میں دعوتِ اسلامی ہے اور نہ اسے "جہاد" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ صحیح "دعوتی" یا "جہادی" نوعیت کا لٹریچر وہی ہو سکتا ہے جو عصری مزاج کے لحاظ سے مؤثر اور انقلابی ہو اور جو عصرِ جدید کے افکار و اذہان کو بدل کر رکھ دے۔ اور لوگ اس کے ملاحظہ سے دینِ حق کی صداقت و حقانیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور ایسا مؤثر و انقلابی لٹریچر تیار کرنا مسلمانوں کے ذمہ ایک فرضِ کفایہ ہے، ورنہ تمام مسلمان مجرم ہو سکتے ہیں۔

واضح رہے ہر قسم کی "علمی و دینی" خدمت کرنے والے اگرچہ عمومی اعتبار سے "فی سبیل اللہ" میں داخل ہو سکتے ہیں، مگر جہاد صحیح معنی میں وہی ہو سکتا ہے جو صحیح علمی اسپرٹ کے ساتھ ہو اور وہ اس میدان میں اختصاص کا درجہ حاصل کر لے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں صاف صاف فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ:
اسی نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے۔ (فتح: ۲۸)

اس آیتِ کریمہ میں دینِ حق کا غلبہ فکر و نظر کے میدان میں بھی مطلوب ہے اور مادی و سیاسی میدان میں بھی۔ مگر مادی و سیاسی میدان میں غلبہ حاصل کرنے کے لئے پہلے فکر و نظر یا دلیل و استدلال کے میدان میں اعلائے کلمۃ اللہ ضروری ہے۔ ورنہ لوگوں کو خواہ مخواہ اور زبردستی دین میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: دین میں زبردستی نہیں ہے۔ (بقرہ: ۲۵۶)

اس لحاظ سے اب لوگوں کو دین میں داخل کرنے کے لئے علمی و قلمی جہاد کے سوا اور کونسا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟ مگر موجودہ دور میں مسلمانوں اور اُن کے اداروں کا حال یہ ہے کہ وہ یا تو سطحی قسم کا لٹریچر تیار کرتے ہیں یا پھر وعظ و نصیحت اور قصے کہانیوں کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ تاریخ اور سیرت و سوانح کی کتابیں چھاپنا اُن کی معراج ہوتی ہے۔ کیونکہ تجارتی اعتبار سے وہ بہت سود مند ہوتی ہیں۔ دینی علوم اور عصری علوم کا موازنہ کرکے صحیح معنی میں تحقیقی کام کوئی نہیں کر رہا ہے جو موجودہ عقلیت پسندوں کو اپیل کرکے ان کے ذہن و دماغ کو بدل سکتا ہو۔ چونکہ یہ کام نہ صرف بہت زیادہ محنت طلب بلکہ پتہ ماری کا کام ہے جو تجارتی اعتبار سے مفید نہیں بلکہ گھاٹے کا سودا ہے اس لئے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ مگر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن و دماغ کو بدلنے اور فکری اعتبار سے ایک انقلاب لانے کے لئے اس قسم کے لٹریچر کی تیاری نہایت ضروری ہے۔ اور چونکہ یہ کام مسلمانوں کے ذمہ ایک فرضِ کفایہ ہے اس لئے جو لوگ یہ فرض ادا کرنا چاہتے ہیں یا کسی نہ کسی درجے میں کررہے ہیں اُن کی مدد زکاۃ کی رقم سے کرنا ضروری ہے۔ اور یہ موجودہ دور میں زکاۃ کا سب سے بہتر مصرف ہے جو "جہاد فی سبیل اللہ" کے ذیل میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کام تجارتی نوعیت کا ہے ہی نہیں (اگرچہ وہ ظاہری طور پر بعض لوگوں کو تجارت معلوم ہوتا ہو) بلکہ سخت محنت طلب کام ہے، جس پر ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ موقوف ہے، وہ ملّت کی فراخدلانہ امداد کے بغیر کس طرح انجام پاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا انقلابی عمل ملّت کی امداد و اعانت کے بغیر ہرگز انجام نہیں پاسکتا۔ لہٰذا اربابِ ملّت نے اگر اپنی

ذمہ داریوں کو محسوس کر کے صحیح قدم نہیں اُٹھایا تو پھر ہماری ملت کا خدا ہی حافظ ہے۔

علمی انحطاط اور احیائے علم

اس موقع پر چند ایسی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ علمی اعتبار سے زوال و انحطاط کے دور میں دین کی صحیح تعلیم و تدریس اور اُس کی صحیح نشر و اشاعت کی اسلام میں کتنی اہمیت ہے۔ ان احادیث سے علم کے صحیح مقاصد اور اُن کے مقام و مرتبہ کا بھی پتہ چلے گا۔

۱۔ دین کا قیام علم کی استواری پر موقوف ہے۔ اگر علم غلط ہو جائے تو پھر سارا دین غلط ہو جائے گا اور سارے اعمال بے کار ہو جائیں گے۔ بلکہ اُلٹے عذاب بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا علم کو ایک صاف و شفاف چشمہ کی طرح ہمیشہ رواں دواں رہنا چاہیے۔ چنانچہ امام زُہری سے مروی ہے:

"ہمارے سابق علماء کہا کرتے تھے کہ سنّت (رسول) کو مضبوطی سے تھامنے میں ہماری نجات ہے۔ کیونکہ علم (دین) تیزی کے ساتھ اٹھتا جا رہا ہے۔ جب کہ علم کے قیام ہی کے باعث دین و دُنیا کا ثبات ہے۔ اور علم کا ضائع ہو جانا دین و دُنیا دونوں کا ضیاع ہے"[۳۴]

۲۔ بعض حدیثوں کے مطابق ایک ایسا دور آئے گا کہ علم کو فریب کے ساتھ جھپٹ کر چھین لیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت ابو درداءؓ سے مروی ہے:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ نے (اچانک) آسمان کی طرف نظر ڈالی۔ پھر فرمایا کہ اب وقت (آگیا ہے) کہ لوگوں سے ان کا علم جھپٹ کر چھین لیا جائے، یہاں تک کہ وہ اس علم میں سے کسی بھی چیز پر قابو نہ رکھ سکیں۔ (یعنی لوگوں کو اس بات کا پتہ ہی نہیں چل سکے گا کہ اُن کی کونسی چیز چھین لی گئی ہے اور کیا چیز اُن کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے)۔ اس پر زیاد بن لبید انصاریؓ نے پوچھا (کہ یا رسول اللہ) ہم سے علم کس طرح چھین لیا جائے گا جب کہ ہم قرآن پڑھ چکے ہیں (اور اس کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں) اور پھر واللہ ہم اس کو برابر پڑھتے رہیں گے اور اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی پڑھاتے رہیں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تیرا بُرا ہو اے زیاد! میں تو تجھے مدینہ کے سمجھدار لوگوں میں شمار کرتا تھا۔ یہ جو تورات و

---

[۳۴] سُنن دارمی، مقدمہ ۱/۴۵، مطبوعہ بیروت۔

انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود ہیں، تو یہ کتابیں اُن کو کیا نفع دے رہی ہیں؟ (یہی حال میری اُمت کا بھی ہوگا۔ اور وہ بھی قرآن کو پسِ پشت ڈال دیں گے۔)[۳۵]

چنانچہ آج جس علم و فن میں بھی دیکھئے جھوٹ اور کھوٹ کی آمیزش نظر آتی ہے۔ اور پروپگنڈہ کے زور پر صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح قرار دینے کا فن کافی ترقی کر گیا ہے۔ خصوصاً الحاد و دہریت کا غلبہ محض پروپگنڈے کے زور پر جاری ہے۔ جو ایک اچھے خاصے کاروبار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ علوم و فنون میں سرایت شدہ اس کھوٹ اور ملاوٹ کو دُور کرنے اور کھوٹے کو کھرے سے الگ کرنے کے لئے خداداد بصیرت کی ضرورت ہے، جو ایک پیمبرانہ اور تجدیدی عمل ہے۔ لہٰذا علمِ دین کے حامل علماء کو جو انبیائے کرام کے جانشین ہیں اس فریب کاری کا مقابلہ پوری قوت سے کر کے نوعِ انسانی کو جدید علوم کے شر و فتنہ سے بچانے کے لئے پوری طرح کمربستہ ہو جانا چاہیے۔

واضح رہے اس موقع پر حدیث میں "اختلاس" کا لفظ بولا گیا ہے، جس کے معنی فریب کے ساتھ کسی چیز کو جھپٹ کر چھین لینے کے ہیں۔ اور اس اعتبار سے یہ پیمبرانہ پیش گوئی موجودہ دور پر پوری طرح صادق نظر آرہی ہے۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی علامتوں میں سے ہے یہ بات کہ علم اُٹھا لیا جائے گا اور جہل (لاعلمی) کا دور دورہ ہو جائے گا۔[۳۶]

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں (دینی و اخلاقی) علم انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے رخصت ہو رہا ہے اور اس کی جگہ مادّی و الحادی علوم نے لے لی ہے، جن کا بنیادی خاصّہ اور خمیر بے خدائیت اور خدا فراموشی ہے۔ موجودہ انسان اگرچہ بظاہر بڑا ہی "عالم و فاضل" نظر آتا ہے، لیکن وہ فانی چیزوں میں منہمک ہو کر اپنے مقصدِ حیات کو پوری طرح فراموش کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے آج علم اُٹھ رہا ہے اور جہل و لاعلمی کا دور دورہ ہو گیا ہے۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ علم اپنے بندوں سے چھین کر نہیں

---

[۳۵] جامع ترمذی کتاب العلم ۵/۳۱-۳۲، بیروت، سنن دارمی ۱/۸۷
[۳۶] صحیح بخاری کتاب العلم ۱/۲۸، مطبوعہ استانبول

اٹھائے گا۔ بلکہ اُسے علماء کی موت کے ذریعہ اُٹھالے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہے تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے اور ان سے مسائل دریافت کئے جائیں گے۔ تو وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔[۳۷]

علم دین کی سب سے بڑی آفت یہی ہے کہ جب لوگ اس کی تحصیل سے غافل ہوجائیں تو یہ علم بتدریج کم ہوکر ختم ہوجائے گا۔ پھر جاہلوں کی سرداری کے باعث لوگ گمراہ ہوں گے۔ لہٰذا گمراہی اور تباہی سے بچنے کے لئے علم دین کی ترویج و اشاعت ضروری ہے۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی کے مطابق ایک ایسا دور بھی آنے والا ہے جس میں عالموں کی قلت اور واعظوں کی کثرت ہوجائے گی۔

" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ایک ایسے دور میں ہو کہ اس میں علماء (صحیح علم رکھنے والوں) کی تعداد زیادہ ہے اور خطیبوں (سطحی علم رکھنے والوں) کی تعداد کم ہے۔ تو ایسے (مبارک) دور میں جس نے اپنے علم کے دسویں حصے کو اگر چھوڑ دیا تو وہ ہلاک ہوگیا۔ مگر ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے کہ اس میں علماء کم ہوں گے اور خطیبوں (یا وعظ گو لوگوں) کی کثرت ہوجائے گی۔ تو ایسے (نامبارک) دور میں جس نے اپنے علم کے دسویں حصے کو بھی تھام لیا وہ نجات پاگیا۔[۳۸]

۶۔ حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ میراث کا علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ میں تو رخصت ہونے والا ہوں۔ علم اُٹھالیا جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے۔ پھر حالت یہ ہو جائے گی کہ دو افراد کسی فریضے کے بارے میں اختلاف کر بیٹھیں گے اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔[۳۹]

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ علم کسی دور میں اس قدر اجنبی بن جائے گا کہ لوگوں میں

۳۷؎ بخاری ۱/۳۴، مسلم ۴/۲۰۵۸، ترمذی ۵/۳۱، ابن ماجہ ۱/۲۰، دارمی ۱/۷۷

۳۸؎ مسند احمد ۵/۱۵۵ مطبوعہ بیروت

۳۹؎ سنن دارمی ۱/۷۳

قوت فیصلہ کی صلاحیت ہی نہیں رہے گی۔ اور باہمی نزاع اور علمی و اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے والوں کا قحط ہو جائے گا۔ یہ ساری علامتیں موجودہ دور میں پوری طرح رونما ہو چکی ہیں۔ علم دین ختم ہو رہا ہے اور لوگ صحیح مسائل کی تحقیق کے لئے علماء کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ مگر ہر طرف ایک حیرانی و پریشانی کا سا عالم ہے۔ لوگوں کو اُن کے مسائل کے جواب نہیں مل رہے ہیں۔

۷ - ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ جس میں حق اور باطل کے درمیان التباس پیدا ہو جائے گا۔ اور اُس دور میں معروف منکر بن جائے گا اور منکر معروف بنے[۴۰]

یعنی خیر شر کا درجہ حاصل کرے گا اور شر خیر سمجھ کر کیا جائے گا۔ گویا کہ حق و باطل، نیکی و بدی اور اچھائی و بُرائی کے پیمانے بالکل بدل کر رہ جائیں گے۔ جیساکہ یہ حالت آج ہمارے معاشرے میں معاشرتی، تمدنی اور سیاسی نقطۂ نظر سے پورے عُروج پر نظر آرہی ہے۔ اس دور میں ساری اخلاقی بُرائیاں خُوبیاں بن کر رہ گئی ہیں اور اخلاقی خوبیوں نے بُرائیوں کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج ہر قسم کی اخلاقی بُرائی ایک آرٹ اور فیشن کا رُوپ دھار چکی ہے۔

۸ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اپنی اُمت سے تین باتوں کا خدشہ ہے (۱) اُن کے لئے مال کی زیادتی ہو جائے گی تو وہ ایک دوسرے سے حسد کرنے اور باہم ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں گے۔ (۲) اللہ کی کتاب کھولی جائے گی اور مسلمان اُس کی (متشابہات) کی تاویل میں لگ جائے گا، حالانکہ اس کی صحیح تاویل سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ (۳) اور وہ اپنے درمیان کسی (صحیح) عالم کو دیکھیں گے تو اُسے ضائع کر دیں گے اور اُس کے (ضائع ہونے کی) کوئی پرواہ نہیں کریں گے۔[۴۱]

یہ تینوں باتیں موجودہ دور میں ظاہر ہو چکی ہیں۔ آخری حقیقت کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علمِ صحیح کی ناقدری کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ آج ہماری ملت سے علم کے بارے میں احساسِ زیاں تک رخصت ہو چکا ہے اور بے حسی عام ہو گئی ہے۔ صحیح عالم کی کوئی بھی قدر نہیں کرتا۔ مگر وعظ گو اور باتونی لوگوں کی خوب بن آتی ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ

---

[۴۰] دارمی ۱/۱۶۳

[۴۱] ابن جریر و طبرانی، منقول از کنز العمال ۱۰/۱۱۴

چرب زبان ہوتا ہے اُسے اتنا ہی بڑا عالم تصور کر لیا جاتا ہے ۔

۹ ۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب فتنے ظاہر ہو جائیں اور اس اُمت کے اگلے لوگ پچھلے لوگوں پر لعنت کرنے لگ جائیں تو اُس وقت جس کے پاس جو بھی علم ہو وہ اُسے ظاہر کرے ۔ اُس وقت علم کو چھپانے والا محمد (صلعم) پر نازل شدہ اللہ کے پیغام کو چھپانے والے کی طرح ہوگا [۴۲]

۱۰ ۔ جس نے احیائے اسلام کے لئے کوئی (خصوصی) علم حاصل کیا تو جنت میں اُس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجے کا فرق ہوگا [۴۳]

ان دو حدیثوں سے علم کے مقام و مرتبہ پر روشنی پڑتی ہے اور خاص کر باطل علوم اور باطل فلسفوں کے مقابلے کے لئے علم صحیح کی تحصیل اور اُس کی نشر و اشاعت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ۔ اس موقع پر فتنوں سے غلط افکار و نظریات، مادی فلسفے اور اُن کی فتنہ انگیزیاں وغیرہ سب کچھ مراد ہو سکتے ہیں، جن کے خلاف سینہ سپر ہو کر علمی و استدلالی میدان میں ان کا مقابلہ کر کے ان فتنوں کا استیصال کرنا ایک " انبیائی عمل " ہونے کے ناطے ایک عظیم ترین جہاد ہے ۔ اور یہ جہاد انبیائے کرام کے صحیح اور سچے جانشین ہی انجام دے سکتے ہیں ۔ علم کا احیاء اصل میں دین کا احیاء ہے ۔ اور دین کا احیاء ظاہر ہے انبیائے کرام کے مشن کی تکمیل ہے ۔ اس اعتبار سے وہ تمام اہل علم جہاد میں مشغول ہیں جو احیائے علم اور احیائے دین کی جد و جہد میں مصروف ہیں ۔

الغرض ان تمام احادیث و آثار سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ موجودہ دور علمی انحطاط اور فتنوں کے ظہور کا دور ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ آج علمی زوال و انحطاط کی وجہ سے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنا ہی مشکل ہو گیا ہے ۔ اور عوام الناس اپنی روزمرہ کی زندگی میں خیر و شر کے درمیان فرق و امتیاز کرنے سے عاجز نظر آ رہے ہیں ۔ اور بہت سے ایسے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا تسلی بخش شرعی جواب نہیں مل پا رہا ہے ۔ ہر طرف طرح طرح کے تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی فتنے سر گرم ہو کر اہل ایمان پر حملہ آور ہو چکے ہیں اور اُن سے اُن کا ایمان جیسی قیمتی شے چھینتے جا رہے ہیں [illegible] لہٰذا

---

۴۲ کنز العمال ۱۰/۱۲۵

۴۳ ایضاً ۱۰/۹۱

ایسے ناگفتہ بہ حالات میں جو لوگ بھی احیائے دین اور علم صحیح کی نشر و اشاعت پر کمربستہ ہو جائیں وہ شرعی اعتبار سے مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں۔ اور ایسے مجاہدین کی بھرپور مدد کرنا ملّتِ اسلامیہ کا شرعی و اخلاقی فریضہ ہے۔

واضح رہے دورِ جدید کے مزاج کے مطابق علمی و تحقیقی کام کرنے کے لئے باصلاحیت علماء اور فارغین کی ضرورت ہے۔ جن کو معقول وظائف دے کر تحقیقی کاموں میں لگانا چاہئے، تاکہ وہ صحیح خطوط پر کام کر سکیں۔ اور اس کے نتیجے میں نئے قسم کے محققین و مصنفین کی ایک جماعت تیار ہو۔ اور ایسے لوگوں کو ملّت کے لئے وقف ہو کر کام کرنا چاہئے۔ تب جا کر صحیح نتائج نکل سکتے ہیں۔ مگر اس کارِ عظیم کے لئے ملّت کو بھی قربانیاں دینا چاہئے اور ایسی خصوصی جماعت کا خاص خیال رکھتے ہوئے انہیں فکرِ معاش سے پوری طرح مستغنی کر دینا چاہئے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ فکرِ معاش سے بے نیاز ہوئے بغیر کوئی شخص پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف نہیں کر سکتا اور پورے انہماک کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ بغیر یکسوئی اور انہماک کے کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس طرح یہ عظیم کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں نتائج جو صفر درجہ پر نظر آرہے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ علم کی ناقدری اور کس مپرسی ہے۔ ہماری ملت نام و نمود اور کسی وقتی و ہنگامی ضرورتوں پر خوب داد و دہش کا مظاہرہ کرتی ہے اور فسادات کے موقع پر کچھ سخاوت بھی دکھاتی ہے، مگر ٹھوس علمی کام کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں کرتا، جو دین و ملّت کی مضبوطی اور اس کے استحکام کا باعث ہے۔

غرض اس مشکل مسئلہ کا واحد شرعی حل یہی ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی زکاۃ کی رقم سے بھرپور مدد کی جائے، جو دین و ملّت کے لئے وقف ہو کر کام کر رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس اقدام کے بغیر یہ عظیم کام انجام نہیں پا سکتا۔ اور جیسا کہ پچھلے مباحث میں (خاص کر کتاب کے حصہ اول میں) گزر چکا "دینی خدمت گاروں" کو زکاۃ دینا نہ صرف قرآن اور حدیث سے بلکہ خود فقہ اسلامی سے بھی ثابت ہے۔ خاص کر علامہ علاء الدین حصکفیؒ (صاحب درمختار) اور علامہ ابن عابدین شامیؒ (صاحب ردّ المحتار) کی تصریحات سے۔ لہٰذا اہلِ علم کو زکاۃ کی رقم دینا فقہی و شرعی اعتبار سے کوئی نیا مسئلہ یا "بدعت" نہیں ہے، جیسا کہ مدعیٔ تحقیق کا دعویٰ ہے۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

جہاد کی ایک قسم مالی جہاد بھی ہے

پچھلے صفحات میں علامہ ابنِ قیمؒ (م ۷۵۱ھ) اور حافظ ابنِ حجرؒ (م ۸۵۲ھ) کے حوالے سے تفصیل گزر چکی ہے کہ کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کے چار مراتب ہیں جو یہ ہیں:
(۱) ہاتھ کے ذریعہ۔ یعنی ہتھیاروں کے ساتھ عسکری طور پر۔ (۲) زبان کے ذریعہ، یعنی علمی و استدلالی طور پر۔ (۳) مال کے ذریعہ۔ یعنی جہاد کے لئے مالی امداد فراہم کر کے۔ (۴) اور قلب کے ذریعہ[۴۴] یعنی مذکورۂ بالا تینوں میں سے کسی ایک کی بھی استطاعت موجود نہ ہو تو پھر مشرکانہ و ملحدانہ افکار و اعمال کو دل میں بُرا تصوّر کرنا۔ اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔

اس لحاظ سے جہاد کی چوتھی قسم (جہاد بالقلب) ایک شخصی اور داخلی معاملہ ہے۔ جب کہ پہلی تین قسمیں ملّی و اجتماعی نوعیت کی حامل ہیں۔ مالی جہاد کا ثبوت قرآن اور حدیث کے حسبِ ذیل نصوص سے ملتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: جو لوگ ایمان لائے اور اپنا گھر بار چھوڑا، پھر اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ذریعہ جہاد کیا، اور جن لوگوں نے اُن کو (رہنے کی) جگہ دی اور ان کی امداد کی، وہ (سب) آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ (انفال: ۷۲)

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: تم ہلکے ہو یا بوجھل (جس حال میں بھی ہو) نکل پڑو اور اپنے مالوں اور جانوں کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ بات تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو۔ (توبہ: ۴۱)

اور بعض حدیثوں میں مذکور ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:
اَيُّ النَّاسِ اَفْضَلُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مُؤْمِنٌ يُّجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ: کونسا شخص افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مومن جو اللہ

---

[۴۴] دیکھئے زاد المعاد از ابنِ قیم ۱۱/۳، مؤسسۃ الرسالۃ، فتح الباری از ابنِ حجر ۳/۶

کے راستے میں اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرتا ہے۔[۴۵]

اور دوسری حدیث میں ہے: قَالَ مَنْ جَاهَدَ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص جس نے اپنے نفس اور مال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔[۴۶]

اس قسم کی آیات و احادیث اور بھی ہیں۔ اور ان سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں: (۱) جہاد صرف جسمانی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ وہ مالی اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے۔ (۲) جو لوگ مالی اعتبار سے جہاد کرنے والوں کا ساتھ دیں وہ بھی گویا کہ "مجاہدین" میں شامل ہیں۔ اس طرح ملّی و اجتماعی حیثیت سے جہاد کرنے والوں کی تین قسمیں ہوئیں۔ مگر اصل مجاہد صرف دو ہی ہیں:

۱۔ دین کی سربلندی کے لئے اللہ کی راہ میں لڑنے والا؛
۲۔ دین کی سربلندی کے لئے اللہ کی راہ میں علمی جدوجہد کرنے والا۔

اب رہے مالی امداد کرنے والے تو وہ بھی اگرچہ دین کی سربلندی میں معاونت کرنے کے اعتبار سے مجاہد ضرور ہیں مگر اصطلاحی طور پر اُن کا اطلاق مجاہدین پر نہیں ہوتا۔

امام جصّاص رازیؒ (م ۳۷۰ھ) اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ جہاد بالمال کی دو شکلیں ہیں: ایک شکل یہ ہے کہ جنگ کے لئے ہتھیار و آلات وغیرہ کی تیاری کی خاطر کوئی شخص خود اپنے آپ پر مال صرف کرے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ کسی دوسرے مجاہد کے لئے بطور امداد مال فراہم کرے۔[۴۷]

علمی جہاد اصل و افضل: علامہ جصّاص کی تحقیق

اب سوال یہ ہے کہ ان تینوں قسم کے جہاد میں کونسا جہاد افضل اور دین و ملّت کے لئے زیادہ نفع بخش ہے؟ تو اس سلسلے میں محقّقین کی رائے یہ ہے کہ علمی جہاد اصل ہونے کی بنا پر جسمانی و مالی جہاد سے افضل ہے۔ (جاری ہے)

---

۴۵ صحیح بخاری کتاب الجهاد ۲۰۱/۳
۴۶ سُنن نسائی ۱۱/۶
۴۷ احکام القرآن، جصاص رازی ۱۱۸/۳، دار الکتاب العربی بیروت

گلریز کا اخلاقی و عرفانی پہلو

ڈاکٹر صفیہ جاریہ انیس، ریسرچ انسٹیٹیوٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

چنانچہ روز مقررہ نوشلب اپنی ماں کے ساتھ ملک بحرین آئی اور نازمست کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئی اور عفریت سے آزاد ہو جانے کی باتیں سنیں تو پوچھا کہ وہ شخص جس نے عفریت کو مارا وہ وہاں کیوں اور کیسے پہنچا۔ تب نازمست نے عجب ملک کی تمام داستان سنا دی جسے سنکر وہ حیرت زدہ ہوئی اور بولی "شرائط محبت و مراسم مودت آنست کہ تشنگان بادیہ محبت را از شربت مشرب وفا ممتلی باید داشت و متعطشان کلبۂ مودت را از زلال منہل رضا سیراب باید گردانید"[۱]
عجب ملک کو دور سے دیکھ کر نوشلب اس کے حسن پر فریفتہ ہو گئی۔ ؎

چوں عشق درآید ز رہ دیدہ درون
از روزن دل برون رود صبر و سکون

اُدھر جب عجب ملک نے نوشلب کے آنے کی خبر سنی تو ایک خوشی کا نعرہ لگایا اور بے ہوش ہو گیا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو سامنے جلوۂ محبوب دیکھ کر دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ درحقیقت عجب ملک وادی توحید سے گزر کر اب وادی حیرت میں تھا۔ ؎

در عالم قرب حیرت از بعد گذشت
نزدیکاں را بیش بود حیرانی

عجب ملک پر عالم حیرت طاری ہے۔ جلوۂ دوست سے نگاہیں خیرہ ہوگئی ہیں اور اس کے ہوش و حواس جواب دے چکے ہیں اور وہ ارد گرد کے حالات سے بے خبر بے ہوش ہے۔

"آری اگر چہ دل عشاق صادق و دیدۂ طلاب مطابق را با آتش شدائد بسوزند و بناوک محاذت بدوزند نہ زلف مصافات از دست دل بگذارند و نہ دیدہ از مشاہدۂ دوست بردارند"

اس وادی سے نکل کر سالک آخری منزل تک جا پہنچتا ہے جو وادی فنا کے نام سے صوفیہ کے نزدیک جانی جاتی ہے اور جسے ضیاء الدین نخشبی نے وصال سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ جب عجب ملک ہوش میں آیا تو اپنی تمام سرگزشت نوشلب کو سنائی اور نوشلب نے بھی اپنی بے قراری کا اظہار کیا اور آخر کار "دو عاشق سرمست بعد تحمل شدائد فراق و تجرع اقداح اشتیاق چوں بہ مواصلت یک دیگر قادر شوند دیر مرافقت یکدیگر قاہر گردند اشہب خوشی چہ شکل تازند و نرد خرمی چگونہ بازند" اس وادی میں پہنچ کر سالک اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور ذات حق میں خود کو گم کر دیتا ہے۔

داستان کا آغاز معصوم شاہ کی ولادت سے کیا گیا تھا اور نوشلب کی زبانی داستان میں عجب ملک کو سلوک کی ساتوں مراحل سے گزارا گیا جن کے نام بالترتیب اس طرح ہیں۔ اوّل وادی طلب، دوم وادی عشق، سوم وادی معرفت، چہارم وادی استغنا، پنجم وادی توحید ششم وادی حیرت، ہفتم وادی فنا۔ ان وادیوں کے تمام احوال اور صوفیانہ نکات کو نہایت دلآویز طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ مقام فنا کے بعد ایک اور مقام آتا ہے جو مقام بقا کہلاتا ہے یعنی فنا کے بعد روح باقی رہتی ہے اور ذات حق سے مل کر اسے حیات باقی مل جاتی ہے اور اسے مقام بقا حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ضیاء الدین نخشبی نے داستان یہیں پر ختم نہیں کی بلکہ اسے جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب دیر ہو گئی تو نوشلب کی ماں کو نوشلب کی فکر لاحق ہوئی اور اسے تلاش کرتی ہوئی باغ میں اس مقام پر پہنچ گئی جہاں نوشلب اور عجب ملک ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے سو رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ نہایت چراغ پا ہوئی۔ اور دونوں کو سوتی ہوئی حالت میں الگ کر کے اپنے اپنے وطن پہنچا دیا۔ گھر آکر ملکہ جن نے جب بیٹی کو عجب ملک کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھا تو غصے کی حالت میں اسے مرغ بنا دیا ... سر لکہ دست

سال کا زمانہ گزر گیا عجب ملک نو بہت تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ معصوم شاہ کو دیکھ کر عجب ملک کی مشابہت پائی تو نیچے اتر آئی اور خود کو محبوس کروالیا۔ مرغ سے یہ غمزدہ داستان سن کر معصوم شاہ نہایت متاثر ہوا اور نوشلب سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی ماں کے پاس لے لیجائے گا اور جب تک وہ اسے اصلی حالت میں نہیں لے آتی وہ اصرار کرتا رہے گا۔ چنانچہ بیابانوں اور صحراؤں کو طے کرتے ہوئے اور پریشانیوں کو برداشت کرتے ہوئے معصوم شاہ قفس میں نوشلب کو لیے ہوئے بیت الامان پہنچا۔ ملکہ جن نے جب قفس میں اپنی نحیف و نزار بیٹی کو دیکھا تو مادرانہ شفقت عود کر آئی اور بے قراری کے ساتھ اسے باہر نکال کر اصلی صورت میں کر دیا اور گلے لگا کر بہت روئی پھر معصوم شاہ سے اس کا عقد کرنا چاہا تو معصوم شاہ نے کہا کہ وہ میری بہن جیسی ہے اس کا نکاح تو عجب ملک سے ہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ملک بحرین ایک خط عجب ملک کے سلسلے میں بھیجا گیا۔ اتفاق سے عجب ملک بھی نوشلب کی تلاش میں سرگرداں ملک بحرین پہنچ گیا اور نوشلب کی ماں عجب ملک اور نوشلب کی شادی شاہانہ طور پر کر دا دیتی ہے اس طرح دونوں کو منزل مقصود مل جاتی ہے۔ دریں اثنا معصوم شاہ کی نظر نازمست پر پڑی تو وہ اس کا شیفتہ ہوگیا عجب ملک بحرین کے بادشاہ کو معصوم شاہ اور نازمست کی شادی کے لئے راضی کر لیتا ہے، اور راسخ کی شادی نازمست سے ہو جاتی ہے اور ہر ایک گوہر مقصود حاصل کر کے اپنے وطن واپس ہو جاتے ہیں۔ داستان کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔ "عاقبت بکرم حضرت آفریدگار خالق لیل و نہار ہم آن مجلس بشادی تمام بدل شد و ہم آں جمع بسوز تمام عوض گشت خود ہیچ فتور نیست کہ در پی آں سوزی نی و ہیچ غمی نیست کہ در عقب آں سروری نہ، و باقی عمر در رفاہ و فرصت بہجت و استراحت آخر رسانیدند۔ کریم متعال و قادر بے کمال جملہ را دلی بی غم و دلی بے غم کرامت کند آمین یا رب العالمین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔"[1]

(ختم شد)

محمد افضل لذتی کے کمیاب اشعار

ڈاکٹر نور السعید اختر، ایم اے، پی ایچ ڈی لٹ (اردو) ڈی لٹ (فارسی)
شعبۂ فارسی، مہاراشٹر کالج، بمبئی۔

(الف)

عہد:۔ کرناٹک (جنوبی ہندوستان) میں نوائط خاندان کے اقتدار کے بعد بیجاپور اور حیدرآباد کے شعراء و فضلاء وہاں کشاں کشاں پہنچے۔ نواب سعادت اللہ خاں بن محمد علی ۲۸ اپریل ۱۶۵۱ء میں بیجاپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے آباء و اجداد چودھویں صدی عیسوی میں بصرہ سے ہندوستان کے جنوبی ساحل کونکن میں آکر بس گئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی نے بیجاپور کے عادل شاہوں کے یہاں ملازمت اختیار کرلی تھی ۱۶۶۸ء میں بیجاپور کے سقوط کے بعد ان کے بڑے بھائی نواب غلام علی خان کوٹلہ کے قلعدار مقرر کیے گئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد سعید کو اورنگ زیب نے داؤد خان پنّی کا دیوان مقرر کیا تھا۔ داؤد خان پنّی کو اورنگ زیب نے واپس بلالیا اور ان کی جگہ نواب سعادت اللہ خاں کو کرناٹک کا صوبیدار بنادیا۔ ان کے فرزند نواب باقر علی خان نے ۱۱۵۲ھ میں انتقال کیا اور ویلور میں دفن ہوئے اس واقعہ کے بعد نواب سعادت اللہ خاں نے جنجی کے قلعہ

کو دوبارہ فتح کیا اور اپنی سیاسی ساکھ قائم کی۔ اس سے قبل وہ حیدرآباد کے ناظم نواب مبارز خاں کے ماتحت تھے ۱۷۲۴ء میں ان کے انتقال کے بعد نواب سعادت اللہ خاں نے نظام الملک کو اپنا مربی بنالیا ۱۷۳۲ء مطابق ۱۱۴۵ھ میں نواب سعادت اللہ خاں کا انتقال ہوا۔ اور ارکاٹ میں مدفون ہوئے۔ ان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ لہٰذا ان کے بھتیجے دوست علی خاں جانشین بنے۔ اس جانشینی کی تصدیق نظام الملک اور مغل شہنشاہ محمد شاہ نے بھی کی ۱۷۴۰ء مطابق ۱۱۵۳ھ میں دوست علی خاں مارے گئے۔ ان کے فرزند نواب صفدر علی خان بھی دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ نواب صفدر علی خاں کے فرزند محمد سعید کو نظام الملک نے جانشین مقرر کیا لیکن بدقسمتی سے ۱۷۴۴ء مطابق ۱۱۵۷ھ میں وہ بھی قتل ہوئے۔

نواب سعادت اللہ خان کا دورِ حکومت گوکہ طویل نہیں تھا تاہم ان کی ادبی و علمی کارگذاریوں نے ارکاٹ کو ایک ادبی مرکز کی حیثیت بخش دی تھی۔ اس مختصر دور میں عربی و فارسی زبان کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا۔ کرناٹک کے اکثر نواب علم و ادب کے شیدا تھے۔ خصوصاً نواب غلام علی خان اور نواب باقر علی خان نے فارسی شعر و ادب کی اپنے ہاتھوں سے آبیاری کی شعراء کی سرپرستی اور قدر دانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پروفیسر محمد یوسف کوکن ان نوابین کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

"They (Nawabs of Carnatic) themselves were great scholars and were surrounded by the [illegible] band of scholars and Poets. who were engaged in exhibiting the literary and intellectual ... genius and merits."(1)

---

(1) Arabic & Persian in Carnatic Prof Yusuf Kokan Page. 13.

(ب)
محمد افضل لذّتی کا تعارف :-

محمد افضل لذّتی سے متعلق ہماری معلومات نہایت محدود ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ دہلی کے امراء میں سے تھے۔ نواب سعادت اللہ خان کے عہد میں کرناٹک پہنچے اور پھر ارکاٹ میں تاحیات رہے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے "چندر بدن اور مہیار" کے مشہور عشقیہ قصّہ کو نظم کیا تھا۔ پروفیسر محمد یوسف کوکن نے رائق کے تذکرے "گلدستہ" کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ رائق نے لذّتی کی مثنوی "چندر بدن اور مہیار" دیکھی تھی لیکن وہ اس کے اقتباسات نقل کرنے سے قاصر رہے۔ بقول رائق "یہ مثنوی نہایت شاندار اور بیشتر ادبی خصوصیات کی حامل تھی"۔

نواب سعادت اللہ خان، لذّتی کے مداح اور قدر دان تھے۔ ان کی کوششوں سے علی دوست محمد کی لڑکی لذّتی کے فرزند سے بیاہی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ جنوبی ہند کے سارے تذکرے لذّتی کے سن پیدائش اور انتقال کی بابت خاموش ہیں۔

تذکرۂ گلزار اعظم میں لذّتی کے تین شعر بطور نمونہ درج ہیں ؎

(۱) صبح و بہار و الف (غنچہ) و گل فرش راہ اوست
نسرین و لالہ خار و خس جلوہ گاہ اوست

(۲) شب کہ آہم علم شعلہ چو برپا می کرد
برق پیری (؟) زود از دور تماشا می کرد

(۳) سینہ چشمی کہ بسمل داری زقصم زشمشیرش
ہوا را سرمہ دان سازد معلقہائے نخچیرش

(اربیک اینڈ پرشین ان کرناٹک از کوکن صفحہ نمبر ۱۵۱ الف جلوہ گل (انتخاب) بمبئی یونیورسٹی)

انتخاب اشعار لذّتی :-

بمبئی یونیورسٹی کے مخطوطات میں لذّتی کے نایاب و نادر اشعار کا انتخاب موجود ہے۔

پروفیسر سرفراز[1] کے مرتب کردہ کیٹلاگ میں اس سے متعلق مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ لذتی کے اشعار انتخاب ایک مجموعہ میں درج ہے جس کا کیٹلاگ نمبر Vol No. 92 ہے اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل شعراء کا انتخاب بھی موجود ہے۔

(۱) انتخاب دیوان سالک یزدی۔ صفحہ نمبر ۱۵۲
(۲) " " محمد افضل لذتی " " ۱۵۳
(۳) " " ہندو " " ۱۵۴
(۴) " " جلال اسیر " " ۱۵۵

سرفراز صاحب نے لذتی کے انتخاب دیوان کے ایک اور مخطوطے کی نشاندہی کی ہے۔ یہ انتخاب رائل ایشیاٹک[2] سوسائٹی کلکتہ میں موجود ہے۔ ایوانوف کے مطابق اس کا کیٹلاگ نمبر 766 ہے۔ راقم اس مخطوطے کی نقل حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔

(د)

لذتی کے معاصرین :-

(۱) لذتی کے معاصرین میں شیخ محمد امین اسرائیلی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ امین نے نواب سعادت اللہ خان کی مدح میں قصیدے کہے ہیں۔ دیوان نادر الوجود ہے۔ جسونت رائے منشی کے سعید نامہ میں چند اشعار ملتے ہیں اور جنوبی ہند کے تذکروں میں حوالے بھی پائے جاتے ہیں۔

(۲) جسونت رائے منشی : عالمگیر نامہ میں آپ کے آباء واجداد کے کارناموں کا ذکر ملتا ہے۔ جالیت پنجاب کے رہنے والے تھے۔ نواب سعادت اللہ خاں کے پیشکار اور سوانح نگار

---

1. Descriptive catalogue of the Arabic, Persian and Urdu Manuscripts by S. A. K. Sarfaraz Page No 232 (Siz 27.9x3.?) LL.23-26 Nastaliq diagonal & vertical lines))

2. Ivanov Vol 1, Asiatic Society ... I No 766. Ivanovs Vol 1, Asiatic Societ...

تھے۔ عربی و فارسی پر کامل دستگاہ تھی۔ چنانچہ پروفیسر کوکن ان کی تعریف میں کہتے ہیں: " His Poety is full of lofty thoughts and ideals and contain freshness in the lengvage. (۱)

منشی نے ملک الشعراء غواصی کی مثنوی "سیف الملوک بدیع الجمال" کا فارسی میں "گل کدۂ عشق" کے نام سے ترجمہ کیا اور "لعل و ہیرا" کے نام سے ایک اور مثنوی لکھی۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

(۳) قزلباش خان امید:۔ مرزا محمد رضا اصلی نام تھا۔ ہمدان کے رہنے والے تھے۔ مرزا طاہر وحید کے شاگرد تھے۔ عہد اورنگزیب میں ملازمت اختیار کی۔ بہادر شاہ نے انھیں قزلباش کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ نواب سعادت اللہ خاں نے بڑی پذیرائی کی۔ نظام الملک کی مدح میں قصیدے کہے اور اس کے عوض قید سے رہائی اور قلعۂ نی مارک کے قلعدار مقرر ہوئے۔ حج بیت اللہ کے بعد حیدرآباد لوٹ آئے۔ نظام الملک کے ہمراہ دہلی گئے۔ جہاں [illegible] مطابق [illegible] میں انتقال کیا۔ دیوان شائع نہیں ہوا۔

نمونۂ کلام: از سینہ سختی بہار دستاں ندارم عزتی   نیست ہرگز سرمہ را در شہر لوران قیمتی

(۴) نواب غلام علی خان:۔ نواب سعادت اللہ خان کے بڑے بھائی تھے۔ ایک طویل مثنوی بنام "لمعات الطاہرین" قلمبند کی اس میں اہل نوائط کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی۔ ملاحظہ کیجئے:

بکلیان و بھونڈی ایران شمار   در آنجا از اسلام سکہ زدند
بہ بمشہور کلیان و تھانہ جزیرہ   بارکسن لونده ہر دو بندر منیر
نراہیم جیپول الاچی نام   سیوائے ملبوار کردہ مقام

یہ مثنوی ۱۶۹۶ء مطابق ۱۱۰۸ھ میں مکمل ہوئی۔ ۱۷۱۶ء مطابق ۱۱۲۸ھ میں نواب علی کا انتقال ہوا۔

(۵) نواب باقر علی خاں :۔ نواب غلام علی خان کے فرزند اور نواب سعادت علی خان کے بڑے بھائی تھے۔ علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ کٹر شیعہ تھے۔ ۱۷۲۲ء مطابق ۱۱۳۵ھ میں "رموز الطاہرین" نامی مثنوی مکمل کی۔ ۱۷۳۹ء مطابق ۱۱۵۲ھ میں انتقال کیا۔

(۶) زین العابدین خاں دیوان :۔ نواب سعادت اللہ خان کی بہن منّا صاحبہ کے فرزند تھے۔ ۱۷۳۹ء مطابق ۱۱۵۲ھ میں مرہٹوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ فارسی کے عالم اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ خود کا فارسی دیوان مرتب کیا تھا۔ دکنی اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجئے ؎

جہان پر شد ز آواز عقیدت ھای من بہ دیوان مرید حافظ غیب اللسان فکر جوان من

(۷) شیخ صداقت اللہ (۱۰۴۲ھ تا ۱۱۱۵ھ) ۔ ان کے آباء و اجداد مصر سے جنوبی ہندوستان آئے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے ملتا ہے۔ تامل زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس زبان میں اسلامیات پر کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ عربی ہی میں شاعری کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے آپ کو [illegible] اس کا قاضی القضاۃ بنانا چاہا۔ آپ نے اپنے فرزند کا نام پیش کیا جسے بادشاہ نے قبول فرمایا۔ ۱۱۳۰ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔

(۸) میر مرتضیٰ منزدنی (۱۱۰۳ھ تا ۱۱۷۳ھ) سید محمد مدنی کے فرزند تھے۔ کوکن میں پیدا ہوئے۔ نہایت تنک مزاج تھے۔ ۱۱۵۷ھ میں ایک مثنوی بنام "پنج گنج" تحریر کیا۔ ۱۱۷۳ھ میں ارکاٹ میں انتقال کیا۔

اشعار پر تنقیدی نظر

اب تک ہمیں لذّتی کے صرف ۹۶ اشعار دستیاب ہو سکے ہیں۔ جن میں تذکرہ "گلزار اعظم" سے ۲ اور ۹۴ بمبئی یونیورسٹی لائبریری کے ایک مخطوطہ میں محفوظ ہیں۔ کسی اپنے سے متعلق کوئی رائے کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کا ضخیم دیوان ہی پیش نظر ہو، ورنہ مرزا غالب یوں ہرگز نہ کہتے : ع

مرزا غالب کی بھی بے رنگی سارے اردو ادب پر حاوی ہے۔ لہٰذا لذّتی کا مختصر سا دریافت شدہ کلام نہ صرف ان کے ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر ہونے کا اعلان کرتا ہے بلکہ دوسری طرف یہ سرمایہ ہندوستانی فارسی شاعری کا ایک گرانقدر ورثہ بھی ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ گیارہویں صدی ہجری میں جنوبی ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کی آبیاری نوابین کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔ لذّتی اس محفل کے شمع فروزاں تھے۔ اپنے معاصرین میں وہ اعلیٰ وارفع مقام رکھتے تھے۔ نواب سعادت اللہ خان کی ان پر خاص نظر عنایت تھی۔ لہٰذا لذّتی کے کلام سے فارسی شعر و ادب میں شیرینی، شگفتگی، حلاوت اور ملاحت کا اضافہ ہو رہا تھا۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی کی چاشنی سے ان کے اشعار .. "قند پارسی" بنے ہوئے تھے۔ سلاست، روانی اور شعریت نے ان کے اشعار کو جلا بخشی تھی۔ عشق و عاشقی کے رموز و غوامض کی عقدہ کشائی لذّتی کا خاصہ تھا اسی لئے غمہائے روزگار کی کسک اور درد دل کی چبھن جا بجا ان کے اشعار میں نمایاں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لذّتی کے یہاں روایتی انداز موجود ہے تاہم ان کے نئے پن اور انوکھے پن سے ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ لذّتی کے اشعار کی گوناگوں صفات ان کے فکر سخن کی نبض تھام کر ایک منفرد لب و لہجہ اور آہنگ کا اعلان کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ ؎

چو فکر لذّتی نبض سخن بگرفت از شوخی
شفا سنج معانی شد افلاطون ملازم ہا

لذتی کی انوکھی تراکیب سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ذیل کے شعر میں "موج خرام اور "زخم تیشہ" کی تراکیب غور طلب ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ؎

جوی شیرین آب از موج خرامت یافتہ
زخم تیشہ جام پرویز است فرہاد ترا

"غبار شہد" کی توصیف میں مبالغہ آمیز انداز میں کہتے ہیں۔ ؎

بلاگردان شوم تیغ نگاہ دل شکارانرا

اپنے "کیش وملت" کی بابت رقمطراز ہیں ۔

لذّتی راکیش وملت پیش زین درکار بود
بعد تحقیق آفت این کار شد فرہنگہا

لذّتی کا صوفیانہ رنگ وآہنگ بے حد جاذب نظر ہے۔ چنانچہ وہ والہانہ انداز میں کہتے ہیں ۔

جوشش بہار آئینۂ عکس روی کیست
نقش چمن سبوی می رنگ وبوی کیست
گلشن وضو گرفتہ ز سر جوشش خون دل
مست نماز آمدہ از خاک کوی کیست

سالکی کز ظلمت ہستی بروں دارد سفر
ہر قدم از نقش پایش آفتاب آید بروں

شاعرانہ تعلّی کے زعم میں لذّتی حافظ شیرازی کا تتبع کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

در عراق افتاد غوغا زین غزل گر پیش زین
شور نظم لذّتی از ہند تا بنگالہ بود

لذّتی کو شوق کی بے باکی عشق وعاشقی کے آداب کی تعلیم ان الفاظ میں دیتی ہے ۔

بیا بوس کہ اقبال محبت می برد مارا
کہ بے باکی شوقم میدہد تعلیم آدابم

شوخ وشنگ محبوب کے زلف گرہ گیر کی نسیم، لذّتی کی سوئی ہوئی قسمت کو کیسا نادر ونادر انوکھا تحفہ پیش کرتی ہے ملاحظہ کیجئے :۔

سراسیمہ چو بخت لذّتی برخاستہ از خوابم

لذّتی کے یہاں "چاشنی عافیت" عشق کے مذاق اور مزے کو تلخ تر کر دیتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چاشنی عافیت تلخ کند مذاق را
کاستنی دردِ را بزن کہ چشیدان دہیم

لذّتی کا حرف گویا اُن کا داغِ جگر ہے۔ جس سے ہمہ وقت خون رستا رہتا ہے لہٰذا وہ کہتے ہیں۔

از رقم لذّتی داغِ جگر می چکد
دامنِ قرطاس را لالہ دمیدن دہیم

لذّتی کا دل عشق کا مسکن ہے "داغ" اور "لالہ" جیسے الفاظ کی تکرار سے انھوں نے انوکھی بات پیدا کی ہے۔ بادہ نوشی کے لیے عمر خیام کے انداز میں جو جواز پیدا کیا ہے وہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ ملاحظہ کیجیے:۔

ہوایِ باغ دلم بسکہ عشق پرور است
ز داغ لالہ داز لالہ داغ می رویدہ
بنوش بادہ کہ عرصۂ چمن شبہا
ز آتشِ رخ گل صد چراغ می روید

رندی و مستی کی انتہا کو پہنچ کر لذّتی روزِ محشر کس انداز میں اُٹھنا چاہتے ہیں، اس کی منظر کشی ذیل کے شعر میں دیکھیے:۔

لذّتی فردائے محشر چون برآرد سر ز خاک
در بغل دیوان بکف جام شراب آید برون

ذیل میں لذّتی کا منتخبہ کلام من وعن پیش کیا جا رہا ہے۔

انتخاب

غزلیاتِ لذّتی

زہی در دامنِ زلفِ تو یارائی توہمہا — در آغوشِ نگاہت زعفران زادِ تبسّمہا

چو بر طور دماغم نشاءِ مئے شود طالع — برنگِ آتشِ موسیٰ کند ہستی تکلّمہا

نہ دل مینرند مضطرب بشوخیہا چو می آید — بسازِ اختراعِ چشم و ابرواز ترنّمہا

خوشا بزمی کہ شوقِ محفلش ذوقِ رسا باشد — کند ساقی می اندر جام از شورِ تبسّمہا

ہوای عشقِ مرغ روح را پروازمی بخشد — صبا از مطلعِ خورشید اندوزد شبنمہا

بنازم گردشِ چشمی کہ ہر گہ بسملش گشتم — چو طفلِ اشک می غلطم بدامانِ ترحّمہا

چو گل لبریز رنگ و بوی شد چاک گریبانم — مگر آمد دل از بیدادِ چشمت تظلّمہا

شہیدِ آرزوی او مگر آہی کشید از دل — کہ شمع لالہ زار افروخت یادِ داغِ تاملّہا

چو فکرِ لذّتی نبضِ سخن بگرفت از شوخی
شفا سنجِ معانی شد بقانونِ ملازمہا

ــــہ - نشاء - نشہ -

غزل

آہوی شوخی نگاری چشمِ صیّاد ترا — سینۂ دل لوحِ مشقی سنگِ بیداد ترا

جوی شیرین آب ازموجِ خرامت یافتہ — زخم تیشہ جام پر ریز است فرہاد ترا

نگاہت می برد از کف عنانِ ہوشیاران را — تبسّمہای شیرینِ تو کافی مئی گساران را

شکستِ شیشۂ ما سنگِ بیدادی نمی خواہد ۔۔۔ کفایت موجِ بی مہری ہلاکِ خاکسارانرا
کمانِ قامتم بشکست شستِ چینِ ابروی ۔۔۔ نوازد تیرِ مژگانش دلِ خاطر فگارانرا
چمن شد صیدگاہِ جلوہ انگیزیِ ضیا پاشی ۔۔۔ بود ہنگامِ سربازی بگلشن تاجدارانرا
ز لختِ دل بداماں گریہ ام جدول طراز آمد ۔۔۔ ہوای رنگ ریزی ہاست طبعِ آبدارانرا
غبارِ شہد ما توتیای چشمِ نرگس شد ۔۔۔ بلاگردانِ شوم تیغِ نگاہِ دل شکارانرا
برقناک[1] آمدی و گرم کردی آتشِ دلہا ۔۔۔ بودِ خاصیت می شبنمِ صبحِ بہارانرا

---

[1] برقناک، دھندلا سا پڑھا جاتا ہے۔

غزل

عشق چون از پردۂ جان برکشید آہنگہا ۔۔۔ ارغنون[1] را گوش مالد نالۂ دل سنگہا
باوجودِ خوابناکیِ دل ز ہوشیاران بہ ۔۔۔ نرگسِ مخمورِ او دارد عجب نیرنگہا
کاشتم تخمِ خیالش تا بدامانِ نگاہ ۔۔۔ میدمد از پردۂ چشمم بہار رنگہا
تا جنونم ابجدِ مہر بتان تعلیم داد ۔۔۔ کودکان را شد سرِ ما لوحِ مشقِ سنگہا
عشق را در کفر و دین یک ساز آہنگ است لیک ۔۔۔ مختلف از پردہا گردد نوای چنگہا
کفر و دین اہلِ محبت در زمانہ نگذاشتند ۔۔۔ شاطرانرا کی بود اندیشۂ فرسنگہا
لذتی را کیش و ملت بیش زین درکار بود ۔۔۔ بعد تحقیق آفتِ این کار شد فرہنگہا

---

[1] ارغنون: ایک ساز۔

غزل

جوشِ بہار آئینہ عکسِ روی کیست ۔۔۔ نقشِ چمن سبوی میِ رنگ و بوی کیست
شد خونِ گلِ سنبل ز تیغِ کرشمۂ ۔۔۔ بلبل بباغ تشنہ لبِ گفتگوی کیست

دل چون نمک زداز دم شمشیر عشوہ ام — این ماہی برشتہ طپان ز آب جوی کیست
ہم ناف عشق سوزد وہم حسن را جگر — ...[1] شراب ز جام و سبوی کیست
ہم چمن چمن گل داغ محبت اند — خورشید جبہ جبہ عرق ... کیست
اندر شفق جز چاک گریبان لذتی — شام و سحر نشستہ فلک ز آرزوی کیست

---

[1] ۔ ابن الہش ۔ ؟

غزل

دوش شمشیر خیالی بر دلم خونریز داشت
اشکم ز خون شہیداں موج رنگ آمیز داشت

سرمہ می جوشد اخگر نگاہم راز جوش
گلفروشی جلوہ بازار نرگس نیز داشت

رنگ و بوی گل غبار کربلای بلبل است
غمزہ چشم کہ یارب بر چمن مہمیز داشت

لالہ و بلبل خس سیل تماشای شود
حیرتم در باغ حسن چشم طوفاں خیز داشت

نالہ با گلگون اشکم ہم عنانی می نمود
از طپیدن ہای دل در زیر ران شبدیز[1] داشت

از غم شیرین لبی چند انکہ بر سر می زدم
تیشہ فرہاد بہتی افسر پرویز داشت

در شکست شیشہ ناموس دل بے باک بود
از خط نورستہ ساقی چو دست آویز داشت

ازهوای قامتی مستی شور انگیز داشت

توبه را در دامنِ لب آتشِ ساغر زدیم

شمعِ رندیهای ما پروانه پرهیز داشت

بود سرشارِ تبسّم آن لبِ خاموش دی

بی زبانیهای ما کیفیتِ لبریز داشت

سینه سوزِ آرزوها بود داغِ لذّتی

در چمن باغِ محبت لالۀ نوخیز داشت

---

۵ شبدیز: خسرو پرویز کے گھوڑے کا نام (نظامی گنجوی)

غزل

شب که برقِ حیرتِ ما سینه سوزِ لاله بود

داغِ لاله در چمنها شعلۀ جواله بود

سربزانو آرامیده از طپیدنهای دل

بر لبم مُهرِ خموشیها برای ناله بود

غمزۀ چشمی که شبخون بر گلستان کرده است

بر شهیدانِ چمن گریان سحرگه ژاله بود

حاصلی از پارسائی چون بجز کلفت نبود

نقشِ توبه بر لبِ ما نقطۀ بتخاله بود

رشکِ شاخِ لالۀ فردوس شد مژگانِ من

قطرۀ اشکم جوانِ داغِ جگر پرکاله بود

در میدانِ اختراعِ رقصِ بسمل مینمود

صیدِ دل را غمزۀ چشمش چو در دنباله بود

بمذاق افتادم تقاضای غزل گرپیش زین
شور نظم لذتی از ہند تا بنگالہ بود[1]

---

[1] ہند تا بنگالہ۔

غزل

نیاز و نوشِ غم پروردۂ آغوش بی تابم
شہیدِ جلوہ سیراب و حسن بی تابم

پرِ پروانہ ام خاکسترِ آئینہ شمعی
دلِ بلبل کبابِ آتشِ گلہای سرابم

چو مینای پری دارم سرشکِ جفاجوئی
برنگِ آرزو نقشِ طلسمِ گنجِ نایابم

نویدِ خنجرِ دل را چون اہلِ عزا امشب
سراسیمہ فلک می گشت در تجہیزِ اسبابم

سحر ہا از شکستم سرگران خورشید خواہد شد
بچشمِ بختِ بیداران گلستان شکر خوابم

ز ہم پاشیدہ میکردم ز اندک سرگرانیہا
گل سرِ شاخہ خمیازۂ لبہای حیابم

ندانم دل باستیصالِ شمشیر کہ می بوید
کہ موجِ اضطرابیہاست گردابِ سیلابم

خیالِ سرو دلجوی کہ .... ن میرسد امشب
کہ در صحن و سرائے سینہ ز آئینہ با آبم

۔۔ لوہر کہ اقبالِ محبت می برد ما را

کہ بے باکیِ شوقم مید ہد تعلیم آدابم

نمی گویم اسیرِ کیستم بر لالہ می غلطم

پریشان در شب مہتاب از دام رسن تابم

نسیمِ سنبلِ زلفش گلابی بر دماغم زد

سراسیمہ چو بختِ لذتی برخستہ از خوابم

غزل

دست بزلفی زنیم دل طپیدن دہیم : کشتہ چشمی شویم خون بچکیدن دہیم

از شکرین خندہ سینہ نمکدان کنیم

وز ہوس بوسہ لب بگزیدن دہیم

مست شرابی رسیم بندِ نقابی کشیم

صبح گل و لالہ را جامہ دریدن دہیم

آئینہ . . . دیدہ را صیقل حیرت زدہ

خرمن گلہ سوز را برقِ چمیدن دہیم

خاک در گلشنی رفتہ ز مژگان دمی

نرگسِ امید را سرمہ دیدن دہیم

شمع قمر جلوہ جام جنون دہد

نشاء پروانہ را روحِ رسیدن دہیم

شد شکی . . . . . . در ختن دام چین

آہوی آرام را سر برمیدن دہیم

نالہ بید ست و پا راہ بجای نبرد

آہ فلکِ تاز را بال بریدن دہیم

شد عدا در لغا نشاء غفلت شکست

گریۂ می زادہ را موج دویدن دہیم

ابر دی نطق آفرین عربدہ آغاز شد
لذّت دشنام را ذوقِ شنیدن دہیم
چاشنیِ عافیت تلخ کند مذاق را
کاستنی درد را برگ چشیدن دہیم
از رقمِ لذّتی داغِ جگر می چکد
دامنِ قرطاس را لالہ دمیدن دہیم

دل شد شکارِ غمزۂ شوخی سرشتہ
حُسنِ رسا بجوشِش ملاحت برشتہ
تیغی کشد گردشِ چشمی چو شاعری
زخم حمائل بگریبان نوشتہ
زلف کہ بلا[1] شکست دلِ من است
دامِ سعادت است بدوش فرشتہ
ای بوالہوس بکوی محبّت مرو بہ بین
ہرگوشہ رقص بسمل بیداد گشتہ
نمی جوشد از ترانۂ اشعارِ لذّتی
رنگِ بریدۂ دل از جودِ گذشتہ ء

---

[1] مشتری۔ نوشتہ است۔

غزل

ببین کہ سبزہ ۔۔۔ بباغ می روید
جنونِ تازہ مرا از دماغ می روید

چگونه باد ننوشد کسی درین موسم
ایاغ از کف و تاک از ایاغ میر دید

هوای باغ دلم بسکه عشق پرور است
ز داغِ لاله و از لاله داغ میر وید

ننوش باده که در عرصهٔ چمن شبها
ز آتشِ رخِ گل صد چراغ میر وید

غزل

صبح بهار و جلوهٔ گل فرشِ راه است
نسرین و لاله خار و خس جلوه گاهِ اوست

زاغ الیست آشیانی گلزارِ آفتاب
خالی که بر عذار چو زنا بنده ماه اوست

در لفظِ اضطراب چه معنی اضطراب
دلها بدامِ حلقهٔ زلفِ سیاه اوست

با ابرویش چگونه بسنجم هلال را
مژگانِ آفتاب چو جاروب راهِ اوست

تیغِ ستم ز کیفشِ چشمی که می چکد دکذا)
جانم شهید خنجرِ طرزِ نگاهِ اوست

غزل

چو بگلگشتِ چمن آن ماهتاب آید برون
گل بدعوی صبحدم با آفتاب آید برون

گریهٔ می زاده را موج دویدن دهیم
ابر دی نطق آفرین عربده آغاز شد
لذّت دشنام را ذوقِ شنیدن دهیم
چاشنی عافیت تلخ کند مذاق را
کاستنی درد را برگ چشیدن دهیم
از رقمِ لذّتی داغِ جگر می چکد
دامنِ قرطاس را لاله دمیدن دهیم

دل شد شکارِ غمزهٔ شوخی سرشته
حُسنِ رسا بجوششِ ملاحت برشته
تیغی کشد گردشِ چشمی چو شاعری
زخم حمائل بگریبان نوشته
زلف کر...[1] شکست دلِ من است
دامِ سعادت است بدوش فرشته
ای بوالهوس بکوی محبّت مرو ببین
هرگوشه رقص بسمل بیداد گشته
نمی جوشد از ترانهٔ اشعارِ لذّتی
رنگِ بریدهٔ دل از جودِ گذشته ع

---

[1] مشتری۔ نوشته است۔

غزل

ببین که سبزه.... بباغ می روید
جنونِ تازه مرا از دماغ می روید

چگونه باد نیوشد کسی درین موسم
ایاغ از کف و تاک از ایاغ میروید
هوای باغ دلم بسکه عشق پرور است
ز داغ لاله و از لاله داغ میروید
نیوش باده که در عرصهٔ چمن شبها
ز آتش رخ گل صد چراغ میروید

غزل

صبح بهار و جلوهٔ گل فرشِ راه است
نسرین و لاله خار و خس جلوه گاه اوست
زاغ الیست آشیانی گلزارِ آفتاب
حالی که بر عذار چونا بنده ماه اوست
در لفظِ اضطراب چو معنی اضطراب
دلها بدامِ حلقه زلفِ سیاه اوست
با ابروش چگونه بسنجم هلال را
مژگانِ آفتاب چو جاروب راه اوست
تیغِ ستم زکیفشِ چشمی که می چکد (کذا)
جانم شهید خنجرِ طرز نگاه اوست

غزل

چو بگلگشتِ چمن آن ماهتاب آید برون
گل مدعی صبحدم با آفتاب آید برون

بلبل چشمی کہ حیران گلِ رخسار اوست
ہمچو نرگس از ہم آغوشی خواب آید بروں

سالکی کز ظلمتِ ہستی برون دارد سفر
ہر قدم از نقشِ پایش آفتاب آید...

پردۂ رخسارِ وحدت نقطۂ بستر لست (کذا)
میشود دہ یک جو صفری از حساب آید برون

میگریزد واعظا! منای می از انجمن
چون درآمد در چمن بلبل غراب آید برون

ذرّہ سان سرمست سازد زاہدِ صد سالہ را
آفتاب روی او چون از نقاب آید برون

لذّتی فردای حشر چون برآرد سر ز خاک
در بغل دیوان بکف جام شراب آید برون

ز اشعار ۹۴ + ۲ = ۹۶)

کتابیات

1. Arabic & Persian in curnalic by Dr. yusuf Kokan.
2- Descriptive catalogue of the Arabic Persian and urdu Manuscripts in the library of the university of Bombay by S A.Qadir Sarfaraz.

3 - تذکرۂ گلزارِ اعظم۔ از غلام غوث خاں بہادر۔
4 - گلدستہ کرناٹک۔ از غلام علی۔ حکیم موسیٰ رضا الحق۔
5 - تذکرۃ الشعراء: محمد عبد الغنی دعہد اکبر کے ایک شاعر لذّتی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں
[لذّتی مہدی علی در آگرہ می بود نسبت اُستادی بہ شیخ فیضی داشت] اسکا ہمارے شاعر سے کوئی

بُرہان

شمارہ ۱	جولائی سنہ ۱۹۹۱ء مطابق محرم الحرام سنہ ۱۴۱۲ھ	جلد ۱۰۸

عمید الرحمٰن عثمانی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۱۹۹۱ء کے پارلیمنٹری انتخاب کے بعد دسویں پارلیمنٹ وجود میں آئی ہے۔ اس دسویں پارلیمنٹ کے پہلے اجلاس کے افتتاحی صدارتی خطبے میں محترم صدر جمہوریۂ ہند جناب آر وینکٹ رمن نے ملک کی موجودہ اقتصادی، فرقہ وارانہ اور امن داماں کی . . صورتِ حال پر جو تفصیل سے اظہارِ خیال فرمایا ہے وہ بڑی ہی اہم بات ہے۔ انھوں نے جن جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہر ہندستانی کے لیے نہ صرف خصوصی توجہ ہی کا باعث ہیں بلکہ وہ ان کے لیے لمحۂ فکریہ کا بھی درجہ رکھتی ہیں۔

اس وقت ملک کے سامنے کتنے ہی مسائل ہیں جو بھیانک روپ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ایک دو مسئلے تو ایسے ہیں جن کے ساتھ ملک کی سالمیت، یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد وابستہ ہے۔ اگر ان مسئلوں کو صحیح طرزِ فکر کے ساتھ حل نہ کیا گیا تو ملک خطرناک دوراہے پر جا کھڑا ہو سکتا ہے ایسا خیال کرنا کوئی غلط بات نہ ہوگی۔

دسویں پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے جناب صدر جمہوریۂ ہند نے ہر اس مسئلہ پر تفصیل وصاف گوئی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے جو ملک کے موجودہ . . حالات کے مدِّنظر پہلی فرصت میں توجہ کا طلب گار ہے۔

اقتصادی بحران سے متعلق مسئلہ ہو یا ملک کے امن وامان و فرقہ وارانہ میل ملاپ کے بارے میں خطروں سے بھرے چیلنج، پنجاب و کشمیر اور آسام کے تشویشناک واقعات وحالات کے سلسلے میں انھوں نے حکومتِ ہند کی طرف سے مستقبل میں ہونے

[illegible]

کاموں کی نشاندہی کردی ہے۔ صدر جمہوریۂ ہند نے ان وعدوں کو بھی پورا کرنے کا بھروسہ دلایا ہے جو کانگریس (آئی) نے اپنے الیکشن مینوفیسٹو میں کیے تھے۔ ہم صدر جمہوریۂ ہند کے دسویں پارلیمنٹ میں خطاب کا یہاں پُرجوش طریقہ سے خیر مقدم کرتے ہیں اور انھیں مبارکباد بھی پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اتنے عظیم الشان و جلیل القدر عہدۂ صدارت پر فائز رہتے ہوئے ہندوستانی عوام کی بنیادی ضروریات و مسائل کو محسوس کیا اور اسے سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کی بات بھی عزم مصمم کے ساتھ کہی۔ صدر جمہوریۂ ہند کا ایوان نمائندگان کے سامنے خطاب دراصل حکومت ہند کی پالیسی کا آئینہ دار ہوتا ہے حکومت جو چاہتی ہے اور جو کچھ مستقبل میں کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اسے وہ ... عزت مآب صدر جمہوریہ ہند کی وساطت سے عوام الناس تک پہنچا دیتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارا آئین صدر کو اس قدر بھی اختیار نہیں دیتا کہ وہ اس سے اپنے ہلکے سے اختلاف کا اظہار بھی نہ کرسکے۔ کتنے ہی موقعوں پر صدر نے حکومت ہند کی باتوں سے اختلاف کیا ہے۔ جناب آر وینکٹ رمن کے سامنے تو ابھی ایسی صورتحال نہیں آئی ہے مگر ان کے پیشروؤں کے سامنے بیشک ایسی صورتِ حال نے حکومت ہند کو خاصی الجھن میں ڈالا تھا۔

دسویں پارلیمنٹ میں صدر جمہوریۂ ہند کا خطبۂ حکومت اور صدر کے مکمل اتفاق رائے کا عوام کے سامنے تحفہ ہے۔ اس لیے اور بھی یہ قابل ستائش ہے۔

ملک کی معاشی صورتِ حال بڑی ہی سنگین ہو چکی ہے اور صدر جمہوریۂ ہند نے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ عوام کو سنگین معاشی بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۸۹ء میں غیر کانگریس حکومت کی پالیسیوں نے ملک کو موجودہ سخت معاشی بحران میں مبتلا کرنے کے ساتھ ساتھ بد ترین فرقہ واریت اور ذات پات کی زبردست تفریق کی دیوار کھڑی کردی ہے جسے آسانی سے دور کرنا ہی دشوار و مستبعد ہے۔ عوام نے کانگریس پر جو غصّہ دکھایا تھا اس کے نتیجہ میں

میں غیر کانگریس حکومت برسرِ اقتدار آئی ۔ اس غیر کانگریس حکومت کی ناعاقبت اندیشی نے آج ملک کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کر دیا ہے جو کسی بھی طرح "جوالامکھی" سے کم نہیں ہے۔ "جوالامکھی" کے پھٹنے سے جو نقصانِ عظیم ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے ۔

۹۲-۱۹۹۱ء کا عام بجٹ ابھی پیش نہیں ہوا ہے ۔ جب کہ اسے فروری میں یا مارچ میں قطعاً پیش ہو جانا چاہیئے تھا مگر بجٹ کی آمد سے پہلے ہی چندر شیکھر حکومت نگراں حکومت کے بطور ہو کر رہ گئی ۔ پارلیمنٹ تحلیل ہو گئی تھی اور اس وجہ سے مستقل حکومت یا پارلیمنٹ کی غیر موجودگی میں بجٹ پیش ہی نہیں ہو سکتا ہے ۔ ایڈمنسٹریشن کے کام کاج و سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کے لیے پیسہ کی فراہمی میں بڑی دِقّت پیش آئی جسے قانونی رکاوٹوں سے بڑی مشکل سے نپٹتے ہوئے ہی حل کیا گیا ۔
معاشی بحران تو ملک کو پہلے ہی درپیش تھا ، اس میں خلیجی جنگ نے مزید شدت پیدا کر دی ۔ صرف خلیجی جنگ نے ہی ہندوستان کو ۴۹ ارارب روپیہ کے بوجھ تلے دبا دیا ۔ سب سے زیادہ ملک کو زرِ مبادلہ کی کمیابی بے چین کیے ہوئے ہے اور آج کے بین الاقوامی تعلقات کے دور میں اس کی اہمیت سے انکار بھی محال ہے ۔
زرِ مبادلہ کی کمی ہی کے پیشِ نظر حکومت ہند نے اپنے قیام کے مختصر وقفہ میں ہی تین بار اپنے روپیہ کی قیمت گھٹا دی کہ اس سے ملک کی برآمدگی میں زیادتی ہو گی اور ملک پر جو زبردست قرضہ کا بوجھ ہے اس سے کسی قدر قرض کی ادائیگی میں آسانی پیدا ہو گی ۔ زرِ مبادلہ میں کمی غیر مقیم ہندوستانیوں کی طرف سے آنے والی رقم کے بند ہونے سے ایک دم ہو گئی اور پھر ان کی وطن واپسی سے ملک پر ناقابلِ بیان بوجھ پڑ گیا معاشی صورتِ حال کے بگڑنے سے ملک ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہو گیا ۔
اس خطرناک صورتِ حال کو نئی حکومت نے جس طرح حل کرنے کا تہیہ کیا ہے وہ ہمارے خیال میں درست ہی ہے ۔ یعنی حکومت ہند نے اس دوا سے کام لیا ہے جو مریض کے لیے واقعی فائدہ مند ہو چاہے وہ کڑوی ہی کیوں نہ ہو ۔ میٹھی دوائی دے کر مریض کی

وقتی طور پر تو واہ! واہ لوٹی جاسکتی ہے مگر اس سے مریض کی شفا یابی کی کوئی گارنٹی نہیں ہے مریض کو اس سے زندگی کی بجائے موت ہی نصیب ہوتی ہے حکومتِ ہند نے معاشی بحران سے ملک کو نکالنے کے لیے صحیح تدبیر سے کام لیا ہے گو اسے وقتی طور پر عوام کی لعن طعن ضرور سننا پڑے گی کیونکہ کچھ مدت تک مشکلات کا سامنا ہوگا مگر عوام کو یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ وقتی مشکلات کی دیرپا راحت و آسائش کے مقابلے میں کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔

صدر جمہوریۂ ہند کے خطبہ میں دوسری جو اہم باتیں کہی گئی ہیں وہ بھی اہم ہیں، مثلاً بابری مسجد، رام جنم بھومی قضیہ سے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ یہ قضیہ آپسی گفت و شنید و اتفاق رائے سے سلجھانا ہی ملک و قوم کے مفاد کے عین مطابق ہوگا ورنہ پھر عدالتی فیصلے پر ہی انحصار کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ باقی تمام عبادت گاہوں کی اس حیثیت کو برقرار رکھنے کی ضمانت قانون بنا کر دینا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومتِ ہند اپنے دورانِ الیکشن وعدے پر قائم ہے اور اسے پورا کرنے کا بھی وہ تہیہ کیے ہوئے ہے یہ خوش آئند بات ہے اور نئی حکومت ملک و قوم کی طرف سے تحسین کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے تعاون کی بھی بجا طور پر مستحق ہے۔

صدر جمہوریۂ ہند نے اپنے خطبۂ صدارت میں مذکورہ باتوں کے علاوہ سماجی انصاف جن میں عورتوں کی بہبود کے لیے کمیشن کے قیام، اقلیتی کمیشن کو قانونی درجہ دے کر مستحکم کرنا، پسماندہ طبقوں کی بہبود اور ترقی کے لیے ایک ترقیاتی کارپوریشن کے قیام، ترقیٔ اطفال، خدمت کے مربوط پروگرام کی مزید توسیع، ابتدائی صحت عامہ کی خدمت کی بہتری، خاص طور پر دیہی علاقوں میں ان اقدامات کی مزید توسیع وغیرہ شامل ہیں کشمیر، پنجاب و آسام وغیرہ میں امن و امان کی صورتِ حال کو معمول پر لانے کے لئے حکومتِ ہند اپنی توجہ خصوصی مبذول کرے گی ہی اس کی امید ہر ہندوستانی کو کرنی چاہیئے۔ فرقہ وارانہ فسادات پر خصوصی فورس کی جلد از جلد تشکیل کے لیے حکو

اقدامات بروئے عمل لانے میں سنجیدگی کے ساتھ کوشاں رہے گی اور ان سب باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ حکومت ہند ملک وقوم کی فلاح وبہبود ومفاد سے متعلق کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گی۔ چونکہ انسان بہرحال انسان ہے اسے کہی اور اَن کہی کا فرق محسوس کرنا ہی ہوگا۔ جو اس کے سامنے کہا جارہا ہے پہلے مرحلے میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پر اعتبار ویقین نہ کیا جائے۔ اور اس توقع وامید کے ساتھ ہم جناب نرسمہا راؤ حکومت کا خیر مقدم کرتے ہوئے قدم قدم پر بلاشرط مخلصانہ تعاون پیش کرنے کا انھیں یقین دلاتے ہیں۔

زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں؟

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور ۵۷

(۳)

چنانچہ علامہ جصاص رازی تحریر کرتے ہیں:

"اگر یہ پوچھا جائے کہ ان دونوں جہادوں میں کونسا جہاد افضل ہے؟ آیا نفس اور مال کا جہاد یا علم کا جہاد؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تلوار کے ذریعہ جہاد کرنا علمی جہاد پر موقوف ہے اور وہ (تلوار کا جہاد) اُس کی (علمی جہاد کی) ایک شاخ ہے۔ کیونکہ تلوار کے ذریعہ جہاد کرنے میں اُس چیز سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے جس کو علم نے واجب قرار دیا ہو۔ اس اعتبار سے علمی جہاد اصل ہے اور جسمانی جہاد اُس کی ایک شاخ ہے۔ اور اصل اُس کی شاخ سے زیادہ فضیلت والی ہے۔

فان قیل فأی الجهادینِ أفضلُ؟ أجهاد النفس والمال أم جهاد العلم؟ قِیل له الجهاد بالسّیفِ مبنیّ علی جهادِ العلم وفرعٌ علیه، لأنّه غیرُ جائز ان یعدوا فی جهاد السیف ما یُوجبُه العلم۔ فجهادُ العلم أصلٌ وجهاد النفس فرعٌ۔ والأصل أولی بالتفضیل من الفرع۔[۴۸]

---

[۴۸] احکام القرآن ۳/۱۱۹

یہ ایک بصیرت افروز بیان ہے جو حقائق و معارف سے بھرپور ہے۔ اور اس سے اسلام میں جہاد کی اصل حقیقت اور اُس کا فلسفہ پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اور اس سے حسبِ ذیل حقائق ثابت ہوتے ہیں :

۱۔ علمی جہاد اصل ہے ۔

۲۔ علمی جہاد جسمانی جہاد پر حاکم ہے۔ یعنی جب تک علمی اعتبار سے جہاد کے حُدود و مقاصد واضح نہیں ہو جاتے جسمانی جہاد کو آزادی کے ساتھ جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ بالفاظِ دیگر جسمانی جہاد علمی جہاد کے تابع رہے گا اور جب تک علم یہ اعلان نہ کردے کہ جہاد (جسمانی) کن حالات میں ضروری ہے اور کن حالات میں ضروری نہیں ہے، وہ اپنے طور پر کچھ نہیں کرسکتا۔

۳۔ اس اعتبار سے علم ہر حال میں افضل ہے ۔

جہادِ علمی کا ایک تاریخی ثبوت

نیز اس موقع پر ایک اور بہت بڑی اور تاریخی حقیقت یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ چونکہ جصاص رازی چوتھی صدی ہجری کے عالم اور فقہ حنفی کے ایک زبردست فقیہ گزرے ہیں۔ اور اُن کی اس بحث سے یہ عظیم حقیقت بھی پوری طرح وانشگاف ہوجاتی ہے کہ ہمارا فقہی ذخیرہ کم از کم چوتھی صدی ہجری میں علم کے جہاد میں شامل ہونے کے تصوّر سے ناآشنا نہیں تھا۔ چنانچہ موصوف کا جہاد کی دو بنیادی قسمیں قرار دیتے ہوئے علم کو جہاد کی ایک مستقل قسم تسلیم کرنا اسی حقیقت کے اعتراف کا ایک ناقابلِ تردید تاریخی ثبوت ہے کہ دورِ قدیم ہی سے "علمی جدوجہد" بھی نہ صرف جہاد تسلیم کی گئی ہے بلکہ وہ جہاد کی اعلیٰ و ارفع شکل کے طور پر اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ اس طرح محقق اہلِ علم کی متواتر شہادتوں سے یہ مقدمہ نہایت درجہ مضبوط ہوجاتا ہے۔ اور ان حقائق کا انکار کوئی مادرزاد اندھا بہرا شخص ہی کرسکتا ہے۔

نیز اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ علامہ جصاص رازی نے اس موقع پر "جہاد العلم" کو "جہاد النفس" کے مقابلے میں بطور ایک اصطلاح استعمال کیا ہے۔ اس کا صاف مطلب

یہ ہُوا کہ چوتھی صدی ہجری میں "علمی جہاد" بطور ایک اصطلاح رائج اور مقبول ہو چکا تھا۔ جیسا کہ اس موقع پر موصوف کے اُسلوبِ کلام سے ظاہر ہوتا ہے جو سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ اس سے بڑا تاریخی ثبوت اور کیا چاہیے ؟

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ ۔

قَدْ جَاءَكُم بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا؛ دیکھو تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس اسباق آچکے ہیں۔ تو اب جس نے بصارت سے کام لیا تو فائدہ میں رہا اور جو اندھا بنا تو وہ زیاں کار ہوا۔ (انعام : ۱۰۴)

غرض امام جصاص کی مذکورۂ بالا توجیہہ و تشریح محض یک عقلی توجیہہ نہیں بلکہ وہ قرآن اور حدیث کی صراحتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم سے یہ بات ثابت ہے کہ اہلِ علم کا درجہ دیگر تمام اہلِ ایمان سے اُونچا ہے جو غیر اہلِ علم ہیں :

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ : اللہ تم میں سے ایمان والوں کے اور اُن لوگوں کے درجے بلند کرتا ہے جن کو علم دیا گیا ہے۔ (مجادلہ : ۱۱)

حضرت ابنِ مسعودؓ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہلِ علم کی فضیلت بیان کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن اہلِ ایمان پر اہلِ علم کا درجہ بلند کرتا ہے جو اہلِ علم نہیں ہیں، جب کہ وہ خُدا کے حکموں پر چلیں[49]

اور احادیثِ نبوی میں علم اور اہلِ علم کی جو فضیلت آئی ہے اُن پر مفصل تبصرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین میں علم سے بڑا مقام و مرتبہ کسی دوسری چیز کا نہیں ہے۔ کیونکہ علم ہی وہ شے ہے جس سے اچھے بُرے میں تمیز ہوتی ہے اور خُدا کی مرضی اور اُس کے احکام معلوم ہوتے ہیں۔ دین کی درستی علم کی درستی پر موقوف ہے۔ اگر علم غلط ہو جائے تو پھر پورا دین اور لوگوں کے سارے

---

[49] ماخوذ از تفسیر قرطبی، ۱۷/ ۲۹۹

اعمال غلط ہوجائیں گے۔ بلکہ خود جہاد بھی غلط ہوجائے گا۔ کیونکہ جہاد کی اصل باگ ڈور بھی علم ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ لہٰذا علم کا سرچشمہ خالص اور بے آمیز ہونا چاہئے۔ اگر کسی دور میں کوئی شخص علم کے اس سرچشمے کو گدلا کرنے کی کوشش کرے یا کوئی ایسی فکری و نظریاتی تحریک چلے جو دین اور اُس کے اقدار پر اثر انداز ہو رہی ہو تو پھر ایسی حالت میں اس قسم کی تحریکوں کے خلاف علمی جنگ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اسی کا نام علمی جہاد ہے جو ایک " مقدس جنگ " یا ایک مقدس فریضہ کہلاتا ہے۔

علمی جنگ کی دو قسمیں

اس لحاظ سے موجودہ دور میں دو قسم کی علمی جنگ کرنا ضروری ہے۔ ایک بیرونی اور دوسری اندرونی۔ بیرونی علمی جنگ یہ ہے کہ اسلام پر باہر کی طرف سے مختلف قسم کے مادی افکار و نظریات اور لادینی اقدار کا جو سیلِ رواں آرہا ہے انہیں روکنے اور اسلامی معاشرے کو اُن کے مضر اثرات سے بچانے کے لئے علمی جنگ خود مغرب کے "ہتھیاروں" سے لڑی جائے۔ یعنی " جیسا دیس ویسا بھیس " کے مطابق الحاد و لادینیت کا مقابلہ خود اُسی کے ہتھیاروں یعنی اُسی کے " علوم و معارف " سے کی جائے۔ کیونکہ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے، لکڑی یا کوئی اور چیز کاٹ نہیں سکتی۔ جس طرح کہ توپوں اور ٹینکوں کا مقابلہ توپوں اور ٹینکوں ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم توپ کے مقابلے میں تلوار یا نیزے لے کر چلیں تو یہ ہماری خودکشی کے برابر ہوگا۔ لہٰذا اس اعتبار سے دینِ اسلام کو غالب کرنے کے لئے آج جدید علوم کے ذریعہ اسلام کی حقانیت اور برتری ثابت کرنی ہوگی۔ اور یہ علمی جنگ خالص استدلالی میدان میں ہونی چاہئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے تین طریقے بتائے ہیں: ایک یہ کہ دین کی دعوت حکیمانہ انداز میں دی جائے۔ دوسرے یہ کہ دلنشین خطاب کے ذریعہ لوگوں کو بلایا جائے۔ اور تیسرا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ عقلی مباحثہ کے ذریعہ دین کی برتری ثابت کی جائے۔ (نحل : ۱۲۵) یہ علمی جنگ ہمیشہ مسلمانوں کے ذمہ ایک فرضِ کفایہ کی حیثیت سے رہے گی۔ اگر تمام مسلمان اس سے غافل ہوجائیں تو پھر سب کے سب مجرم ہوں گے۔

اور دوسرا محاذ اندرونی فتنوں اور سازشوں کے خلاف ہے، جن میں خاص کر گمراہ اور بدعقیدہ فرقے آتے ہیں، جو مار آستین کی طرح خود ہماری صفوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام منافقین کے ساتھ جہاد ہے، جس کا ذکر سورۂ توبہ (آیت ۷۳) میں آیا ہے۔

علمی وعسکری جہاد کا باہمی ربط

بہرحال ان دونوں محاذوں پر علمی جنگ (جہاد) کرنا ہر دور میں فرضِ کفایہ ہے۔ اور یہ موجودہ دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور اس جنگ کو ہمیشہ اور ہر حال میں جاری رہنا چاہیئے۔ جیساکہ ارشادِ رسول ہے: "جہاد اُس وقت سے برابر جاری ہے جب سے کہ اللہ نے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، تاآنکہ میری اُمت کا آخری فرد دجال سے دو دو ہاتھ نہ کرلے"۔

بدنی جہاد تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ مگر علمی جہاد کو ہر حال میں جاری رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ جصاص رازی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اُس سے یہ حقیقت پوری طرح بے نقاب ہوجاتی ہے اور اسلام میں ان دونوں کے مقام و مرتبے کا حال آشکارا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ موصوف "علم کا حاصل کرنا افضل ہے یا مشرکین سے جہاد کرنا افضل؟" کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

" اس کا جواب یہ ہے کہ جب دشمنوں کی ایذا رسانی اور اُن کے حملے کا خوف ہو اور اُن کی مدافعت کرنے والا کوئی نہ ہو تو ایسی حالت میں جہاد ہر مسلمان پر فرض ہوجائے گا۔ اور ایسی حالت میں جہاد کرنا علم حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہوگا۔ کیونکہ جب مُسلمان دشمن کے ضرر کا شکار ہوجائیں تو اس کی تلافی ممکن نہیں ہوسکتی۔ جب کہ علم کی تلافی تمام حالات میں ممکن ہے اور اگر فرضِ جہاد کی ادائیگی کے لئے (کچھ لوگ) تیار ہوجائیں، جس کے باعث دوسروں کی جانب سے کفایت اور بے نیازی ہوجائے تو اس صورت میں جہاد کا فریضہ علم کے حصول ہی کی طرح فرضِ کفایہ کے حکم میں ہوجائے گا۔ اور ایسی حالت میں علم میں مشغول ہوجانا جہاد سے زیادہ افضل ہوگا۔ جیساکہ ہم نے مرتبۂ جہاد پر مرتبۂ علم کی وجہ ظاہر کردی ہے۔ اس اعتبار سے جہاد

کا ثبات علم کے ثبات پر موقوف ہے۔ کیونکہ جہاد علم کی ایک شاخ ہے اور اُس کا انحصار علم پر ہے"۔ ۵۰

اس اعتبار سے علم اور جہاد میں بہت بڑا اور گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ یہ دونوں مل کر ملّتِ اسلامیہ کے قیام و ثبات اور اس کی درستی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عام حالات میں دین کی تبلیغ اور اُس کی نشر و اشاعت ضروری ہے۔ مگر خاص حالات میں، جب کہ دشمن کا حملہ ہو جائے یا اُس کا خطرہ پیدا ہو جائے تو پھر اس وقت علمی جہاد کو روک کر بدنی و جسمانی جہاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے، جب کہ تمام اہلِ اسلام کی جنگ میں شرکت ضروری ہو۔ ورنہ لڑنے والے مجاہدین اگر کافی تعداد میں موجود ہوں تو پھر علمی جد و جہد (جہاد) کو ہر حال میں جاری رکھنا ضروری ہے۔ یہ قرآن، حدیث اور ہمارے ائمہ کرام کی تعلیمات کا خلاصہ اور اُس کا نچوڑ ہے۔

حاصلِ بحث یہ کہ علمی جہاد اصل اور بدنی جہاد اُس کی ایک شاخ ہے۔ علمی جہاد کو ہر حال میں جاری رہنا چاہیئے۔ جب کہ بدنی جہاد ضرورت کے وقت ہی فرض ہوتا ہے۔ (کبھی فرضِ کفایہ اور کبھی فرضِ عین)۔ جب ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں اور امامِ وقت کی جانب سے "نفیرِ عام" کا اعلان ہو جائے تو اُس وقت ہر مسلمان پر جہاد (عسکری) فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ مگر اس قسم کے جہاد اور "نفیرِ عام" کا فیصلہ کرنا بھی (جصاص رازی کی تصریح کے مطابق) اہلِ علم ہی کا کام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ امامِ وقت کے پاس اہلِ علم کی ایک جماعت (بطورِ شوریٰ) ہونی چاہیئے جو اُسے جہاد کے ضروری ہونے کا فتویٰ دے اور پھر امامِ وقت (مسلمانوں کا امیر) اعلانِ جہاد کرے۔ تب جا کر جسمانی جہاد حالات کی نزاکت کے لحاظ سے بعض صورتوں میں فرضِ کفایہ اور بعض صورتوں میں فرضِ عین بن جائے گا۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں سے بطورِ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلانِ جہاد کے لئے امیر (یا خلیفہ) کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جہاد کا

---

۵۰ احکام القرآن، جصاص رازی، ۱۱۹/۳

فیصلہ کرنا یا اس کا اعلان کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

علمی جہاد کا ثبوت قرآن سے

اس تشریح و توجیہہ سے بخوبی واضح ہو گیا کہ راقم سطور کا منشا فی سبیل اللہ کو مطلقاً عام قرار دینے کا نہیں ہے۔ اگرچہ وہ ملک العلماء کاسانی کی تاویل کے مطابق عام ہے[۵۱]۔ مگر اس کی عمومیت جہاد کی تاویل میں آکر مقید ہو جاتی ہے۔ اور جہاد سے حدیثِ نبوی کی صراحت کے مطابق غزوہ و حج کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ علمِ دین کی تعلیم و تدریس اور اس کی نشر و اشاعت مراد ہے۔ لہٰذا فی سبیل اللہ اگر عام بھی ہو تو جہاد اس کی تخصیص کر رہا ہے۔ اور اس اعتبار سے زکاۃ کے آٹھ مصارف پر نہ تو کوئی اضافہ ہو رہا ہے اور نہ اس کے تحت پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کا کوئی منصوبہ راقم سطور کے زیرِ غور ہے، جس کی معترض "نعوذ باللہ" کی مسلسل گردان کرتے ہوئے پیہم چیخ و پکار کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک استحصالی طریقہ ہے۔ (واضح رہے کہ راقم سطور نے اپنے مضمون میں کہیں بھی پلوں اور سڑکوں کی تعمیر یا اُن کی مرمت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مگر معترض کسی ایک نکتے پر تشفی بخش بحث کرنے اور علمی انداز میں جواب دینے کے بجائے بہت سی چیزوں کو گڈمڈ کر کے شور مچانے والا سا انداز اختیار کرتے ہیں۔ تاکہ وہ عوام کو برانگیختہ کر سکیں۔)

بہرحال راقم سطور نے اپنے کتابچے (اسلام میں زکاۃ کا نظام) میں "جہاد علمی و قلمی بھی ہو سکتا ہے" کے زیرِ عنوان جو کچھ تحریر کیا تھا وہ مذکورۂ بالا پوری بحث کا خلاصہ ہے۔ چنانچہ اس موقع پر اسے بھی ملحوظ رکھنا چاہئے جو مختصر اور جامع نکات پر مشتمل ہے:

"اس موقع پر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ "فی سبیل اللہ" سے مراد لازمی طور پر جہاد نہیں ہے، جیساکہ اوپر مذکور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۳ کی تفسیر سے بخوبی ظاہر ہو گیا۔ لیکن اگر بالفرض اس سے جہاد ہی مراد لیا جائے تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس سے مراد جسمانی جہاد یعنی جنگ و جدل ہو۔ بلکہ جہاد کی اور بھی شکلیں ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ایک شکل علمی و قلمی جہاد

۵۱۔ تفصیل پچھلے مباحث (حصۂ اول) میں گزر چکی ہے۔

کی بھی ہے۔ جیسا کہ خود قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا : اور تو قرآن کے ذریعہ کافروں سے بڑا جہاد کر۔ (فرقان : ۵۲)

اور جہاد قولی یعنی وعظ و نصیحت کے طور پر بھی ہو سکتا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ : اے نبی تم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ (توبہ : ۷۳)

پہلی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ سب سے بڑا جہاد تو قرآن ہی کے ذریعہ کرنا ہے۔ یعنی قرآنی حقائق و معارف کے ذریعہ باطل قوتوں کا مقابلہ زور و شور سے کرنا ہے۔ یہی اصل جہاد ہے۔ اور دوسری آیت میں لسانی جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب تحریر کرتے ہیں : "منافقین سے جہاد کا مطلب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل سے یہ ثابت ہوا کہ اُن کے ساتھ جہاد سے مراد زبانی جہاد ہے، کہ اُن کو اسلام کی حقانیت سمجھنے کی دعوت دیں تاکہ وہ اپنے دعوائے اسلام میں مخلص ہو جائیں۔" (تفسیر معارف القرآن : ۴/۴۲۲)

لہٰذا جہاد کا مطلب لازمی طور پر تلوار اُٹھانا نہیں ہے۔ بلکہ سب سے پہلا نمبر لسانی اور علمی و قلمی جہاد کا ہے۔ اور جہاد بالسیف کا نمبر سب سے آخر میں آتا ہے، جب کہ اولین مراحل ناکام ہو جائیں۔ دعوتِ اسلام میں یہ ترتیب ہمیشہ ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اور بعض حدیثوں کے مطابق ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا افضل ترین جہاد قرار دیا گیا ہے۔ (ترمذی کتاب الفتن : ۲/۱۳۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حق بات کی ترویج و اشاعت مقدّم ہے۔ کیونکہ اتمامِ حجّت کے لئے سب سے پہلے حق بات پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ جصّاص رازی حنفیؒ علمی جہاد کو اصل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں کہ آیا نفس و مال کا جہاد افضل ہے یا علم کا جہاد؟ فرماتے ہیں کہ علم کا جہاد اصل ہے اور نفس کا جہاد فرع ہے۔ لہٰذا اصل فرع سے افضل ہے۔ (احکام القرآن : ج ۳ ص ۱۱۹)

ظاہر ہے کہ جانی و مالی جہاد کے لئے علم ہی بنیاد بنتا ہے اور علمی و فکری اعتبار سے وہی اس
کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی بھی معرکہ سر کرنے یا ملک و ملت کے بچاؤ اور دفاع کے لئے
سب سے پہلے علمی اعتبار سے جدوجہد کر کے میدان ہموار کرنا پڑتا ہے۔ گویا کہ ملت کو "حرکت"
میں لانا علم کا کام ہے۔ اور اس اعتبار سے علم ہی اصل ہے اور علمی جہاد ہی کا نمبر پہلا ہونا چاہئے۔
اس اعتبار سے "فی سبیل اللہ" سے اگر جہاد مراد لیا جائے تو اس میں علمی و قلمی جہاد بآسانی
شامل ہو سکتا ہے۔ اور اس میں تاویل کرنے اور فی سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت پیدا کرنے
کی ضرورت بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ اور اس اعتبار سے موجودہ دور کا سب سے بڑا جہاد
الحاد و لادینیت کے خلاف معرکہ آرائی ہے۔ کیونکہ آج دین و مذہب کو سب سے بڑا خطرہ جو لاحق
ہے وہ الحاد و لادینیت ہی کی طرف سے ہے۔ لہٰذا آج جو علمی و اشاعتی ادارے الحاد و لادینیت
اور باطل تحریکوں کے خلاف صف آراء ہیں وہ ارشادِ الٰہی (فرقان: ۵۲) کے مطابق وقت کے
سب سے بڑے جہاد میں مشغول ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ زکاۃ کی قیمتی رقم سے ایسے اسلامی
اداروں اور تنظیموں کے بازو مضبوط کئے جائیں، تاکہ وہ بے فکری اور بے جگری کے ساتھ اپنے
فرائض ادا کر سکیں"۔ [۵۲]

دیکھئے اس "خلاصہ و نچوڑ" اور پچھلی تفصیلی بحث میں کسی قسم کا اختلاف یا حرف گیری کی
کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مگر مدعیٔ تحقیق نے بے سوچے سمجھے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور غیض و غضب
کا اظہار کرنے لگ گئے۔ گویا کہ راقم سطور نے شریعت پر ڈاکہ ڈال دیا ہو۔ معترض اگر صحیح معنی
میں عالم یا محقق ہوتے یا انہیں علم و تحقیق سے ادنیٰ درجے کا بھی مس ہوتا اور مذکورۂ بالا اشاراتی
حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرتے تو حقائق
و معارف کا ایک انبار اُن کے سامنے آجاتا۔ مگر وہ اندھے جوش اور تعصب کے چکر میں آگئے اور
ناحق پر سر باندھ کر اپنی رسوائی کا سامان خود جمع کر لیا۔ معترض اگر کچھ نہیں تو اُوپر پیش کردہ

---

[۵۲] اسلام میں زکاۃ کا نظام، از راقم سطور، ص ۲۲ - ۲۴، فرقانیہ اکیڈمی بنگلور

صرف سورۂ توبہ کی آیت ہی پر غور کر لیتے تو انہیں علمی جہاد کے انکار کی گنجائش بالکل نہ رہ جاتی۔ (اگرچہ سورۂ فرقان والی آیت بھی اس سلسلے میں قطعی حجت ہے)۔ اور یہ پوری آیت اس طرح ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ : اے نبی تم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، جو بُری جگہ ہے۔ (توبہ: ۷۳، تحریم: ۹)

یہ آیتِ کریمہ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن میں سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم میں دو جگہ آئی ہے۔ اور اس موقع پر دو باتیں قابلِ غور ہیں: (۱) یہ آیت مدنی ہے، جب کہ جہاد (عسکری) کا اعلان ہو چکا تھا۔ (۲) مسلمانوں کو منافقین سے سابقہ مدینہ جا کر ہی پڑا، ورنہ مکّہ میں منافقین کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تو ایسی حالت میں چند سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں کہ کُفّار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اور پھر جہادِ عسکری کرنے کے بعد سختی کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اگر یہاں عسکری جہاد مُراد ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین سے کبھی جہاد (قتال) کیا تھا یا کسی منافق کی گردن ماری تھی؟ کیا حدیث اور تاریخ سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک موقع پر بھی ایسا کیا ہو؟ حالانکہ خود قرآن سے ثابت ہے کہ ہادیٔ برحق (صلعم) اتنے شفیق اور مہربان تھے کہ باوجود منافقین کے بارے میں خدائے تعالیٰ کی سختی کے آپ بار بار اُن کے لئے دُعائے خیر ہی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی سورۂ توبہ میں مذکورۂ بالا آیت کے بعد تھوڑے ہی فاصلے پر مذکور ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۚ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ : تو ان کے لئے بخشش مانگ یا نہ مانگ، اگر تو ان کے لئے ستّر مرتبہ بھی بخشش کی دُعا کرے گا تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ (توبہ: ۸۰)

تو اب سوال یہ ہے کہ کیا آقائے نامدار (صلعم) نے منافقین کے ساتھ جہادِ عسکری نہ کر کے

معاذ اللہ خداوندِ کریم کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی؟ معترض کو اپنی علامیت پر بڑا ناز اور غرّہ ہے۔ تو اب ذرا وہ اپنے "عسکری جہاد" والے نقطۂ نظر سے اس آیت کی تفسیر کر کے اپنے نظریہ کو درست ثابت کریں یا پھر توبہ و استغفار کرتے ہوئے اپنی بقیہ زندگی کسی گوشۂ عافیت میں گزار دیں۔ ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا جاتا ہے:

سخن فہمی عالم بالا معلوم شد

واقعہ یہ ہے کہ جن علماء و فقہاء نے فی سبیل اللہ سے صرف جہادِ عسکری (غزوہ و قتال) مراد لیا ہے انہیں اس آیت کو سمجھنے میں سخت دشواری پیش آئی ہے۔ جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ قاضی ابن العربی مالکیؒ (صاحب احکام القرآن) کے شش و پنج سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس سلسلے میں تقریباً تمام قدیم تفسیروں کا یہی حال ہے، جنہوں نے اس کی عجیب و غریب تاویلیں کی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر قدیم مفسرین کے فہم و دانش کو حرفِ آخر قرار دے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں تفکر و تدبر کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ لہٰذا اس سلسلے میں قدیم مفسرین یا جمہور کی دہائی دے کر بلا وجہ شور و غل مچانا ایک بازاری طریقہ اور علمی اعتبار سے ایک گھٹیا حرکت ہے۔

امام رازی کی بہتر تفسیر

بہر حال میرے محدود مطالعہ کی رو سے ہمارے مفسّرین و مفکّرین میں سوائے امام رازیؒ اور امام ابن قیّمؒ کے کسی نے بھی اس آیتِ کریمہ کی صحیح تفسیر نہیں کی۔ چنانچہ امام رازی کی تحقیق کا ماحصل یہ ہے:

۱۔ یہ آیت منافقین کے ساتھ جہاد پر دلالت کر رہی ہے جو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ منافق وہ ہے جو اپنے کفر کو دل میں چھپائے ہوئے ہو اور زبان سے اس کا انکار کر رہا ہو۔ لہٰذا اس کے ساتھ قتال کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ اس سلسلے میں چند اقوال مروی ہیں، جن میں سے ایک ضحّاک کا قول یہ ہے کہ جہاد

کفار کے ساتھ کیا جائے اور منافقین کے ساتھ سختی کی جائے۔ مگر یہ بات بعید ہے۔ کیونکہ ارشادِ الٰہی "جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ" (کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو) کا تقاضا ہے کہ ان دونوں طبقوں کے ساتھ جہاد بیک وقت کیا جائے۔ نیز اسی طرح "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" (ان دونوں طبقوں پر سختی کرو) کا اطلاق بھی دونوں پر ضروری ہے[۵۳]

۳۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ ظاہر کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ "ہم ظاہر کے مطابق فیصلہ کریں گے"۔ اور لوگ (منافقین) چونکہ اسلام کا اظہار اور کفر کا انکار کرتے تھے، اس لئے اُن کے ساتھ جنگ کرنا جائز نہیں تھا۔

۴۔ اور اس سلسلے میں تیسرا قول یہ ہے جو صحیح ہے کہ جہاد وسعت و طاقت خرچ کرنے کا نام ہے (بذل الجهد) اور اس لفظ میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو جہاد بالسیف (تلوار کے ذریعہ جہاد) یا جہاد باللسان (زبان کے ذریعہ جہاد) یا کسی اور (مخصوص) طریقے پر دلالت کرتی ہو۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت دونوں فریقوں کے ساتھ وُجوبِ جہاد پر دلالت کرتی ہے۔ مگر اس مجاہدہ کی کیفیت کیا ہو؟ تو یہ آیت اس مسئلے میں خاموش ہے۔ بلکہ یہ بات کسی دوسری دلیل سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اب ہم کہتے ہیں کہ الگ الگ دلائل کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار کے ساتھ مجاہدہ تلوار کے ذریعہ کرنا واجب ہے۔ اور منافقین کے ساتھ کبھی دلیل و حُجت کے ذریعہ، کبھی نرمی سے اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ کر کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ اس سلسلے میں ایک قول (جو حسن بصریؒ سے منقول ہے) یہ بھی ہے کہ منافقین کے

---

[۵۳] واضح رہے لفظ "عَلَيْهِمْ" کی ضمیر (هم) کافروں اور منافقوں دونوں کی طرف یکساں طور پر لوٹ رہی ہے۔ لہٰذا جہاد کے بعد اس قسم کی سختی جہاد بالسیف کی واضح طور پر نفی ہے۔

ساتھ جہاد کرنے کا مطلب اُن پر "حُدود" (یعنی شرعی حدیں) قائم کرنا ہے۔ مگر قاضی کا قول ہے کہ یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ حد جاری کرنا ہر اُس شخص پر بھی واجب ہے جو منافق نہ ہو۔ لہٰذا اس کا تعلق "نفاق" سے نہیں ہو سکتا۔ [۵۴]

دیکھا آپ نے یہ آیت مدنی ہونے کے باوجود جہاد کی نوعیت کے بارے میں کس طرح خاموش ہے! اور ہمارے مفسرین اس آیت کی تفسیر میں کس قدر حیران و پریشان ہیں!! تو اب مکی آیتوں کے بارے میں کس طرح دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان سے بھی قولی و لسانی جہاد مراد لینا صحیح نہیں ہے بلکہ جہاد کا واحد مطلب ہی جہادِ عسکری ہے؟ ورنہ پھر شریعت میں رخنہ و شگاف پیدا ہو جائے گا۔

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ !!!

ظاہر ہے کہ اس قسم کا بے سروپا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو قرآن حکیم کی ابجد سے بھی واقف نہ ہو۔ مگر پھر بھی ایسے لوگوں کو دین و شریعت کے بارے میں رائے زنی کرنے اور میدانِ علم میں کود کر دوسروں کو دعوتِ مُبارزت دینے کا بڑا شوق رہتا ہے۔

ابنِ قیّم کی فکر انگیز تفسیر

ذرا دیکھئے تو سہی ایک ہی آیت اور ایک ہی لفظ سے دو مختلف احکام کس طرح نکل رہے ہیں! مگر اس میں پھر بھی کچھ گرہیں باقی ہیں جو امام ابنِ قیّمؒ کی تشریح و توضیح سے پوری طرح کھل جاتی ہیں۔ چنانچہ علامہ موصوف تحریر کرتے ہیں:

اللہ نے رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بعثت کے ساتھ ہی (یعنی مکی زندگی کے روزِ اوّل ہی سے) جہاد کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا: اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والے (یعنی پیغمبر) کو بھیج دیتے۔ (لیکن ہم نے ایسا نہ کر کے ایک ایسا کلام نازل کیا جو تمام علوم و معارف کا جامع ہے)۔ لہٰذا تو

---

[۵۴] تفسیر کبیر، از امام رازی (م ۶۰۶ھ) ۱۶/۱۳۴ - ۱۳۵، مطبوعہ طہران

کافروں کی بات (کسی بھی فکری و تہذیبی معاملے میں) مت مان۔ بلکہ اس (قرآن) کے ذریعہ (یعنی اُس کے حقائق و معارف کے ذریعہ) کافروں سے زور دار طریقے سے جہاد کر۔ (فرقان: ۵۱-۵۲)

یہ مکی سورت ہے جس میں کافروں کے ساتھ حجت و بیان اور تبلیغ قرآن کے ذریعہ جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح منافقین کے ساتھ جہاد کا بھی حال ہے، جو دلیل و حجت پہنچانے کا نام ہے۔ کیونکہ وہ اسلام کے غلبہ کے تحت رہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: اے نبی تم کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ (توبہ: ۷۳)

تو منافقین کا جہاد کفار کے جہاد سے زیادہ مشکل ہے۔ اور وہ اُمت کے خواص اور انبیاء کے وارثین کا جہاد ہے۔ اور دُنیا میں اس کو قائم کرنے والے، اس میں شرکت کرنے والے اور اس میں تعاون کرنے والے چند ہی افراد ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایسے لوگ تعداد کے لحاظ سے تھوڑے ہوں مگر وہ اللہ کے نزدیک عظیم مرتبے والے ہوں گے۔

علامہ موصوف کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

وأمره الله تعالىٰ بالجهاد من حين بعثه، وقال: (وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيرًا۔ فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا۔) فهذه سورة مكية، أمر فيها بجهاد الكفار، بالحجة والبيان وتبليغ القرآن۔ وكذلك جهاد المنافقين، انما هو بتبليغ الحجّة، وإلَّا فهم تحت قهر أهل الاسلام۔ قال تعالىٰ: (يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ) فجهاد المنافقين أصعبُ من جهاد الكفّار۔ وهُو جهاد خواص الأمّة وورثة الرسل۔ والقائمونَ به أفرادٌ في العالم۔ والمُشاركونَ فيه والمُعاونونَ عليه وإن كانوا هم الأقلّينَ عدداً، فَهُم الأعظمونَ عند الله قدراً۔[۵۵]

---

[۵۵] زاد المعاد (تحقیق شعیب الأرنؤوط) ۳/۵، مؤسسة الرسالة بیروت، دسواں ایڈیشن ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء

(جاری)

"گلریز"

ڈاکٹر صفیہ جاریہ انیس، ریسرچ ایسوشیئیٹ شعبۂ فارسی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

گلریز ضیاء الدین بخشی بدایونی کی تصنیف ہے جو نظم و نثر دونوں میں لکھی گئی ہے اور اس میں عجب ملک اور نوشلب کے عشق کی داستان کو ادبی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔[1] اس پر عرفانی اور متصوفانہ رنگ غالب ہے بلکہ یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ طریقت کے راستے میں سالک کو جن منازل سے گزرنا پڑتا ہے اور گوہر مراد حاصل کرنے کے لئے جن مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے عشقیہ داستان کے در پردہ ان تمام دشوار منازل اور سالک کی پریشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب طرز تحریر شیریں و رواں اور عبارت مسجّع و مقفّیٰ ہے مصنف نے درمیان میں قرآنی آیتوں، احادیث اور اقوال اولیاء اللہ کے اقتباسات سے کلام کو مؤثر و سحر انگیز اور خوبصورت

---

(۱) ذبیح اللہ صفا کا قول ہے کہ "گلریز" میں معصوم شاہ اور نوشابہ کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے جو غلط ہے ملاحظہ ہو "تاریخ ادبیات در ایران" ج ۳، بخش دوم، ص ۱۲۹۵۔ اسی طرح انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ میں یہ بتایا گیا ہے کہ "گلریز" میں معصوم شاہ اور نوشلب یا نوشابہ اور عجب ملک کی عشقیہ داستان پائی جاتی ہے، یہ بھی غلط ہے حقیقت تو یہ ہے کہ نوشابہ نام پوری داستان میں کہیں بھی مذکور نہیں۔

برمحل اشعار وقطعات سے عبارت کو مزین ومرصع بنادیا ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ بے شمار اخلاقی نکات اور پند ونصیحت کے مضامین دلنشین پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے یقیناً اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے زیر اہتمام ۱۹۱۲ء میں آغا محمد شیرازی اور مسٹر آر۔ ایف۔ آرزو کی سعی وکوششوں سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اور ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایڈیشن مکمل نہیں ہے اس لئے خود اس کتاب میں دو مقاموں پر نیچے حاشیہ میں "Error in the text" اور تین جگہوں پر "a Page or so missing" لکھا ہوا ہے۔ درحقیقت آغا محمد کاظم شیرازی نے اس کا واحد نسخہ ڈی سی فیلوٹ سے حاصل کرکے مطبوع کروایا تھا جس کی تفصیل انھوں نے 'مقدمہ' میں اس طرح دی ہے:

'this rare Ms. from which the Present edition is edited is the Property of colonel D. C Phillott to whose generosity for the Press. the Ms. is written in a beautiful naskh hand on Kashmiri hand-made brown Paper, contains ten finely-executed miniaturen. It is boun in an old embossed leather cover with the binder's name Ziya' uddin Pishawari, on the top. It measures 10" by 6 1/2" and contains four hundred and seven Pages. No date appears in the Ms. It appears to be about three hundred years old and is well Preserved. this is

Perhaps the only copy existing in India." (۱)

آغا محمد کاظم شیرازی نے مذکورہ مخطوطہ کی جو تفصیلات دی ہیں یا وہ جامع اور مکمل ہیں لیکن ان کا یہ خیال کہ ہندوستان میں یہ واحد نسخہ ہے غلط ہے اس لئے کہ گلریز کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی میں بھی موجود ہے۔ اسی کتاب کا ایک اور مخطوطہ قم (ایران) میں کتابخانہ آیۃ اللہ مرعشی نجفی میں محفوظ ہے (۲)۔ تیسرا مخطوطہ جس کا انڈیا آفس کیٹلاگ میں ذکر ہے کرم خوردہ ہے اس کی تفصیل اس طرح دی گئی ہے۔

"Gulriz:- A rare Persian romance by the same Diyai — Nakhshabi, styled, the rose... embroidered carpet and dealing with the love-story or fairy tale of Ajabmalik. It is... unfortunately defective at the beginning, No date worm eaten in several Pages Nastalik, size $8\frac{1}{2}$" by $4\frac{3}{4}$". (۳)

علی گڑھ اور قم کے مخطوطے مکمل ہیں۔ علی گڑھ کے مخطوطہ کا خط نستعلیق شکستہ ہے۔ اس میں ۱۵۲ر صفحات ہیں۔ صفحہ پر سطروں کی تعداد مختلف ہے کم سے کم ۱۷ر اور زیادہ سے زیادہ ۲۱ر سطریں تک ہیں۔ ناپ ۲۲ × ½۱۲ سینٹی میٹر ہے۔ قم کا مخطوطہ

---

(۱) "گلریز" از۔ آغا محمد کاظم شیرازی، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

(۲) "فہرست نسخہ ہای خطی کتابخانۂ عمومی" حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ نجفی مرعشی مدظلہ العالی (ایران۔ قم) جلد دھم۔ زیر نظر: سید محمود مرعشی نگارش سید احمد حسینی ۱۳۶۲ر شمسی ص ۱۳۱۔۱۳۲۔

(۳) India office lib. catalogue. Ethe. No. 2852.

خط نستعلیق میں ہے۔ اس میں ۱۲۲ صفحات ہیں ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں اور ناپ ۲۳×۱۴ سینٹی میٹر ہے۔

ان میں سے کسی میں بھی سال تصنیف مذکور نہیں ہے اور نہ ہی گلریز کے مطبوعہ نسخہ یا کسی تذکرہ سے کچھ پتہ چلتا ہے اس لئے صحیح سن کا تعین امر محال ہے۔ البتہ بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ ضیاء الدین نخشبی کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سر درج از سخن باید کشادن　　بنائی از سخن باید نہادن
بسی نشستم بکنج خانہ بے کار　　شدم زین خفتنم تعطیل بیدار
سخن دارم چو خاموشاں چہ نشینم　　چمن دارم چرا گل زو نچینم
بگوید ھر کہ گفتن می تواند　　ازاں بہتر کہ از گفتن بماند(۱)

ضیاء الدین نخشبی کی تاریخ وفات اخبار الاخیار میں ۷۵۱ھ درج ہے(۲) اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش ۶۷۰ھ کے بعد ہوئی ہوگی اس لئے کہ اپنی ایک تصنیف "جزویات وکلیات" میں اپنے بالوں کی سفیدی کا ذکر کیا ہے اور 'جزویات وکلیات' کا سن تصنیف ۷۳۰ھ ہے۔ (۳) لہٰذا اندازہ یہ ہے ان کی عمر غالباً ۷۰ سال سے تجاوز کر گئی ہوگی۔ 'گلریز' کی عبارت میں جو پختگی اور عالمانہ انداز ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی پختہ عمر انسان کی تخلیق ہے۔ عموماً ایک انسان کی پختہ عمر ۴۵ سال کے بعد سے تسلیم کی جاتی ہے۔ اس حساب سے 'گلریز' کا سال تصنیف ۷۲۰ھ کے حدود میں قرار دیا جا سکتا ہے۔

الغرض راقم نے جب گلریز کے مطبوعہ نسخہ کا موازنہ علی گڑھ کے قلمی نسخہ سے

---

(۱) "گلریز" از آغا محمد کاظم شیرازی مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ص۷۔
(۲) "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" از شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح ص ۱۱۱۔

کیا تو متعدد مقامات پر الفاظ اور جملوں کا فرق نظر آیا بعض مقامات پر دو تین صفحات مطبوعہ گلریز میں موجود نہیں۔ ابتدائی جملے بھی مختلف ہیں جیسے مطبوعہ گلریز میں اس طرح سے آغاز ہوتا ہے:

"محامد یکہ از ھر حامد بمنصۂ ظہور آیند ھمہ راجع بدوست لَاالٰہَ اِلَّاھُوَ وَاِلَیْہِ اُلْمَصِیْرُ وتجلیاتی کہ از خالق بعرصۂ شھود رسند بادوست لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وھو السَّمِیْعُ اُلبصیر سبحان من تفرد فی ذاتہ وتوحد فی صفاتہ مصوریکہ ذرہ ذرہ برالوھیت او شاھد ھُوَ اللّٰہُ اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الاسماءُ الحُسْنٰی داوریکہ ملکوت ارض وسما بمملکیت او شاھد وھو الذی لہٗ ملکُ السّمٰوات وَالْاَرض وما بینھما۔۔۔۔ الخ"

گلریز کے قلمی نسخے کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"حمد بی نھایت مر احدیرا کہ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ صفت جلال اوست ومدح بی نمایت صمدیرا کہ وَلَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ نعت کمال او سلطانی کہ مخلوقات شکر ذی الجلال وَھُوَ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا۔۔۔۔ الخ"

اسی طرح اس واقعہ کا ذکر جبکہ نوشلب مرغ کی صورت معصوم شاہ کے محل کے کنگرہ پر آکر بیٹھتی ہے، مطبوعہ نسخہ میں اس طور پر ہے:

"ناگاہ در اثنای آں طرب ونشاط وملاعبت وانبساط نظر معصوم شاہ بر کنگرۂ قصر افتاد، مرغی دید نشستہ کہ ھرگز دام ادوار مرغی چناں ندیدہ وہیچ وقت صیاد روزگار چناں نشنیدہ۔ ھرگاہ کہ چشم سوی قصر میکشاد، جمیع بام منوری شد ھر بار کہ بال و پر میکشادومی افشاند، جملہ کاخ وشھر معطر میگشت۔

قطع

چگویم وصف آں مرغ دلآویز　　ندیدہ بود ھرگز مثل آں مرغ
اگرچہ دام راصد چشم بیش است　　نباشد شکل او اندر جھان مرغ

معصوم شاہ بہ ھزار دل عاشق صورت او گشت وبہ ھزار جان وامق ھیئت درچمن ما شاید وجانوری بدین صورت در انجمن ما باید تا ھر لحظہ از ترنم او فرحتی گیریم و

هر لحظ از تبسم او بهجتی یا بیم ...... الخ"(۱)

علی گڑھ کے قلمی نسخے میں یہی عبارت اس طرح لکھی ہے:

ناگاه در اثنای این لهو و نشاط و ملاعبت و انبساط صوتی شنیدند ملیح و آوازی استماع کردند فصیح که می گفت ما اصابک من مصیبة قالوا انا لله و انا الیه راجعون۔ حاضران مجلس متعجب ماندند و غلغل منر امیر خاموش گشت متحیر و از نظر هر طرف کردند چه بینند که برکنگرهٔ قصر مرغی نشسته که دیده هرگز دام او از مرغی چنان ندیده و گوش صیاد روزگار جانوری چنان نشنیده، رنگ او چون لون بوقلمون و لون او چون اشعهٔ آفتاب هر ساعت دگرگون ؎

چگویم وصف آن مرغ دلآویز	نباشد مثل او اندر جهان مرغ
اگرچه دام را صد چشم پیش است	ندیده بود هرگز مثل آن مرغ

القصه معصومشاه به هزار دل عاشق صورت و ساز او شد و به هزار جان وامق هیئت و آواز او گشت، با حاضران آغاز کرد که مرغی بدین شکل و ساز و جانوری بدین فصاحت و آواز کسی دیده است و یا کسی شنیده، این مرغ پرنده نیست حور بهشتی و این جانور طیری نیست جنی است گلگشتی، اگر چنین حور چنان در صحبت ما باشد و چنین زیبامیان در انجمن ما بود، هر لحظ از ترنم او فرحتی گیریم و به هر لحظ از تبسم او بهجتی یا بیم ...... الخ"

اس طرح کے اختلافات متن میں متعدد مقامات پر موجود ہیں لیکن ان سب کی تصریح و توضیح اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں بہرحال کتاب کی علمی و ادبی اہمیت کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف مخطوطوں کے باہمی موازنہ و مقابلہ اور اختلافات متون کی نشاندہی کے بعد ایک نیا اور صحیح اڈیشن دوبارہ شائع کیا جائے تاکہ نہ صرف اختلاف نسخ کا بخوبی اندازہ ہوسکے بلکہ داستان واضح اور مکمل صورت میں صحیح طور پر نمایاں ہوسکے۔

---

(۱) "گلریز" از آغا محمد کاظم شیرازی ص ۱۲۔

اس داستان کے مطالعہ سے مصنف کی علمیت و اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وہ صرف ایک داستان نویس یا افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اُسے علم ہیئت، علم طب اور دیگر علوم سے بھی کافی واقفیت تھی۔ ایک مقام پر اجرام فلکی کا ذکر اس طرح کیا ہے :

" قصہ بیاری زبان تقریر نتواں کرد و بدستکاری قلم تحریر نتواں آورد کہ فلک بر حد اشہب جفا دوانیدہ است و طالع نحس مرا بدین روزگار نشانندہ، زحل کہ

مزارعۂ قریہ ہفتم است　　　ذبدہ نحس در روی روزگار

من گماشتہ مشتری کہ حاکم محکمۂ ششم است بی مخاصمت وگناہ و بی بینہ وگواہ مرا محبوس مجلس بلا داشتہ وموقوف عنا گردانیدہ بیت :

مشتری گرچہ ھست قاضی چرخ　　　ھیچ دل زو بدھر راضی نیست

با ھمہ کس ھمین کند خصمی　　　خصم خشنود گشت وقاضی نیست

و مریخ کہ تیغ زن فلک قلعۂ پنجم است خنجر بلا از قرابۂ عنا کشیدہ است و زہرۂ مرادات مرا صد جا دریدہ۔ بیت :

چشم گردون ندیدہ ھیچ گہی　　　یک جگر خستۂ نمونۂ من

تیغ مریخ آتشی دارد　　　کہ نسوزد مگر درونۂ من

آفتاب کہ روشن دان بام چہارم است ھیچ وقت روشنائی در زاویۂ مقاصد ما بر نمی کند و ہیچ گہ بروزن بام بیت الاحزان ما سر نمی آرد بیت :

ھر خانہ کہ تاریک کند تقدیرش　　　از پرتو آفتاب روشن بود

وزھرہ کہ خنیاگر پردہ سوم است خود را مخمور شبانہ ساختہ است و ساز طرب در گوشہ انداختہ بیت :

ھم ساقی عیش من در آمد از پای　　　ھم مطرب وقت من دف از دست انداختہ

وعطارد کہ دبیر دیوان دویم است ترکان بلاد برات داران عنا بر من گماشتہ و سال و

ماہ یک شتن من شال میدھد وگاہ بی گاہ بخون من پروانہ می نویسد۔ بیت :

مرا گمان کہ بیابم مگر نجات برات ‏ ‏ ‏ دبیر چرخ بخونم نبشت پروانہ

وماہ کہ پیک سریع السیر مملکت اولی ست نامھای تھدید ومثالھای وعید

درباب من می رساند بیت :

نزد من ارنامہ کش آسمان ‏ ‏ ‏ نامہ تھدید رسد ھرزمان"(۱)

عجب ملک جب نوشلب کے عشق میں مبتلا ہوا تو اس کے باپ نے ایک حاذق طبیب کو معالجہ کے لئے بھیجا۔ اس موقع پر جن الفاظ میں عجب ملک کی حالت لکھی ہے اس سے مصنف کی علم طب سے واقفیت کا برملا اظہار ہوتا ہے، جیسے :

"اورا رید معلولِ عللِ فراق ومجروحِ دشنۂ اشتیاق، مادۂ فساد ھجران مزاج معتدلِ اورا استحالت دادہ وخیالات عارضۂ حدثان حواس سالمۂ اورا تاراج گردانیدہ۔ از چھار قوتِ متخیلہ ومتفکرہ ومتوھمہ وحافظۂ اویکی برقرار نہ از خصم بحرانات فراق کہ آب شب برسام است سرسام روی بدان سوختہ آوردہ وقوت جاذبہ وماسکہ وھاضمہ ودافعۂ اورا بربادادہ نہ عقل پردماغ در دماغ کہ بھفت وقایہ محفوظ است، راہ می یافت ونہ خواب چشم بند کہ بر پنج ملک وبیست وچھار عضلہ مطلیست در چشم گذر می کند وچشم کہ بھفت طبقہ وسہ رطوبت کہ موافق است واز عصبات وعضلات وشریانات مرکب، از عبرات وافر ودموع متقاطر وزحمت بیعد ومشقت بیحد بتقاب آمدہ وبہ ناخنہ وطرفہ وضعف دیداری چناں مبتلا گشتہ کہ ضماد ونوشادر وچوب قراح وسرمۂ جواھر ھیچ گونہ موثر نمی آمد وبرنج نزول ماء وانتشار وغرب وظفرہ چناں گرفتار آمدہ کہ سفوف وتوتیا وشافہ احمر وشافہ اخضر ھیچ نوع فائدہ نمی داد۔"(۲)

پوری کتاب اعلیٰ ادبی ومعیاری انداز میں لکھی ہوئی ہے اور مسجع الفاظ وجملوں

---

(۱) "گلریز" از۔ آغا محمد کاظم شیرازی۔ صد ۸۷، ۸۸۔

(۲) "گلریز" از۔ آغا محمد کاظم شیرازی۔ صد ۱۳۱۔

سے مربوط ہے اگر کوئی اسے پڑھنا شروع کردے تو اس کی جادو بیانی سے مسحور ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتا اور جب تک کتاب تمام نہ کرلے ہاتھ سے نہیں رکھے گا۔

عجب ملک سے دریائی سفر کے دوران طوفان آگیا اس کا نقشہ اس انداز سے
کھینچا ہے:

"صرصر تند خیز در استھواء در آمدہ و خیل ریاح بر دریا تاختن کشید۔ بادی
بنجاست، بادی۔ چگونہ بادی! تند خیز۔ گرد انگیز۔ ھوا گرد۔ گیتی نورد۔ روندۂ بی جان
وجھندۂ بی روان، جان بران علم، دارندہ نسیم ارم، گرہ کشائی ھر جبین، وفراش
ھر انجمن۔ بر تندہ بی قرار و بہ رقص آرندۂ ھر اشجار۔ پیک تیزرو وسفیر سبک رو،
شحنۂ خزان ومرکب سلیمان۔ ورانندۂ کاروان سحاب، وزنجیرنہ پایھائی آب۔
ریانیدہ کلاہ لالہ۔ گدازندۂ نقرۂ لالہ۔ مرغ از رعایت اوطایر وذرہ از عنایت او دلیر۔
اسرافیل باعمہا وعزرائیل چراغہا۔ از صولت آن باد درونۂ دسیا چون دیگ روئین می
جوشید۔ وازہیبت آن کوہ کسوت۔ "تکون الجبال کالعھن المنفوش"
می پوشیدہ نقیبان قضا جیوش ھوارا درحرکت آوردند وچابک سواران ریاح باد
پایان خود را تاختن گرفتند۔ ھر بار موج آن چناں گنبد میکرد کہ بگنبد گردون میرسید
تا سقف مقرنس بی ستون میکشید۔ باد مخالف اعلام صورت برافراشت و
مھد کشتی را از دوش جمال آب برداشت۔ ابر بموافقت باد۔ تیغ برق از قراب
سحاب بکشید و آتش صاعقہ از کوزۂ ابر میدمید۔ گردن پیلان عماری بدوانید و رعد
دھل جنگی بجنبانید۔ ھوا سنگ ژالہ در منجنیق ابر نھادہ وفلک زمھریر دریچۂ
نکبت نکبا بکشادہ وزحل بمنظر اعلیٰ بدر یابی برآمد ومشتری ندای رخصت ۔
"اقتلوا المشرکین" در داد ومریخ خنجر خون آشام بکشند و آفتاب با سپر زرین
بیرسید وزھرہ ابیات عاشقانہ سرائیدن گرفت وعطارد دفتر خطبھا پران کرد۔
ماہ تاج سیمین خود را سوھان زد۔ فلک نیزۂ سماکِ رامح را بہ دست گرفت۔
پروین جمعیت خود را ترتیب کرد وشھاب کمندِ خود را تاب داد۔ آسمان کمانِ

قوسِ قزح زہ کرد و ابر تیر باران آغاز نہاد" (۱)

اس کتاب کی عبارتوں کے درمیان اخلاق اور پند و نصیحت کے مضامین نہایت دلکش پیرایہ میں جواہرات کی مانند جڑ دیے گئے ہیں۔ ایک مقام پر علم و ادب کی فضیلت اور اس کی برتری کی تعریف کرتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں:

"خود علم تاجیست مرصع، جز بر سر کبرای کرام نشاید و ادب رداجیست مکلل جز بر علماء عظام نزیبد کہ اَلْاَدَبُ اَشْرَفُ نَسَبٍ وَ اَفْضَلُ مُکْتَسَبٍ وَ اَجَلُّ مَالٍ وَ اَتَمُّ جَمَالٍ"۔ (۲)

ایک اور موقع پر حرص و طمع سے احتراز کی تلقین کرتے ہوئے بڑے ہی خوبصورت اور مؤثر انداز میں یوں لکھتے ہیں ؎

"طمع را تا توانی گرد کم گرد بسا سرکز طمع برباد رفتہ است

طمع را سہ حرف است وھر سہ از نقطہ خالی این چیست؟ نقطہ را نیز ننگ می آید کہ گرد طمع گردد ؎

بر خویش مدہ تو حرص را راہ کز حرص و طمع گدا شود شاہ" (۳)

کثرت کلام کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مؤسسان اساس بلاغت گوھر مَنْ کَثُرَ کَلَامُہٗ بھر زہ نسفتہ اند۔۔۔ مھندسان ھندسۂ بلاغت قول اِلْزَمِ الصَّمْتَ مَا اسْتَطَعْتَ فَاِنَّہٗ سَجِیَّۃُ الْاَنْبِیَاءِ بگزاف نگفتہ اند"۔ (۴)

متذکرہ بالا اقتباسات سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا پتہ چلتا ہے اسی

---

(۱) گلریز از آغا محمد کاظم شیرازی ص ۷۷-۷۸۔

(۲) " " " " چاپ کلکتہ ص ۱۱۔

(۳) ایضاً ص ۱۳۔

(۴) ایضاً ص ۲۵۔

لئے ضروری ہے کہ اسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر دوبارہ صحیح اور مکمل صورت میں اور معیاری خط میں طبع کرایا جائے اور اہل علم صاحبان کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اس کی اہمیت و افادیت کو سب تسلیم کریں، اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں اور صاحب تصنیف یعنی ضیاءالدین نخشبی بدایونی کی دعا اور خواہش اس طرح پوری ہو سکے:

"درو باید قبول عام باشد | میان نامھا شہ نام باشد
چنانش کن کہ مردم ھرکہ بیند | نخواہد یکدمی زو ھرچہ چیند
زسرتاپای ذوق آمیز باشد | سماعش اھتزاز انگیز باشد
اگرچہ عیب از وی نیست دور | زچشم عیب بینھان دار دستور
کجا باشد چنین نقش دل افروز | زھی نقشی کہ کلکم کرد امروز
مرا تا حشر با این نقش کار است | کہ از من درجھان خوش یادگار است
ھمین باید کہ این باشد سلامت | کہ نامم زندہ دارد تا قیامت"[۱]

(ختم شد)

(۱) "گلریز" چاپ کلکتہ ص۳–۲۔

والیٔ انبیر راجہ بھگوان داس
یا
بھگونت داس؟

(از۔ عبدالرؤف خاں ایم۔ اے، اُدئی کلاں، راجستھان)

آمیر (جے پور) کے کچھواہہ[1] راجگان معمولی حیثیت کے زمیندار تھے جس کی تاریخ بجائے تاریخی حقایق و شواہد کے محض تخمین و ظن اور قیاس آرائی پر مبنی ہے لیکن راجہ پرتھوی کچھواہہ (۱۵۰۳ء تا ۱۵۲۷ء) کے عہد سے آمیر کے راجاؤں کو نسبتاً اہمیت حاصل ہونا شروع ہوگئی تھی۔ پرتھوی راج جنگِ خانواہ (کنواہہ یا کانوہ) ۱۵۲۷ء میں بابر کے بالمقابل رانا سانگا کا فریق تھا اور دادِ شجاعت دیتا ہوا زخموں کی تاب نہ لاکر مارا گیا۔ چنانچہ راجگانِ جے پور پرتھوی راج کو ہی اپنا مورثِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے اپنا شجرہ نسب اسی سے شروع

---

[1] ۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ کچھواہہ رام چندر کے بڑے کُش کی نسل سے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ مؤرخ اس لفظ کو کچھپ (سنگ پشت) گھٹ (جسم) کی بگڑی ہوئی صورت تسلیم کرتے ہیں یعنی کچھپ گھٹ ہی آگے چل کر کچھواہہ بن گیا لیکن گمان غالب ہے کہ کُش کی نسل سے ہونے کے سبب یہ کُشواہہ کہلائے اور یہی کُشواہہ عوامی لہجہ میں کچھواہہ ہوگیا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو راجستھان کا اتہاس، ص ۵۔۱۰۴، از ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما۔ طبع ۱۹۷۸ء۔

بہت ہیں۔ چندر محل اور البرٹ ہال (موجودہ جے پور میوزیم) کی دیواروں پر جو تصاویر بنائی گئی ہیں۔ اُن میں پہلی تصویر اسی پرتھوی راج کی ہے۔ کیونکہ اس خانوادہ میں یہی پہلا راجہ تھا جس کی حکومت وسعتِ رتبہ اور کسی حد تک سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر مستحکم ہو گئی تھی۔ راجہ پرتھوی راج کے نو رانیاں تھیں جن میں بیکانیر کے راؤ لونکرن کی راج کماری بالا بائی کے بطن سے بارہ اولاد ذکور اور سات راجکمار دیگر رانیوں سے تھے۔ اس طرح ان کے کل انیس راج کمار تھے[1]۔ ان میں سے پورن مل، بھیم سی (بھیم دیو) اور بھارمل آمیر کے راجہ ہوئے۔ پرتھوی راج کے انتقال (۱۵۲۷ء) کے بعد پورن مل آمیر کے تخت کا وارث ہوا۔ اس دوران میں مغل حکومت قدرے مستحکم ہو گئی تھی، بایں سبب پورن مل نے مغلوں سے روابط قائم کرنا چاہے اور یہی پہلا راجپوت زمیندار تھا جو مغل شہنشاہ ہمایوں کے دربار میں حاضر ہوا اور راجہ کے خطاب نیز ماہی مراتب[2] کے اعزازی نشان سے نوازا گیا۔

---

[1] ۔ دیکھئے موہتا نینسی ری کھیات، راجستھانی بھاکا میں بہت سے بادفروش (بادخواں بھاٹ) لوگوں کے ذریعہ مختلف کھیات یعنی شہرت نامے لکھے گئے۔ ان میں موہتا نینسی ری کھیات بہت مشہور ہے۔ جو تاریخی ماخذ کے علاوہ ادبی اہمیت کی حامل بھی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیے حوالا سابق ص ۱۴۳ تا ۱۴۷۔

[2] ۔ ماہی مراتب کی وضاحت میں جناب ہنیمان شرما رقمطراز ہیں کہ ایک دفعہ ایران کے بادشاہ . . . نوشیرواں کا نبیرہ خسرو تخت سے دستبردار کر دیا گیا تھا فوجی طاقت حاصل کر کے وہ دوبارہ تخت نشین ہوا تو اس دن ماہ برج حوت (ماہی) میں تھا جسے خسرو نے فال نیک سمجھ کر ماہی اور ماہ (چاند) کے ملے ہوئے نشان کو "ماہی مراتب" کے نام سے مشہور کیا۔ خسرو نے اس نشان کے نقرئی و طلائی عَلَم بنوا کر اپنے امرا کو دیے۔ بعد ازاں مغل بادشاہوں نے اس کی پیروی میں اپنے جاں نثار امراء کو ماہی مراتب کے نشان سے نوازنے کی ابتداء کی۔ دراصل ماہی مراتب وہ اعزازی نشان کہلاتے تھے جو بادشاہوں کی سواری کے آگے ہاتھیوں پر چلتے تھے۔ بہ اعتبار سیارگان ماہی کی سات شکلیں بہ تفصیل ذیل ہوا کرتی تھیں:

(۱) شکل آفتاب یعنی سورج کا نشان (۲) نشانِ پنجہ (۳) نشان میزان (۴) اژدہا پیکر (۵) سورج مکھی ۔

لیکن پورن مل کو ۱۵۳۳ء میں بجیم دیو شکست دیکر آمیر کے تخت پر قابض ہوگیا اور ۱۵۳۶ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رتن سنگھ تخت نشین ہوا جسے کچھ عرصہ بعد اس کے برادر خورد آسکرن نے زہر دے کر مروا دیا اور خود حکمراں بن بیٹھا۔ دریں اثنا بھارمل نے بہر وانوں کو اپنا طرفدار بنا کر آسکرن کو اہانت آمیز طریقہ سے تخت سے دستبردار کر دیا اور جون ۱۵۴۷ء میں خود آمیر کا حکمراں بن گیا۔ آسکرن بادشاہِ وقت اسلام شاہ سور (۱۵۴۵ء - ۱۵۵۳ء) کی خدمت میں بغرض داد خواہی حاضر ہوا مگر بھارمل نے بھی جو کافی محتاط انسان تھا، گوپال (ناتھاوت) کو اپنا سفیر بنا کر اسلام شاہ سور کے دربار میں روانہ کیا۔ اسلام شاہ نے آسکرن کو بجائے آمیر کے نرور کا ٹھکانہ عطا کیا جہاں ۱۴۹۶ء تک آسکرن کی اولاد و احفاد قابض رہی۔ پرتھوی راج کے انتقال (۱۵۲۷ء) اور بھارمل تخت نشینی (۱۵۴۷ء) تک آمیر میں اس بیس سالہ مدت میں انتشار و خلفشار اور سازشوں کا دور دورہ رہا۔

۱۵۵۶ء میں اکبر کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد بھارمل نے دور اندیشی سے کام لیا اور حاجی خاں پٹھان کے خلاف نارنول کے مغل حاکم مجنوں خاں قاقشال کی مدد کی۔ اس صلہ میں اکبر نے بھارمل کو دربار میں بلوا کر خلعت فاخرہ، اسلحہ اور مرصع زیورات سے نوازا، اور ۱۵۶۲ء میں اپنی راج کماری ہیرا کنور کی شادی اکبر سے کرنے کے بعد، بھارمل مغل سلطنت کا امیر الامرا اور پانچہزاری منصبدار بنا دیا گیا۔ یہ شادی مغل راجپوت اتحاد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بھارمل کی وفات ۱۵۷۳ء میں فتحپور سیکری یا آگرہ میں ہوئی[1]۔ بھارمل کی رانی بدنا دیوی سے دو راج کمار پیدا ہوئے پہلا بھگونت داس اور دوسرا بھگوان داس۔ اسی اسمی مماثلت کے سبب راجستھان کے مشہور مورخ..

---

[1] بانکی داس ری کھیات (نروتم داس) نمبر ۱۳۱۴، ص ۱۴۴، ۱۴۶، لیکن کرشن دت باجپئی نے اپنی تصنیف "برج کا اتہاس" جلد دوم میں لکھا ہے کہ بھارمل نے اپنے آخری ایام متھرا میں بسر کیے جہاں وشرام گھاٹ پر جنوری ۱۵۷۳ء میں وہ فوت ہوا اور اس کی نعش کے ساتھ اس کی رانی بدنا دیوی بھی ستی ہوئی جس کی یادگار کے طور پر ۱۵۷۰ء میں جمنا کے کنارے راجہ بھگونت داس نے ... [illegible]

[illegible]

[illegible] بیرا پرادھا کو بھی خلجان کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ مان سنگھ بھگونت داس کا دوسرا چھوٹا، راجکمار تھا جسے آمیر کے راجہ بھگوان داس نے اپنا متبنّیٰ بنا لیا تھا[1]۔ اس سلسلہ میں [illegible] تھا کے مبتلاء خلجان ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اکثر عصری فارسی کتب تواریخ میں "بھگونت داس" کی بجائے "بھگوان داس" ہی لکھا ہوا ملتا ہے[2]۔ مگر علامی ابوالفضل اکبر نامہ میں بھگونت داس ہی لکھتے ہیں[3]۔ اور بھارمل کے انتقال کے بعد ہی بھگونت داس ماگھ سُدی ۶ سمبت ۱۶۳۰ معادل ۷ فروری [1573]ء کو آمیر کا راجہ ہوا۔ منشی دیوی پرساد اپنی تصنیف "آمیر کے راجہ" میں لکھتے ہیں کہ بھگونت داس کے ٹیکے (وہ قشقہ جو کسی راجہ کی پیشانی پر اُس کے اورنگ نشین ہوتے وقت لگایا جاتا ہے اور جسے راج تلک بھی کہتے ہیں) کا دستور فتحپور سیکری میں خود شہنشاہ اکبر نے کیا اور پانچ ہزاری منصب اور امیر الامراء کا درجہ بھی عنایت کیا۔ نیز بھگوان داس کو اسی وقت قصبہ لَوان (دناہن) کی جاگیر دی گئی۔ اس قصبہ کو جو جے پور اور دوسہ کے درمیان کہستانی سلسلہ میں واقع ہے، بھارمل نے ہی مینا (قوم) قوم کے اقتدار کو ختم کر کے ازسرِنو آباد کیا۔

آمیر کے کلیان جی کے مندر کے دروازہ کے کتبہ[4] کی عبارت نیز دیگر کتبات اور راجگانِ انیر (جے پور) کے شجرات کی بازیافت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ بھگوان داس فی الواقع بھگونت داس کا چھوٹا بھائی تھا جسے لَوان کی جاگیر عطا ہوئی تھی اس جاگیر پر . . . بھگوان داس کی اولاد، جو بانکا دت کہلاتی ہے، ایک عرصہ تک قابض و متصرف رہی۔ آمیر کا

---

[1] ۔ راجپوتانہ کا اتہاس ۳: ۴۸۰، نیز مقالہ کچھواہوں کے اتہاس میں ایک الجھن مشمولہ مادھری بابت اساڑھ سمبت ۱۹۷۳/۱۹۱۶ء۔ [2] طبقاتِ اکبری ایسٹ وڈاوسن ۵: ۲۷۳ نیز صفحات مابعد، منتخب (لوئی) ۲: ۱۴۴، ۲۳۳۔ فرشتہ برگز ۲: ۲۳۶ و مابعد نیز فرشتہ اردو ترجمہ عبدالحی خواجہ ایم۔ اے ۱: ۶۹۶، ۷۲۰۔ ۷۲۱، ۷۴۴۔ [3] ۔ اکبر نامہ (بیورج) ۲: ۱۳ ۔
[4] ۔ اس کتبہ کو راجستھان کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے افسر آثاریات جناب وجے کمار صاحب نے تلاش کیا۔ ۱۲

لیکن پورن مل کو ۱۵۳۳ء میں بھیم دیو شکست دیکر آمیر کے تخت پر قابض ہو گیا اور ۱۵۳۷ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رتن سنگھ تخت نشین ہوا جسے کچھ عرصہ بعد اس کے برادر خورد آسکرن نے زہر دے کر مروا دیا اور خود حکمراں بن بیٹھا۔ دریں اثنا بھارمل نے سرداروں کو اپنا طرفدار بنا کر آسکرن کو اہانت آمیز طریقے سے تخت سے دستبردار کر دیا اور جون ۱۵۴۷ء میں خود آمیر کا حکمراں بن گیا۔ آسکرن بادشاہِ وقت اسلام شاہ سور (۱۵۴۵ء - ۱۵۵۳ء) کی خدمت میں بغرض دادخواہی حاضر ہوا مگر بھارمل نے بھی جو کافی محتاط انسان تھا گوپال نامی معتمد کو اپنا سفیر بنا کر اسلام شاہ سور کے دربار میں روانہ کیا۔ اسلام شاہ نے آسکرن کو بجائے آمیر کے نرور کا ٹھکانہ عطا کیا جہاں ۱۶۹۶ء تک آسکرن کی اولاد و احفاد قابض رہی۔ پرتھوی راج کے انتقال (۱۵۲۷ء) اور بھارمل تخت نشینی (۱۵۴۷ء) تک آمیر میں اس بیس سالہ مدت میں انتشار و خلفشار اور سازشوں کا دور دورہ رہا۔

۱۵۵۶ء میں اکبر کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد بھارمل نے دور اندیشی سے کام لیا اور حاجی خاں پٹھان کے خلاف نارنول کے مغل حاکم مجنوں خاں قاقشال کی مدد کی۔ اس حملہ میں اکبر نے بھارمل کو دربار میں بلوا کر خلعت فاخرہ، اسلحہ اور مرصع زیورات سے نوازا، اور ۱۵۶۲ء میں اپنی راج کماری ہیرا کنور کی شادی اکبر سے کرنے کے بعد، بھارمل مغل سلطنت کا امیر الامرا اور پانچہزاری منصبدار بنا دیا گیا۔ یہ شادی مغل راجپوت اتحاد میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بھارمل کی وفات ۱۵۷۳ء میں فتحپور سیکری یا اگرہ میں ہوئی[1]۔ بھارمل کی رانی بدنا دیوی سے دو راج کمار پیدا ہوئے۔ پہلا بھگونت داس اور دوسرا بھگوان داس۔ اسی اسمی مماثلت کے سبب راجستھان کے مشہور مورخ..

---

[1] ۔ بانکی داس ری کھیات (نرو تم داس) نمبر ۱۴۱۳، ۱۴۱۶ ص ۱۲۴، لیکن کرشن دت باجپئی نے اپنی تصنیف "برج کا اتہاس" جلد دوم میں لکھا ہے کہ بھارمل نے اپنے آخری ایام متھرا میں بسر کیے جہاں وشرام گھاٹ پر جنوری ۱۵۷۳ء میں وہ فوت ہوا اور اس کی نعش کے ساتھ اس کی رانی بدنا دیوی بھی ستی ہوئی جس کی یادگار کے طور پر ۱۵۷۴ء میں جمنا کے کنارے راجہ بھگونت داس نے [illegible]

[illegible]

اور بھگونت سنگھ نیز اپنے دوسرے بھائی کو بھی خبطان کا سامنا کرنا پڑا تھا تو وہ مضطر ار رہا کہ مان سنگھ بھگونت داس کا دوسرا چھوٹا راجکمار تھا جسے آمیر کے راجہ بھگوان داس نے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا[1] اس سلسلہ میں دو افراد تھا کے مبتلاء خبطان ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اکثر عصری فارسی کتب تواریخ میں "بھگونت داس" کی بجائے "بھگوان داس" ہی لکھا ہوا ملتا ہے[2]۔ مگر علامی ابوالفضل اکبر نامہ میں بھگونت داس ہی لکھتے ہیں[3]۔ اور بھارمل کے انتقال کے بعد ہی بھگونت داس ماگھ سُدی ۶ سمبت ۱۶۳۰ معادل ۷ فروری ۱۵۷۳ء کو آمیر کا راجہ ہوا۔ منشی دیوی پرساد اپنی تصنیف "آمبیر کے راجہ" میں لکھتے ہیں کہ بھگونت داس کے ٹیکے (وہ قشقہ جو کسی راجہ کی پیشانی پر اُس کے اورنگ نشین ہوتے وقت لگایا جاتا ہے اور جسے راج تلک بھی کہتے ہیں) کا دستور فتحپور سیکری میں خود شہنشاہ اکبر نے کیا اور پانچہزاری منصب اور امیر الامراء کا درجہ بھی عنایت کیا۔ نیز بھگوان داس کو اسی وقت قصبہ لَوان (دناہن) کی جاگیر دی گئی۔ اس قصبہ کو جو جے پور اور دوسہ کے درمیان کہستانی سلسلہ میں واقع ہے، بھارمل نے ہی مینا قوم کے اقتدار کو ختم کر کے از سرِ نو آباد کیا۔

آمیر کے کلیان جی کے مندر کے دروازہ کے کتبہ[4] کی عبارت نیز دیگر کتبات اور راجگانِ انبیر (جے پور) کے شجرات کی بازیافت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ بھگوان داس فی الواقع بھگونت داس کا چھوٹا بھائی تھا جسے لوان کی جاگیر عطا ہوئی تھی اس جاگیر پر . . . بھگوان داس کی اولاد، جو بانکاوت کہلاتی ہے، ایک عرصہ تک قابض و متصرف رہی۔ آمیر کا

---

[1] - راجپوتانہ کا اتہاس ۳: ۲۸۷، نیز مقالہ کچھواہوں کے اتہاس میں ایک الجھن مشمولہ مادھری بابت اساڑھ سمبت ۱۹۷۳/۱۹۱۶ء۔ [2] طبقاتِ اکبری ایسٹ وڈ اوسن ۵: ۲۷۳، نیز صفحات مابعد۔ منتخب (لوئی) ۲: ۱۴۴، ۲۳۳۔ فرشتہ برگز ۲: ۲۳۶ و مابعد نیز فرشتہ اردو ترجمہ عبدالحیٔ خواجہ ایم۔ اے ۱: ۶۹۶، ۷۰۔۷۲۱، ۷۲۴۔ [3] - اکبر نامہ (بیورج) ۲: ۱۳۔

[4] - اس کتبہ کو راجستھان کے محکمہ آثارِ قدیمہ کے افسر آثاریات جناب وجے کمار صاحب نے تلاش کیا۔ ۱۲

[illegible]
میں تعمیر ہوا تھا) کی از سر نو مرمت اکبر کے عہد میں ہوئی تھی اس وقت یہ کتبہ نصب کیا
گیا تھا جس کا رسم الخط دیو ناگری اور زبان راجستھانی ہے جس میں [illegible] کی بجائے سین
کا بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً "پات ساہ" یعنی پادشاہ وغیرہ۔ اس کتبہ میں آمیر کے
عصری حکمراں کی حیثیت سے راجہ بھگونت داس ہی کا ذکر ہے نہ کہ بھگوان داس کا۔ اس
کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے :-

"संवत १६३१ वरषे मांगसीर बदो २ पातीसह श्री ....
अकबर राजी राजाधिराज श्री भगवन्त दास जी क राज
प्रोहीत श्री कान्हा जी प्रसाद मडाये सूत्र घार जगमाल ..
घेरासुत भगवती तीषताकतर ।"

کوی بھوشن اور مہاکوی موریہ مَل میشن نے بھی مان سنگھ کو بھگونت
داس ہی کا بیٹا بیان کرتے ہوئے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آمیر کی حکومت بھگونت
داس ہی کو وراثتہً حاصل ہوئی تھی جو اکبر کا برادرِ نسبتی یعنی سالا تھا۔ کوی بھوشن اپنی
تصنیف بھوشن بھارتی میں لکھتا ہے :-

अकबर पायो भगवंत के तनै सोमान बहुरि जगत सिंह
महा मरदाने सों, भषणत्यो पायो जहांगीर मानसिंह जू सों,
शाहि जहां पायो जय सिंह जग जाने सों। अब औरंगजेब
पायो रमा सिंह जू सों, औरा दिन-दिन पै है, कुरम के माने
सों, केते राजा राय मान पावै पातसाहन सों, पावे पातसाह
मान "मान" के घराने सों।।

سنہ - ص - ۲۵۱ -

[illegible]

[illegible] ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے :-

कुमार हुतो भगवंत के घरत मानअमि धान
अक्बर सालक होय हैं; बालक ब्याह विधान।

قلعہ جموارام گڑھ (جے پور) کے ایک کتبہ سے، جو جے پور میوزیم میں محفوظ ہے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ بھگونت داس اور بھگوان داس برادر اعیانی تھے اور بڑے ہونے کی وجہ سے آمیر کی گدی بھگونت داس کو حاصل ہوئی تھی نہ کہ بھگوان داس کو۔ جموارام گڑھ کے قلعہ سے دستیاب کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے :-

स्वसित श्रीमन नृपति विक्रमादित्य राज्यातीत संवत
१६६९ सालिवाहन शकातीत १५३४ फालुन शुक्ल पक्षे ५
रवि वासरे श्री मज्जहांगीर साहे राज्ये वर्तमाने श्री रघुवंश..
तिलक कछवाह कुलमण्डन श्री राजा पृथ्वी राज तत्पुत्र
श्री राजा भारहमल्ल तत्पुत्र श्री राजा भगवन्त दास तत्पुत्र
सकल नरेन्द्र चूड़ामणि प्रताप पराभूत समस्त शत्रुगण समस्त
पृथ्वी- विजय प्राप्त महा -यशो राशे विराज मान श्री महाराजा
धिराज मान सिंह नरेन्द्र कारितं रामगढ़ प्रकाराख्यं दुर्ग...
कूपाराम्निप- शोभितं तत्र परम पवित्र श्री पद्माकर पुरी
हित पुत्र श्री पुरोहित पीतांबरस्याधिकारे सिद्धं। तत्र कार्य...
नियुक शिल्पेन :।
एतद् देशीय निजामश्च ॥ अन्ये च तन्मतानुसारिण: ॥

ملاحظہ ہو دنش بھاسکر : ۲۲۳۴

[illegible] سے ظاہر ہے [illegible]

[illegible] ۱۶۰۳ء میں راجہ بھگونت داس کے راجکمار مہاراجہ دھیراج مان سنگھ
نے اپنے پروہت ہدماکر کے بیٹے پیتامبر کی نگرانی میں تعمیر کروایا[1]۔ تاریخ جے پور کے ماہر آنجہانی
پنڈت ہری نارائن شرما ودّیا بھوشن نے اپنے مقالہ "فرزند دولت مہاراجہ فسری مان سنگھ
اوّل" میں مان سنگھ کو بھگونت داس کا پہلا صحیح النسب (Legitimate child.)
راج کمار بتلایا ہے جس کی ولادت پوس بدی ۱۳ سمبت ۱۶۰۷ مطابق ۲۱ دسمبر بروز
اتوار ۱۵۵۰ء کو بھگونت داس کی پٹ رانی (پہلی مہارانی) بھاگوتی یا بھگوتی پنوار کے بطن
سے ہوئی جو مالپورہ کے پچاین پنوار کی راج کماری اور راآدھو کی پوتی تھی۔ اس رانی کے
مان سنگھ کے علاوہ مادھو سنگھ، سور سنگھ اور پرتاپ سنگھ یعنی چار لڑکے پیدا ہوئے
ان میں سے پرتاپ سنگھ کے بارے میں بہت کم معلومات فراہم ہوئی ہیں، وہ لاولد تھا اور
شاید نوعمری میں ہی فوت ہو گیا۔ اس رانی کے علاوہ بھگونت داس کے بارہ[12] دیگر۔۔
رانیاں اور خواص (کنیزیں) بھی تھیں۔

مذکورۃ الصدر چار راجکماروں کے ماسوا اس کے تین راجکمار اور دو راجکماریاں
دیگر رانیوں سے اور دو لڑکے ایک خواص سے تولد ہوئے۔ اس طرح بھگونت داس
کے کل نو لڑکے اور دو لڑکیاں متولد ہوئیں۔ ان میں مان سنگھ سب سے بڑا۔۔
راج کمار تھا۔ راجہ بھگونت داس کی راجکماریوں میں سے "مان کنور" کی شادی[2] ۱۵۸۴ء

1۔ آمیر کے نزدیک "بھگونت ساگر" نامی تالاب بھی بھگونت داس نے ہی تعمیر کروایا
تھا جو اُسی کے نام سے موسوم ہوا۔ 2۔ اس شادی کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ
ہو ہسٹری آف جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرساد ص ۲۴ و ۲۵۔ اس سلسلے میں مورخِ ہند علامہ شبلی نعمانی
متوفی ۱۹۱۴ء کی معرکتہ الآرا نظم معنون "شمیم انگیز ہاں عطرِ محبت کی" بھی قابل مطالعہ ہے جس کا پہلا
اور آخری شعر یہ ہے: قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی — کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
تمہیں ملے گی ساری داستاں میں یاد ہے اتنا — کہ عالمگیر [illegible]
[illegible] ہے۔

میں شہزادہ سلیم کے ساتھ کی گئی جو سلیم کی پہلی بیگم تھی۔ اس زمانہ میں راجہ بھگونت داس لاہور کا صوبیدار تھا۔ مان کنور کی وفات (۱۶۰۴ء) پر شاہزادہ سلیم نے چار دن بتیس[۲] پہر تک کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ شہزادی سلطان النساء بیگم (پ ۱۵۸۶ء) اور شہزادہ خسرو (پ ۱۵۸۷ء) اسی مان کنور کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ شہزادہ خسرو کی ولادت پر مان کنور (مان بائی) کو "شاہ بیگم" کا خطاب دیا گیا تھا۔[۱]

مذکورہ بالا دلائل نیز منشی دیوی پرساد کی تصنیف "شہنشاہ مہاراجہ مان سنگھ والئ آمیر کی سوانح عمری" مطبوعہ سمبت ۱۹۴۶، بارہٹ رام ناتھ رتنو کی "اتہاس راجستھان" مطبوعہ سمبت ۱۹۴۹، لوان ٹھکانے کی دستاویزات اور پروہت ہری نارائن شرما کی تصنیف اس سلسلہ میں اہم تاریخی مواد فراہم کرتی ہیں اور ان شواہد کی روشنی میں کسی تشکیک و ارتیاب کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ بھگونت داس مان سنگھ اول کا باپ اور بھگوان داس سنگھ مان سنگھ اول کا چچا تھا۔ جے پور راج گھرانے کے شجرات کی رو سے بھگوان داس کے تین لڑکے ــــ اکھے رام، ہر رام اور جوڑ سنگھ تھے۔ جب کہ بھگونت داس کے آٹھ یا[۲] نو لڑکے (۱) مان سنگھ۔ (۲) سور سنگھ[۳]۔ (۳) پرتاپ سنگھ۔ (۴) مادھو سنگھ[۴]۔ (۵) بھیم۔ (۶) کانہا یا کان جی۔ (۷) بلی رام یا بنمالی داس وغیرہ

---

[۱]۔ بینی پرساد، ص ۲۵ مطبوعہ سنہ ۱۹۴۰ء تیسرا ایڈیشن۔

[۲]۔ کچھواہہ بنساولی میں راول ہرناتھ سنگھ ڈونڈلود نے آٹھ اور موہتا نینسی نے اپنی کھیات میں نو اولادِ ذکور کا ذکر کیا ہے۔

[۳]۔ سور سنگھ کی خدمات کے لیے دیکھیے موہتا نینسی ری کھیات۔

[۴]۔ مادھو سنگھ کے کارہائے نمایاں کے لیے ملاحظہ ہو۔ "ہسٹری آف جے پور اسٹیٹ" از استادِ محترم ڈاکٹر متھرا لال شرما آنجہانی سابق صدر شعبۂ تاریخ دانشگاہ جے پور، لٹریری ہیری ٹیج آف دی رولرز آف آمیر اینڈ جے پور۔ از پنڈت گوپال نارائن بوہرا نیز موہتا نینسی ری کھیات۔

تھے۔ بھگونت داس کے انتقال (نومبر ۱۵۸۹ء) کے بعد راجہ مان سنگھ والی امیر ہوا۔ بھگونت داس اور بھگوان داس کی اسمی مماثلت کے اشتباہ کو رفع کرنے کے لئے اُن حضرات کو مزید پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ جن کو فارسی تاریخی مواد آسانی سے دستیاب ہوسکتا ہے۔ ۱۲۔

لہ۔ بھگونت داس اور بھگوان داس کی اسمی مماثلت کی نتیجہ خیز بحث کے لئے رجوع کیجئے "راجستھان کا اتہاس" ص ۵۹-۳۵۸، از ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما سابق صدر شعبۂ تاریخ دانشگاہ جیپور۔

(ختم شد)

برہان

جلد ۱۰۸	اگست و ستمبر ۱۹۹۱ء مطابق صفر المظفر، ربیع الاول ۱۴۱۲ھ سنہ ہجری	شمارہ ۲

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان، جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

جنگ آزادی کے دوران میں کسی ہندوستان کو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ آزادی کے بعد ہمارا ملک نت نئے مسائل سے دوچار ہوتا رہے گا۔ اور آزادی کے لیے جو مجاہدین اپنے خون کی آخری بوند تک قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت حاضر و کمربستہ رہے، آزادی ملنے کے بعد ان کے نام لیواؤں کو ڈھونڈنا پڑے گا۔ ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہے مگر ہم ہندوستانیوں میں سے دورِ غلامی میں دل و دماغ پر جو برے اثرات ڈیرہ جمائے ہوئے تھے وہ پورے طور پر ابھی تک ختم نہیں ہوئے ہیں۔ اور جب ہم اپنے ملک کی آزادی کا پینتالیسواں سالانہ جشن مناتے ہیں تو قدرتی طور پر اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہمارے دماغ میں چلبلی مچانے لگتے ہیں کہ کیا ہم نے آزادی حاصل کر کے صحیح معنوں میں جینا سیکھ لیا ہے؟۔ یا برعکس اس کے ہماری حالت حصولِ آزادی سے پہلے والی حالت سے بھی بدتر ہو چکی ہے؟۔ ہم میں قبل آزادی کرپشن، بدانتظامی، فرقہ پرستی کا جو کہیں اِکّا دُکّا نام و نشان پایا جاتا تھا وہ آزادی کے پُرفضا ماحول میں بجائے بالکل ہی ختم ہو جانے کے اس میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ ہر جگہ بدانتظامی، کرپشن، فرقہ پرستی و تعصب و تنگ نظری کا ایسا نظارہ دکھائی دے رہا ہے کہ جیسے کہ ان برائیوں کا اس ملک میں سیلاب سا آ گیا ہے۔

جس ملک میں دورِ غلامی میں حصولِ آزادی کے بعد ملک میں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہوں گی کا خواب دیکھا گیا تھا آج آزادی کے پینتالیسویں سال میں قدم رکھنے سے ذرا پہلے ۹۲-۱۹۹۱ء کا جو سالانہ بجٹ دسویں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں دودھ کی نہریں بہنا تو خام خیالی ہے ہی پینے کے لیے شیر خوار بچوں کو تھوڑا بہت دودھ ہی میسر ہو جائے تو غنیمت بہت غنیمت والی بات ہے ایک غریب کیا بلکہ اوسط درجہ کے آدمی تک کے لیے کس قدر مشکلات بھری پڑی ہیں، بے روزگاری دور کرنے کا کوئی مؤثر علاج نہیں سوجھ رہا ہے، مہنگائی کو باوجود ہر انتخاب کے دوران میں عوام سے کیے گئے وعدوں کے، دور کرنا تو کجا اس میں بڑھوتری ہی کی جا رہی ہے جس غریب آدمی کے لیے دو وقت پیٹ بھرنا بھی دوبھر ہو چکا ہے۔

پارلیمنٹ کے انتخابات کو ختم ہوئے دو ڈھائی مہینے ہی بیتے ہوں گے اس وقت ہر پارٹی نے اپنے اپنے مینوفیسٹو میں عوام سے مہنگائی ختم کرنے کے وعدے کیے تھے اور حکمران پارٹی نے تو سو دن کے اندر اندر مہنگائی ختم کرنے کا اپنے مینوفیسٹو میں پکا وعدہ کیا تھا مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔ الیکشن مینوفیسٹو کے وعدے تو الیکشن میں فتح یابی حاصل کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں ان کا حقیقت سے کیا واسطہ و تعلق۔؟ یہ بات ثابت کر دی ہے سال ۹۲-۱۹۹۱ء کے بجٹ نے۔

عوام جب کمر توڑ مہنگائی کا رونا روتے ہیں تو انھیں ملک کی خستہ مالی حالت کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ ملک پر غیر ملکی قرضوں کی جو بھرمار ہے اسے یاد دلایا جاتا ہے۔ اب تک ہندوستان پر ستر ارب ڈالر کا غیر ملکوں کا قرض ہے اسے چکانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور اس کے لیے مزید غیر ملکی قرض لینے کی اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں کبھی روپیہ کی وقعت کم کی جا رہی ہے تو کبھی ملک کا سونا غیر ملکی بینکوں میں گروی رکھا جا رہا ہے ایک دو نہیں تین تین بار، حکومتِ ہند کی طرف سے یہ سب کیا جا رہا ہے تو اس کی طرف سے اس کے لیے مجبوری بھی بتا دی جاتی ہے کہ حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ کسی بھی جماعت کی حکومت کے

لیے یہ سب کچھ کرنا ناگزیر تھا۔ مجبوری ولاچاری میں غریب عوام مہنگائی اور ناسازگار حالات کے بوجھ تلے روز بروز دبتا چلا جارہا ہے اور کسی کو اس کی طرف کوئی فکر ہی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی چارہ سازی ہی نظر آرہی ہے کہ غریب عوام کو اس بلائے ناگہانی سے نکال باہر کیا جاسکے۔ اس صورتِ حال کی موجودگی میں جشنِ آزادی میں حقیقی خوشی کی اسپرٹ کیسے میسّر ہوگی یہ ملک کے ہر بہی خواہ کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

پنجاب، کشمیر و آسام میں دہشت پسندوں کی غیر قانونی اور عوام و ملک دشمن سرگرمیاں ملک کے لیے تشویش و پریشانی کا موجب بنی ہوئی ہیں ہی اب صوبائی تعصب و تنگ نظری سے لیس واقعات ہم سب کے لیے مزید تشویش و پریشانی پیدا کرنے کے باعث بن رہے ہیں۔ کرناٹک اور تامل ناڈو آپس میں پانی کے مسئلے پر الجھ پڑے، لڑ پڑے۔ ان دونوں صوبوں کے درمیان میں کاویری ندی کے پانی پر جھگڑا ہے کرناٹک کو ایک کمیشن کے ذریعہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ تامل ناڈو کو ایک مقررہ مقدار میں پانی دے مگر اس نے اب اس پر یہ کہہ کر آنا کانی کردی کہ اس کے پاس اپنے لیے ہی کافی پانی نہیں ہے وہ تامل ناڈو کو کیا دے گا۔ ؟ اس کے وزیر اعلیٰ نے کمیشن کی بات ماننے کے لیے کرناٹک کی پابندی ضروری نہیں، کہہ کر کرناٹک کی صوبائی حکومت کا عندیہ ظاہر کردیا۔ اس پر تامل ناڈو کی خاتون وزیر اعلیٰ کماری جے للتا نے غصّہ دکھایا اور مرکزی حکومت کو خوب جلی کٹی سناڈالی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے پورے تامل ناڈو میں اس ناانصافی کے خلاف سرکاری بند کا اعلان کردیا۔ جواب میں کرناٹک کی حکومت نے بھی اپنے نظریہ کی حمایت کے لیے بند کا اعلان کردیا۔ اس سلسلے میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ کرناٹک میں کانگریس کی حکومت ہے تامل ناڈو میں کانگریس کی حمایت یافتہ حکومت اس کی معاون جماعت انا ڈی۔ ایم کے چلا رہی ہے۔ اور مرکز میں کانگریس کا اقتدار قائم ہے کانگریس کا جس کو دعویٰ ہے کہ اس کے نظریات تمام ملک کے لیے قابلِ قبول ہیں اس کے باوجود کرناٹک اور تامل ناڈو دونوں صوبائی حکومتیں پانی کے مسئلے پر آپس میں اس طرح ٹکرا رہی ہیں کہ دو ملکوں کے بیچ یہ تنازعہ کھڑا ہے۔ اس کا ایک دوسرا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ایک مرکزی وزیر

مسٹر رام مورتی نے غالباً تامل ناڈو کی صوبائی سرکار کے موقف کی حمایت میں مرکزی کابینہ ہی سے احتجاجاً استعفیٰ بھی دے دیا۔ جو صدر جمہوریہ نے وزیراعظم کی سفارش پر منظور بھی کر لیا ہے۔ اب تک بھارت و بنگلہ دیش یا پاکستان و ہندوستان کے درمیان میں پانی کے لین دین بٹھاؤ کے مسائل پیدا ہوتے رہے ہیں اور جنھیں ان ملکوں نے آپس میں بات چیت کے ذریعہ سلجھایا۔ لیکن ہندوستان کے اپنے دو صوبوں میں ہی آپس میں) پانی پر اس قدر ڈیڈلاک شدید جھگڑا' زبردست غصّہ دکھائی دے تو یہ انتہائی شرم کی بات ہے اور ہر ہندوستانی کو فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ آزادی کے حاصل ہوئے اتنا عرصہ بیت جانے پر بھی ہم میں "ہندوستانیت" کا فقدان ہے۔ تب کبھی بھارتیہ جنتا پارٹی' یا وشو ہندو پریشد و بجرنگ دل اور آر۔ ایس۔ ایس جیسی نام نہاد راشٹریہ وادی تنظیموں کو اس طرف دیکھنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟ مسجد کے انہدام پر مندر بنانے کے لیے تڑپ رہی حُب الوطنی کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی اور ہندوستان کی اقلیتوں سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ طلب کرنے والی یہ تنظیمیں ایسے موقع پر کہاں سو جاتی ہیں ان کا ضمیر کیوں نہیں جاگتا ایسے موقع پر، وہ کیوں نہیں آگے بڑھ کر کہتی کہ کرناٹک میں پانی بہنے یا تامل ناڈو میں، پانی جائے گا یا بہے گا تو ہندوستان ہی کی مٹی و سرزمین پر، اس میں لڑنے یا سر پھٹول کرنے کی کیا تک ہے۔ یہ ان نام نہاد راشٹر وادی تنظیموں کے ایسے موقعوں پر چُپی سے اس قسم کے سوالات ہر محب وطن ... ہندوستانی کے دماغ میں کروٹ پر کروٹ بدلتا رہتا ہے۔

اپنے ملک کی آزادی کی پینتالیسویں سالگرہ مناتے وقت ہمارے سامنے فرقہ پرستی، علاقائی تعصب و تنگ نظری، دہشت گردی، بے روزگاری' افلاس و مہنگائی جیسے مسائل اژدہے بنے کھڑے ہیں جس سے پریشان و فکر اعصاب کو مکڑے ہوئے ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کرپشن نے جس طرح اونچی چھلانگ لگا کر عدلیہ میں داخلہ لینے کے عام . زبانوں پر قصّوں نے ہماری نیند اڑادی ہے۔ سپریم کورٹ کے جج جسٹس راماسوامی .. پنجاب و ہریانہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کے خلاف عوام میں تو یہ چہ میگوئیاں

تھیں کہ انھوں نے اپنے اختیارات وعہدہ کا کافی ناجائز فائدہ اٹھایا، اب پارلیمنٹ میں بھی ان کے خلاف اس سلسلے میں معاملہ زیر غور ہے اور مدعا ہے کہ جسٹس راماسوامی کے داماد جو مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں، کے خلاف بھی مدراس ہائی کورٹ نے ایک درخواست منظور کرتے ہوئے سی۔بی۔آئی کو تحقیقات کرنے کا حکم دیا ہے۔

ذات پات، چھوا چھات، فرقہ پرستی وتنگ نظری، تعصب، مہنگائی وبے روزگاری سے ملک کی تصویر غیر ملکوں میں پہلے ہی تاریک تھی اور اب کرپشن کی لعنت اس حد تک بڑھ گئی ہے تو ہندوستان کے بارے میں غیر ممالک میں کیا خیال ونظریہ قائم کیا جارہا ہوگا اس کی ہلکی سی جھلک ذیل کی سطروں کو ملاحظہ کرکے دیکھیئے جو مسٹر ٹینو پسانی کے ایک مضمون مطبوعہ اسٹیٹسمین میں لندن کے باوقار ومشہور غیر سیاسی رسالہ "اکانومسٹ" (۱۱ مئی ۱۹۹۱ء) کے ایڈیٹوریل سے کچھ اقتباس لے کر پیش کیے گئے ہیں۔

"... دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ایک نہایت حقیر نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس کے عوام غریب ہیں۔ اس کے سیاستداں پیسہ سے خریدلئے جانے والے ہیں۔ اور اس میں جو خوبیاں ہیں ان کو بیکار کرکے رکھ دیا گیا ہے۔ ایشیاء کے ملکوں کی ترقی کی دوڑ میں ہندوستان "تھرڈ کلاس" جگہ پر ہے۔ بے شک یہ آگے بڑھ رہا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کی رگوں میں خون نہیں ہے اس ملک کو قدرت نے جانباز لوگ دیئے لیکن ان کا کوئی استعمال نہیں ہو رہا ہے چین کے مقابلہ میں زندہ رہنے کی اوسط کم ہے مرنے والے بچوں کی تعداد فلپینز کے مقابلہ میں دوگنا ہے تعلیم کی رفتار سری لنکا سے آدھی ہے اس کی ناکامیوں کی کوئی حد نہیں۔"

اسے پڑھ کر ہر ہندوستانی کا سر شرم سے زمین میں گڑھ جائیگا۔ خدا سے دعا ہے کہ ہندوستان کو وہ منحوس گھڑی کبھی دیکھنے کو نہ ملے جب وشو ہندو پریشد جیسی فرقہ پرست وفسطائی ذہنیت سے لیس تنظیموں کے ذریعہ مسجد کے انہدام پر مندر بنایا جائے۔ خدانخواستہ اگر ایسا شرمناک حادثہ رونما ہوگیا تو ملک اور بیرون ملک آزاد سیکولر ہندوستان کی کیا بدتر صورت ہوگی اسکے تصور ہی سے ہر محب وطن ہندوستانی کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگتی ہے اور اسکے دماغ میں انجانا سا خوف وارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کی آزادی کیلئے مرمٹنے والے، قربانی دینوالے اور ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنے والے مجاہدین ان ملک دشمنوں کو کبھی معاف نہ کرینگے جو ہندوستان میں فرقہ پرستی، تنگ نظری وتعصب علاقائی

زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں۔؟

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی۔ بنگلور ۵۷۔

(۴)

یہ تشریح و تفسیر حقائق و معارف سے بھرپور ہے، جس سے دین میں جہاد کی اصل حقیقت پوری طرح واشگاف ہو جاتی ہے اور ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اصل میں قرآنی حقائق و معارف کو اُجاگر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے مضامین اور اُس کی مختلف آیات میں غور و فکر کیا جائے اور مختلف آیات میں تطبیق دینے کی کوشش کی جائے۔ پھر تمام آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے استقرائی حیثیت سے ان کا مطالعہ کیا جائے۔ اور ان کی تشریح و تفسیر میں حدیثوں سے بھی مدد لی جائے۔ تب جاکر قرآنِ حکیم کے اسرار و عجائب منظرِ عام پر آتے ہیں۔ اور اس طرز مطالعہ سے ہر دور میں قرآنِ حکیم کے اسرار پر سے پردہ اُٹھتا ہے اور اُس کے نئے نئے جلوے سامنے آتے ہیں، خواہ وہ دین و شریعت سے متعلق ہوں یا نظام فطرت و تکوین سے متعلق۔ اسی بنا پر ایک حدیث میں کہا گیا ہے :

وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ : قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔[۵۶]

اسی بنا پر قرآنِ حکیم میں تفکر و تدبّر کی دعوت دی گئی ہے :

---

[۵۶] ترمذی ۱۷۲/۵، دارمی ۴۳۵/۲

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ : یہ ایک برکت والی کتاب ہے جسے ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور دانش مند (اس کے انوکھے مضامین کو دیکھ کر) متنبہ ہوسکیں۔ (ص : ۲۹)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا : کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا پھر اُن کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں ؟ (محمد : ۲۴)

اس آیتِ کریمہ کے ذریعہ مشرکینِ مکہ کو جھنجوڑا گیا تھا کہ وہ قرآنِ مجید کے انوکھے اور حیرت انگیز مضامین و مطالب پر غور کیوں نہیں کرتے ؟ مگر عبرت کی بات ہے کہ آج خود حاملینِ قرآن کا بھی یہی حال ہوگیا ہے جو فکر و نظر کو جھنجوڑنے والی اس انقلابی کتاب کو محض دعاؤں اور تعویذوں کی کتاب سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور اس سے زیادہ عبرتناک حقیقت یہ ہے کہ آج خود ہمارے علماء کی اکثریت اسے محض "کتابِ تلاوت" سمجھتی ہے اور اس کے معانی و مطالب اور اسرار و حقائق تک رسائی حاصل کرکے نئے مسائل کا حل نکالنے کو ایک کارِ عبث تصور کرتی ہے۔ جب ہمارے علماء ہی قرآن کو طاقوں میں سجائے ہوئے ہوں تو اب عوام سے کیا شکوہ ہوسکتا ہے ؟ جب خود نمک ہی سے اُس کی نمکینی زائل ہوجائے تو پھر لوگ نمکینی کس چیز سے حاصل کرسکیں گے ؟ ایک روایت میں آتا ہے کہ دو طبقے ایسے ہیں جن کے صلاح و فساد پر عوام کا صلاح و فساد موقوف ہے :

صِنْفَانِ مِنَ النَّاسِ اِذَا صَلَحَا صَلَحَ النَّاسُ، وَاِذَا فَسَدَا فَسَدَ النَّاسُ، اَلْعُلَمَاءُ وَالْاُمَرَاءُ : دو قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ درست ہوجائیں تو لوگ بھی درست ہوجائیں اور جب وہ بگڑ جائیں تو لوگ بھی بگڑ جائیں۔ ایک عُلماء اور دوسرے اُمراء[۵۷]

حاصل یہ کہ کسی موضوع سے متعلق تمام قرآنی آیات کا استقرائی حیثیت سے مطالعہ کئے بغیر محض کسی ایک یا دو مقامات کو دیکھ کر ایک استقرائی نتیجہ یا قاعدہ کلّیہ وضع کرلینا ایک غلط اور

---

۵۷ کنزالعمال ۱۱۰/۱۰

طل اُصول ہے. جس کا ارتکاب کوئی نیم ملا یا شعبدہ باز ہی کرسکتا ہے ۔ اور پھر کسی فقیہہ یا مُفتی کے
ول کو بنیاد بنا کر اسے قرآن اور حدیث پر تھوپنا اور اسے اُمت کا اجماعی فہم قرار دینا بھی بڑی
تنہ انگیزی ہے ۔ قرآن اور حدیث کے نصوص و احکام ابدی و سرمدی ہیں اور ان کی تصریحات ایک
شمۂ صافی کی طرح ہمیشہ رواں دواں رہنے والی ہیں ۔ جن سے قیامت تک اُمتِ مسلمہ برابر سیراب
ہوتی رہے گی ۔ لہٰذا قرآن اور حدیث کے دھارے کو روکنے کی کوشش کرنے والوں کو مُنہ کی کھانی
پڑے گی ۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ : بلکہ اُنہوں
نے اُس چیز کو جھٹلا دیا جسے وہ سمجھ ہی نہ سکے اور ابھی اس کی حقیقت اُن پر واضح نہیں
ہوئی ۔ (یونس : ۳۹)

علمی جہاد ایک پیمبرانہ عمل

مذکورۂ بالا بحث کے مطابق علامہ ابنِ قیمؒ نے جہاد کی حقیقت کے بارے میں جو
فکر انگیز باتیں تحریر کی ہیں اُس سے بے شمار حقائق منظرِ عام پر آتے ہیں، جن میں سے چند
یہ ہیں :

۱ ۔ جہاد کا حکم آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت کے روزِ اول ہی میں دے
دیا گیا تھا ۔ چونکہ عسکری جہاد مدنی زندگی میں فرض ہُوا ہے اس لئے مکّی زندگی میں جس جہاد کا
حکم دیا گیا تھا وہ علمی جہاد تھا نہ کہ عسکری جہاد ۔ اور یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ رسولِ عربی
نے مکی زندگی میں کبھی تلوار نہیں اُٹھائی ۔

۲ ۔ جہاد جب مکی زندگی ہی میں واجب ہو گیا تھا تو اب اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی
چارہ نہیں رہ جاتا کہ جہاد اصلاً قولی ولسانی (اور اس کی مناسبت سے علمی وقلمی) ہے ۔
اور بقول ابنِ قیم یہ حجت و بیان دلیل و استدلال کے ذریعہ قرآن کی تبلیغ کا نام ہے ۔ اب
ظاہر ہے کہ یہ چیز خواہ قولی ولسانی طور پر ظہور پذیر ہو یا علمی وقلمی اعتبار سے دونوں صورتوں میں

مقصود ایک ہی ہے۔

۳۔ منافقین کے ساتھ جہاد کرنے کی نوعیت بھی یہی ہے کہ وہ اصلاً دلیل و استدلال کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ اس طرح مذکورہٗ بالا دونوں آیتوں میں دراصل ایک ہی حکم دیا گیا ہے۔

۴۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ مدنی زندگی میں بھی دلیل و استدلال کے ذریعہ جہاد کا حکم منسوخ نہیں ہُوا بلکہ وہ برابر جاری رہا اور آج تک برابر جاری ہے۔

۵۔ اگر عسکری جہاد اصل ہوتا تو مدنی زندگی میں قتال فرض ہونے کے بعد "استدلالی جہاد" کو منسوخ ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر اس کی اہمیت کی وجہ سے نہ صرف وہ مکی زندگی کے روزِ اول ہی سے جاری ہے بلکہ آج تک بلا انقطاع برابر جاری ہے اور قیامت تک اسی طرح جاری رہے گا۔ اور حسبِ ذیل حدیث میں اسی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰهُ اِلٰی اَنْ یُقَاتِلَ آخِرُ اُمَّتِی الدَّجَّالَ ۔ لَا یُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ، وَالْاِیْمَانُ بِالْاَقْدَارِ : جہاد اُس وقت سے برابر جاری ہے جب سے کہ اللہ نے مجھے پیغمبر بنا کر (دنیا میں) بھیجا ہے یہاں تک کہ میری اُمت کا آخری فرد دجال سے دو دو ہاتھ نہ کرلے۔ اس (جہاد) کو کسی ظالم کا ظلم یا کسی عادل کا عدل مُہمل نہیں ٹھہرا سکتا۔ اور (لوگوں کا) ایمان (اُن کی اپنی اپنی) تقدیر کے مطابق ہوگا۔[۵۸]

۶۔ پچھلے صفحات کی تصریحات کی رُو سے امام جصاص رازیؒ کے بیان کے مُطابق عسکری جہاد کبھی کبھی (ضرورت کے وقت) فرض ہوتا ہے، جب کہ علمی جہاد کو ہمیشہ اور ہر دور میں جاری رہنا چاہیئے۔

۷۔ دلیل و استدلال کے ذریعہ جہاد (علمی جہاد) کرنے کی یہی وہ اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں دو دو جگہ (سورۂ توبہ اور تحریم میں) اسے بطور تاکید

---

۵۸ سنن ابو داؤد کتاب الجھاد ۳/۴۰، مطبوعہ حمص (شام)

ن کیا ہے۔ اگر اس کی اتنی اہمیت نہ ہوتی پھر نعوذ باللہ یہ ایک بیکار سی بات ہوتی۔ حالانکہ
رتعالیٰ کا کلام حکمت سے خالی نہیں ہے۔

۸۔ منافقین کا جہاد کفار کے جہاد سے زیادہ مشکل ہے۔ ابن قیم نے یہ ایک بصیرت افروز
: بیان کیا ہے۔ واضح رہے منافقین کا طبقہ صرف دورِ رسالت ہی میں نہیں بلکہ وہ ہر دور
موجود رہا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ چنانچہ اُمت کی صفوں میں ایسے بہت سے مارِ آستین موجود
جو بظاہر مسلمان نظر آتے ہیں۔ جب کہ اُن کے دلوں میں کفر بھرا ہوا ہے۔ اور وہ مختلف طریقوں سے
ں کا اظہار کرتے رہتے ہیں[۵۹] ایسے منافقین اُمت کے ساتھ علمی و استدلالی جنگ کرنا بھی ارشادِ
ں کے مطابق جہاد ہے۔

۹۔ جب اللہ تعالیٰ خود ہی بنفسِ نفیس یہ فتویٰ دے رہا ہے کہ کفار و منافقین کے ساتھ
ل و استدلال کے میدان میں جنگ کرنی چاہیئے اور انہیں علمی میدان میں پچھاڑنا چاہیئے تو پھر
پ ہی بتائیے کہ خدا کی بات کو غلط قرار دینے والوں کو کس نام سے یاد کیا جائے؟

۱۰۔ ابنِ قیم نے اس سلسلے میں سب سے بڑی جو حقیقت بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم
علمی و فکری جہاد کرنا انبیائے کرام کے وارثین اور خواصِ اُمت کا کام ہے۔ تمام انبیائے
رام نے دراصل اپنے اپنے دور کی فکری و نظریاتی گمراہیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور دورِ آدمؑ سے
کر رسالتِ محمدیؐ تک تمام پیغمبروں نے یہی فریضہ انجام دیا ہے۔ اور جہاد کی اصل نوعیت
حقیقت قرآن اور حدیث کی رُو سے یہی ہے۔

۱۱۔ اس قسم کا جہاد کرنے والے دُنیا میں چند مخصوص لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ ہر شخص

---

[۵۹] اس کی ایک واضح مثال شاہ بانو کیس کے موقع پر ہندستان میں بخوبی ظاہر ہو چکی ہے کہ ہمارے
رمیان کیسے کیسے ملت فروش افراد موجود رہتے ہیں جو وقت پڑنے پر ملت کا ساتھ چھوڑ کر مخالف صفوں میں
چلے جاتے ہیں اور ملت کی جڑوں کو کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اس قسم کے جہاد کا حامل نہیں بن سکتا۔ اور اس قسم کے اصل " مجاہدین " کا تعاون کرنے والے بھی بہت کم لوگ ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ جہاد کی یہ نوعیت عوام کے ذہنوں سے محو اور مستور ہو چکی ہے۔ لہٰذا اصل مُجاہدین کو نہ پہچاننے کے باعث وہ لوگ گوشۂ گمنامی میں رہ کر بے کسی اور کس مپرسی کے عالم سے گزرتے رہتے ہیں۔ ہاں البتہ اُن کی زندگیوں کے بعد اُن کے کارنامے منظرِ عام پر آکر تاریخ کا جزو بن جاتے ہیں۔ اصل میں یہ بات اُمت کی بے حسی کی ایک علامت ہے۔ اور اس قسم کی بے حسی کا نہ معلوم ہماری اُمت کے کتنے افراد شکار ہو چکے ہیں، جن کو تاریخ اپنے اوراق میں محفوظ نہیں رکھ سکی ہے!

۱۲۔ ایسے اصلی مجاہدین اگرچہ تعداد میں کم ہوں اور دُنیا والے اُن کی صحیح قدر و منزلت نہ پہچانتے ہوں، مگر اللہ کے نزدیک اُن کا مرتبہ یقیناً بہت بڑا ہے۔ کیونکہ ایسے خاصانِ حق اپنے دور کی نبض اور اُس کی رفتار کا اندازہ کر کے جس قسم کا علمی و استدلالی جہاد شروع کرتے ہیں وہ چونکہ ایک نئے طرزِ فکر کا حامل ہوتا ہے اس لئے قدیم طرزِ فکر رکھنے والے اُسے ایک " انوکھی " چیز قرار دے کر اُس پر " بدعت " ہی نہیں بلکہ " خلافِ شریعت " ہونے کا بھی فتویٰ لگا دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی ذرا تیز و تُند قسم کا " مولوی " ہو تو اسے " گمراہی " بلکہ " کُفر " قرار دینے سے بھی باز نہیں آتا۔ لہٰذا ایسی حالت میں مُجاہدینِ حق کو بیک وقت دو محاذوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک بیرونی محاذ اور دوسرا داخلی محاذ۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں مُجاہدین کی مشکلات دوچند ہو جاتی ہیں۔ مگر چونکہ اس قسم کی مشکلات سے تمام انبیائے کرام دوچار ہو چکے ہیں، لہٰذا یہ بھی انبیائے کرام کی سُنّت میں داخل ہے کہ جب کبھی کوئی مجاہد اُٹھتا ہے تو اُس کی راہ مارنے یا راہِ حق میں روڑے اٹکانے والے بہت سے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں، بیرونی صفوں میں بھی اور اندرونی صفوں میں بھی۔ جب کہ دوسری طرف بازاری قسم کے لوگوں کے پیچھے ایک بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ اور اہلِ حق مجاہدین اکثر و بیشتر کس مپرسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابنِ قیمؒ نے اپنے دور کے احوال و کوائف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ باتیں تحریر کی ہیں۔ اور یہ اپنی "آپ بیتی" بھی ہوسکتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ احوالِ واقعی ہیں جو ہر دور میں مجاہدین کے ساتھ پیش آسکتے ہیں۔ لہٰذا اس راہ میں مجاہدین کو ہمت ہارے بغیر عزم و استقلال کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ اور انہیں اپنے زورِ بازو کے بجائے خداوندِ قدوس ہی پر بھروسہ اور توکل کرکے اپنے کام میں جٹے رہنا ہوگا۔ اگر عزم صادق ہوگا تو پھر کامیابی و کامرانی بھی ضرور حاصل ہوکر رہے گی۔

اس بحث سے بخوبی ظاہر ہوگیا کہ قرآنی نقطۂ نظر سے جہاد کیا ہے اور اس کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ یہ قرآنِ کریم کے اسرار و حقائق ہیں جو تفکر و تدبر کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔ طوطے مینے کی طرح قرآن کو رٹ لینے والوں کو تو سوائے چند "اقوال" کے اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اور ایسے لوگ قرآن کو قرآن سے نہیں بلکہ چند اقوال کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ خود قرآن اپنے بارے میں کہتا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلاً: اور ہم نے یقیناً اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کی مثال پھیر پھیر کر (مختلف پیرایوں میں) بیان کر دی ہے (تاکہ لوگ انہیں بخوبی سمجھ لیں)۔ لیکن انسان بڑا جھگڑالو ہے (جو ان باتوں کو سمجھے بغیر اپنی کوتاہ فہمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔) (کہف: ۵۴)

اور بعض حدیثوں میں آتا ہے:

اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّيْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ ۔ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ۔ وَمَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ: رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث (روایت کرنے) سے بچو، سوائے

اُن حدیثوں کے جن کو تم جانتے ہو۔ جس نے مجھ پر جان بُوجھ کر جھوٹ بولا تو اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔
اور جس نے قرآن میں (مُجرّد) اپنی رائے سے کوئی بات کہی تو اُس کا ٹھکانہ بھی دوزخ ہے[۶۰]
مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن میں بغیر علم کے (محض اپنی رائے سے) کوئی بات کہی تو اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے[۶۱]

سب سے بڑا جہاد قرآن سے

ان مباحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کی نوعیت و کیفیت کیا ہے؟ اب اس سلسلے میں چند مُستند مفسرین کے اقوال بھی پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ بحث ہر طرح سے مکمل ہو جائے۔ چنانچہ جہاد قولی یا علمی کے سلسلے میں سورۂ فرقان والی آیت اصل اور بنیادی اہمیت کی حامل ہے، جو پچھلے صفحات میں کئی مقامات پر زیرِ بحث آچکی ہے۔ اور وہ یہ ہے:
وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْراً۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَاداً كَبِيْراً : اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ایک پیغمبر بھیج دیتے۔ سو آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے اور قرآن سے ان کا زور و شور سے مقابلہ کیجئے۔ (فرقان : ۵۱-۵۲)
اور اس سلسلے میں علامہ ابنِ جوزی کی یہ تفسیر بھی (ساتویں باب میں) گزر چکی ہے کہ اس سے مُراد جہادِ قولی ہے، جو خود قرآن کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔[۶۲]
اور یہی بات حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ اس میں (وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ کے ذریعہ) جو حکم دیا گیا ہے وہ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنا ہے۔

---

[۶۰] و [۶۱] ترمذی کتاب تفسیر القرآن ۱۹۹/۵ ۔
[۶۲] دیکھئے موصوف کی کتاب نزھۃ الأعین ۲۹/۱ نیز موصوف ہی کی تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر ۹۵/۶ مطبوعہ دمشق ۔

قال ابن عباس قوله فلا تطع الكافرين وجاهدهم به، قال بالقرآن[63]

بعض لوگوں نے یہاں پر جہاد بالسیف مراد لیا ہے۔ مگر یہ دو وجوہات کی بنا پر غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور جہاد مدینہ میں فرض ہوا تھا۔ لہٰذا یہ قول انتہائی بعید ہے، جیساکہ امام قرطبی اور امام رازی نے تصریح کی ہے[64] اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ جہاد بالسیف کی قطعی طور پر نفی ہے۔

قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو علمی دلائل و براہین، تنبیہات، پند و نصائح اور دینِ حق کی تکذیب کرنے والی قوموں کے احوال و کوائف وغیرہ ہیں بطورِ سبق آوری بیان کئے جائیں (اور انہیں انجام بد سے ڈرایا جائے)۔

أي بالقرآن بتلاوة ما فيه من البراهين والقوارع والزواجر والمواعظ و تذكير أحوال الأمم المكذبة۔[65]

اب رہا "جہادِ کبیر" یا بڑے جہاد سے کیا مراد ہے؟ تو مفسرین نے اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

لَا يُخَالِطُه فُتورٌ : جس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو[66]

تامّاً شَديداً : یہ جہاد مکمل اور شدید ہونا چاہئے[67]

جَامِعاً لِكُلِّ مُجاهدةٍ : وہ ہر قسم کے مجاہدہ کا حامل ہو[68]

---

[63] تفسیر ابنِ جریر : ۱۵/۱۹، دار المعرفہ بیروت، نیز دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۳/۳۲۱

[64] دیکھئے تفسیر قرطبی ۱۳/۵۸ اور تفسیر کبیر ۲۴/۱۰۰

[65] تفسیر روح المعانی : ۱۹/۳۲

[66] تفسیر قرطبی ۱۳/۵۸

[67] زاد المسیر فی علم التفسیر ۶/۹۵

[68] تفسیر کبیر ۲۴/۱۰۰

فانّ دعوۃ کلّ العالمین علی الوجہ المذکور جہادٌ کبیرٌ : اس سلسلے میں جو کچھ مذکور ہے اُس کے مُطابق سارے عالم کو دعوت دینا بہت بڑا جہاد ہے [۶۹]

اُوپر مذکور آیات کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے، جس سے اس حکم کی تاکید اور شدت کا پتہ چلتا ہے۔ جو مذکورہ بالا تفاسیر کے عین مطابق ہے۔ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اس آیت کی تفسیر کے لئے جو سرخی قائم کی ہے وہ یہ ہے : " جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہادِ کبیر ہے" اور پھر اس عنوان کے تحت تحریر کرتے ہیں :

" وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيرًا ، یہ آیت مکی ہے جب کہ احکام کفار سے قتال وجنگ کے، نازل نہیں ہُوئے تھے۔ اسی لئے یہاں جہاد کو بِهٖ کے ساتھ مقید کیا گیا۔ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ معنیٰ آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفِ اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد۔ قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلقِ خُدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے، خواہ زبان سے ہو یا قلم سے، یا دوسرے طریقوں سے۔ ان سب کو یہاں جہادِ کبیر فرمایا ہے"۔ [۷۰]

ان تفسیروں سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ اور یہ جہاد قولی یا علمی وقلمی جہاد کے سوا اور کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہ کسی مُتجدّد یا دین سے مُنحرف شخص کا قول یا کوئی "بدعت" یا نئی بات نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ سے لے کر مُفتی محمد شفیع تک تمام مفسّرین کا متفقہ قول ہے۔ لہٰذا اگر کچھ مفسرین نے اپنے دور کے لحاظ سے بعض دیگر "نصوص" کی رُو سے "جہادِ عسکری" کو اولیت دی تھی تو وہ ایک وقتی وعارضی بات تھی، دائمی وابدی نہیں۔ جہادِ عسکری کا حکم اگرچہ اب بھی موجود ہے اور وہ منسوخ نہیں ہُوا، لیکن

۶۹ے تفسیر ابوسعود ۶/۲۲۵

۷۰ے تفسیر معارف القرآن : ۶/۴۷۳

ابدی و دائمی نہیں ہے۔ کیونکہ اسے ہر ملک، ہر جگہ اور ہر وقت جاری رکھا نہیں جا سکتا۔ اس
برعکس علمی و قلمی جہاد اصل ہونے کی وجہ سے ابدی و دائمی ہے، جو خود قرآن ہی کی صراحت کے
ابق قرآن کے دلائل و براہین اور اُس کے طریقہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم
ینا نہ صرف جہاد کی حقیقت کا انکار ہے بلکہ معاذاللہ خود قرآنِ حکیم کا انکار ہے۔

آج مُسلمان قرآن کے اس سب سے بڑے حکم اور شرعی فریضے کو (جو نہ صرف جہادِ عسکری
مقدم ہے بلکہ وہ ملّتِ اسلامیہ کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہُوا ہے) پوری طرح فراموش
ئے ہُوئے ہیں۔ تو کیا یہ بات (ہماری ملت کے عوام تو بہت دُور کی بات ہے) خود ہمارے
اء اور ہمارے عربی مدرسوں کے لئے ایک حجت نہیں ہے؟ جہادِ عسکری تو پہلے ہی معطل
ہو چکا ہے تو کیا اب جہادِ علمی کو بھی معطل کر کے خُداوندِ قدوس کے اس حکم کی تکذیب کی جائے گی
اس راہ میں جدوجہد کرنے والوں کا مذاق اُڑایا جائے گا؟ یہ ہماری ملت کے لئے ایک لمحۂ
ریہ ہے۔ علامہ اقبال نے شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے فرمایا ہے ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ملاّ کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اد اور ہندستانی مُسلمان

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ زیرِ بحث آیات (فرقان ۵۱-۵۲)
سیاق و سباق بھی عقلی دلائلِ توحید سے گھرا ہُوا ہے، جو اس حقیقتِ واضحہ کا ایک اور مزید
رت ہے کہ قرآن کے ذریعہ جہاد دراصل "دلائلِ توحید" کے ذریعہ جہاد ہے، جو تمام اقوامِ
لم اور سارے جہان کے لئے بطورِ دلیل و حجت مذکور ہیں۔ اور سورۂ فرقان کا موضوع بھی
ص کر اثباتِ توحید اور تردیدِ شرک ہے، جس میں ایک منفرد اور طاقتور ترین اُسلوب میں توحید
حقیقت کو مختلف علمی و عقلی دلائل میں ثابت کر کے مشرکین کے شبہات و اعتراضات کا مُدلّل
ب دیا گیا ہے۔ اور اس سورہ کی ابتداء اس آیتِ کریمہ سے ہوتی ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا : وہ بڑی خوبیوں والا ہے جس نے اپنے بندے پر فُرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب) نازل کی، تاکہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کرسکے ۔ (فرقان : ۱)

قرآن چونکہ سلسلۂ صحفِ سماوی کی آخری کڑی ہے اس لئے اس آخری صحیفہ کو ہر قسم کے علمی و عقلی دلائل سے پوری طرح مزین و آراستہ کر دیا گیا ہے ۔ اور اسی وجہ سے اسے فرقان کہا گیا ہے ۔ جس کا مطلب ہے وہ چیز جو حق و باطل میں تمیز کرسکتی ہو ۔ اس طرح قرآن کی ایک پُوری سورت کو "فُرقان" کے نام سے موسوم کرکے دراصل حاملینِ قرآن کو اس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے ۔

بہرحال قرآن حکیم کے ان علمی و عقلی دلائل کی حقیقت موجودہ سائنٹفک دور میں اور بھی زیادہ کھُل کر سامنے آگئی ہے اور تحقیقاتِ جدیدہ کے ذریعہ اس کے نئے نئے اسرار و معارف سامنے آرہے ہیں جو علمی دنیا کو مبہوت و ششدر کئے ہُوئے ہیں ۔ اور ان حقائق و معارف کے ملاحظہ سے اب نوعِ انسانی قرآن کریم کی حقانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور نظر آرہی ہے ۔ اور وہ دن دُور نہیں کہ جب وہ انشاء اللہ پوری طرح اسلام کی گود میں آجائے گی ۔

اس اعتبار سے آج قرآنِ حکیم کے علمی و عقلی دلائل کے ذریعہ نوعِ انسانی کو قرآن سے قریب تر لانے کے جتنے مواقع موجود ہیں اتنے سابقہ کسی بھی دور میں نہیں تھے ۔ لیکن اس عظیم اور پُر از حکمت صحیفہ کی موجودگی کے باوجود اگر حاملینِ قرآن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں تو یہ بات انتہائی باعثِ تعجب ہے ۔ لہٰذا اہلِ اسلام کو خوابِ غفلت سے بیدار ہوکر اولین فرصت میں اس کارِ عظیم کی انجام دہی کے لئے آمادہ ہوجانا چاہیئے ۔ "جہاد بالقرآن" کی یہ حقیقت واضح ہوجانے کے بعد بھی اگر ہم اس سلسلے میں کوتاہی کریں گے تو یہ ایک سنگین قسم کا شرعی جرم ہوگا ۔ آج مُسلمانوں پر جو بھی بلائیں اور مصیبتیں نازل ہورہی ہیں وہ اسی فرضِ منصبی میں کوتاہی کا باعث ہیں ۔

واضح رہے ان دو آیات میں "جہاد بالقرآن" کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اصلاً آقائے مدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا، جیسا کہ اس کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں (وَجَاهِدْهُمْ بِهِ)۔ اور آقائے نامدار نے اس حکم الٰہی پر کاربند رہتے ہوئے تن من دھن کی بازی لگا کر پوری زندگی اس کے لئے وقف کر دی اور عمر بھر اس حکم پر پوری طرح عامل رہے۔ اور چونکہ یہ آیتِ کریمہ مکی دور میں نازل ہوئی تھی، جس میں عسکری جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے آپ نے مکی دور میں کبھی تلوار نہیں اٹھائی۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ قرآن کے ذریعہ دعوت و تبلیغ میں پوری سرگرمی کے ساتھ مشغول و منہمک رہے۔ کیونکہ مکی دور میں مسلمان مغلوب و مقہور اور پوری طرح کمزور و بے بس تھے۔ لیکن ان کے پاس صرف ایک چیز موجود تھی جسے وہ اپنے سینوں سے لگائے ہوئے دعوت و تبلیغ اور دلیل و استدلال کے میدان میں "علمی جنگ" لڑتے رہے۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ جس دور میں بھی مسلمان کمزور ہوں وہ اس آیتِ کریمہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے قرآنِ حکیم کے علمی دلائل و براہین کے ذریعہ کافروں سے زور و شور کے ساتھ علمی جنگ کریں۔ یہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا ایک انمول اور درخشاں پہلو ہے جو تا قیامت تمام مسلمانوں کے لئے دلیلِ راہ اور منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے اور بھٹکے ہوئے مسافروں کو منزل کا اتہ پتہ بتاتا ہے۔

(جاری)

ضروری گذارش

ادارہ ندوۃ المصنفین کی ممبری یا برہان کی خریداری وغیرہ کے سلسلے میں جب آپ دفتر کو خط لکھیں یا منی آرڈر ارسال فرمائیں تو اپنا پتہ تحریر کے ساتھ ساتھ برہان کی چٹ پر آپ کے نام کے ساتھ درج شدہ نمبر بھی ضرور تحریر فرمائیں۔ اکثر منی آرڈر کوپن اور نمبر خالی ہوتے ہیں جس سے بڑی زحمت ہوتی ہے۔ (مینجر)

اُن حدیثوں کے جن کو تم جانتے ہو۔ جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا تو اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اور جس نے قرآن میں (مُجرّد) اپنی رائے سے کوئی بات کہی تو اُس کا ٹھکانہ بھی دوزخ ہے[60]

مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ : رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن میں بغیر علم کے (محض اپنی رائے سے) کوئی بات کہی تو اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے[61]

سب سے بڑا جہاد قرآن سے

ان مباحث سے بخوبی واضح ہوگیا کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کی نوعیت وکیفیت کیا ہے؟ اب اس سلسلے میں چند مُستند مفسرین کے اقوال بھی پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ بحث ہر طرح سے مکمل ہو جائے۔ چنانچہ جہاد قولی یا علمی کے سلسلے میں سورۂ فرقان والی آیت اصل اور بنیادی اہمیت کی حامل ہے، جو پچھلے صفحات میں کئی مقامات پر زیرِ بحث آچکی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِی كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيراً - فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَاداً كَبِيْراً : اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ایک پیغمبر بھیج دیتے۔ سو آپ کافروں کی خوشی کا کام نہ کیجئے اور قرآن سے ان کا زور وشور سے مقابلہ کیجئے۔ (فرقان: ۵۱-۵۲)

اور اس سلسلے میں علامہ ابنِ جوزی کی یہ تفسیر بھی (ساتویں باب میں) گزر چکی ہے کہ اس سے مُراد جہادِ قولی ہے، جو خود قرآن کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔[62]

اور یہی بات حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ اس میں (وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ کے ذریعہ) جو حکم دیا گیا ہے وہ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنا ہے۔

---

[60] و [61] ترمذی کتاب تفسیر القرآن ۵/۱۹۹۔

[62] دیکھئے موصوف کی کتاب نزھۃ الأعین ۱/۲۹ نیز موصوف ہی کی تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر ۶/۹۵ مطبوعہ دمشق۔

قال ابن عباس قوله فلا تطع الکافرین وجاھد ھم به، قال بالقرآن[۶۳]

بعض لوگوں نے یہاں پر جہاد بالسیف مراد لیا ہے۔ مگر یہ دو وجوہات کی بنا پر غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور جہاد مدینہ میں فرض ہوا تھا۔ لہذا یہ قول انتہائی بعید ہے، جیساکہ امام قرطبی اور امام رازی نے تصریح کی ہے۔[۶۴] اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ جہاد بالسیف کی قطعی طور پر نفی ہے۔

قرآن کے ذریعہ جہاد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو علمی دلائل و براہین، تنبیہات، پند و نصائح اور دینِ حق کی تکذیب کرنے والی قوموں کے احوال و کوائف وغیرہ ہیں بطورِ سبق آوری بیان کئے جائیں (اور اُنہیں انجامِ بد سے ڈرایا جائے)۔

أی بالقرآن بتلاوة ما فیه من البراھین والقوارع والزواجر والمواعظ و تذکیر أحوال الأمم المکذبة۔[۶۵]

اب رہا "جہادِ کبیر" یا بڑے جہاد سے کیا مراد ہے؟ تو مفسرین نے اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:

لَا یُخَالِطُه فُتُورٌ : جس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو[۶۶]

تاماً شدیداً : یہ جہاد مکمل اور شدید ہونا چاہئے[۶۷]

جَامِعاً لِکلِّ مُجاھدةٍ : وہ ہر قسم کے مجاہدہ کا حامل ہو[۶۸]

---

۶۳ تفسیر ابنِ جریر : ۱۹/۱۵، دارالمعرفہ بیروت، نیز دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۳/۳۲۱

۶۴ دیکھئے تفسیر قرطبی ۱۳/۵۸ اور تفسیر کبیر ۲۴/۱۰۰

۶۵ تفسیر روح المعانی : ۱۹/۳۲

۶۶ تفسیر قرطبی ۱۳/۵۸

۶۷ زاد المسیر فی علم التفسیر ۶/۹۵

۶۸ تفسیر کبیر ۲۴/۱۰۰

فانّ دعوۃَ کلّ العالمینَ علی الوجہِ المذکورِ جہادٌ کبیرٌ : اس سلسلے میں جو کچھ مذکور ہے اُس کے مُطابق سارے عالم کو دعوت دینا بہت بڑا جہاد ہے [69]

اُوپر مذکور آیاتِ کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے، جس سے اس حکم کی تاکید اور شدت کا پتہ چلتا ہے۔ جو مذکورۂ بالا تفاسیر کے عین مطابق ہے۔ اور مولانا مفتی محمد شفیع نے اس آیت کی تفسیر کے لئے جو سرخی قائم کی ہے وہ یہ ہے : " جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہادِ کبیر ہے" اور پھر اس عنوان کے تحت تحریر کرتے ہیں :

" وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَاداً کَبِیْراً ، یہ آیت مکی ہے جب کہ احکام، کفار سے قتال و جنگ کے، نازل نہیں ہُوئے تھے۔ اسی لئے یہاں جہاد کو بِہٖ کے ساتھ متقید کیا گیا۔ بِہٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالف اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد۔ قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلقِ خُدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے، خواہ زبان سے ہو یا قلم سے، یا دوسرے طریقوں سے۔ ان سب کو یہاں جہادِ کبیر فرمایا ہے"۔ [70]

ان تفسیروں سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کرنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ اور یہ جہاد قولی یا علمی و قلمی جہاد کے سوا اور کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہ کسی مُتجدّد یا دین سے مُنحرف شخص کا قول یا کوئی "بدعت" یا نئی بات نہیں بلکہ حضرت ابنِ عباس سے لے کر مُفتی محمد شفیع تک تمام مفسّرین کا متفقہ قول ہے۔ لہٰذا اگر کچھ مفسّرین نے اپنے دور کے لحاظ سے بعض دیگر "نصوص" کی رُو سے "جہادِ عسکری" کو اولیت دی تھی تو وہ ایک وقتی و عارضی بات تھی، دائمی و ابدی نہیں۔ جہادِ عسکری کا حکم اگرچہ اب بھی موجود ہے اور وہ منسوخ نہیں ہُوا، لیکن

---

[69] تفسیر ابو سعود ۶/۲۲۵

[70] تفسیر معارف القرآن : ۶/۴۷۳

وہ ابدی و دائمی نہیں ہے۔ کیونکہ اسے ہر ملک، ہر جگہ اور ہر وقت جاری رکھا نہیں جا سکتا۔ اس کے برعکس علمی و قلمی جہاد اصل ہونے کی وجہ سے ابدی و دائمی ہے، جو خود قرآن ہی کی صراحت کے مطابق قرآن کے دلائل و براہین اور اُس کے طریقہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا نہ صرف جہاد کی حقیقت کا انکار ہے بلکہ معاذاللہ خود قرآن حکیم کا انکار ہے۔

آج مسلمان قرآن کے اس سب سے بڑے حکم اور شرعی فریضے کو (جو نہ صرف جہادِ عسکری پر مقدم ہے بلکہ وہ ملتِ اسلامیہ کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے) پوری طرح فراموش کئے ہوئے ہیں۔ تو کیا یہ بات (ہماری ملت کے عوام تو بہت دُور کی بات ہے) خود ہمارے علماء اور ہمارے عربی مدرسوں کے لئے ایک حجت نہیں ہے؟ جہادِ عسکری تو پہلے ہی معطل ہو چکا ہے تو کیا اب جہادِ علمی کو بھی معطل کر کے خداوندِ قدوس کے اس حکم کی تکذیب کی جائے گی اور اس راہ میں جدوجہد کرنے والوں کا مذاق اُڑایا جائے گا؟ یہ ہماری ملت کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ علامہ اقبال نے شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے فرمایا ہے ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال		ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو		ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

جہاد اور ہندستانی مسلمان

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ زیرِ بحث آیات (فرقان ۵۱-۵۲) کا سیاق و سباق بھی عقلی دلائل توحید سے گھرا ہوا ہے، جو اس حقیقتِ واضحہ کا ایک اور مزید ثبوت ہے کہ قرآن کے ذریعہ جہاد دراصل "دلائلِ توحید" کے ذریعہ جہاد ہے، جو تمام اقوامِ عالم اور سارے جہان کے لئے بطورِ دلیل و حجت مذکور ہیں۔ اور سورۂ فرقان کا موضوع بھی خاص کر اثباتِ توحید اور تردیدِ شرک ہے، جس میں ایک منفرد اور طاقتور ترین اسلوب میں توحید کی حقیقت کو مختلف علمی و عقلی دلائل میں ثابت کر کے مشرکین کے شبہات و اعتراضات کا مُدلّل جواب دیا گیا ہے۔ اور اس سورہ کی ابتداء اس آیتِ کریمہ سے ہوتی ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا: وہ بڑی خوبیوں والا ہے جس نے اپنے بندے پر فُرقان (حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب) نازل کی، تاکہ وہ سارے جہاں کو متنبہ کر سکے۔ (فرقان: ۱)

قرآن چونکہ سلسلۂ صحفِ سماوی کی آخری کڑی ہے اس لئے اس آخری صحیفہ کو ہر قسم کے علمی و عقلی دلائل سے پوری طرح مزیّن و آراستہ کر دیا گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اسے فرقان کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے وہ چیز جو حق و باطل میں تمیز کر سکتی ہو۔ اس طرح قرآن کی ایک پوری سورت کو "فُرقان" کے نام سے موسوم کر کے دراصل حاملینِ قرآن کو اس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

بہرحال قرآنِ حکیم کے ان علمی و عقلی دلائل کی حقیقت موجودہ سائنٹفک دور میں اور بھی زیادہ کُھل کر سامنے آگئی ہے اور تحقیقاتِ جدیدہ کے ذریعہ اس کے نئے نئے اسرار و معارف سامنے آرہے ہیں جو علمی دنیا کو مبہوت و ششدر کئے ہوئے ہیں۔ اور ان حقائق و معارف کے ملاحظہ سے اب نوعِ انسانی قرآنِ کریم کی حقانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور نظر آرہی ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں کہ جب وہ انشاء اللہ پوری طرح اسلام کی گود میں آجائے گی۔

اس اعتبار سے آج قرآنِ حکیم کے علمی و عقلی دلائل کے ذریعہ نوعِ انسانی کو قرآن سے قریب تر لانے کے جتنے مواقع موجود ہیں اتنے سابقہ کسی بھی دور میں نہیں تھے۔ لیکن اس عظیم اور پُر از حکمت صحیفہ کی موجودگی کے باوجود اگر حاملینِ قرآن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں تو یہ بات انتہائی باعثِ تعجب ہے۔ لہٰذا اہلِ اسلام کو خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اولین فرصت میں اس کارِ عظیم کی انجام دہی کے لئے آمادہ ہو جانا چاہیئے۔ "جہاد بالقرآن" کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی اگر ہم اس سلسلے میں کوتاہی کریں گے تو یہ ایک سنگین قسم کا شرعی جرم ہوگا۔ آج مُسلمانوں پر جو بھی بلائیں اور مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں وہ اسی فرضِ منصبی میں کوتاہی کا باعث ہیں۔

واضح رہے ان دو آیات میں "جہاد بالقرآن" کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اصلاً آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا، جیساکہ اس کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں (وَجَاهِدْهُمْ بِهِ)۔ اور آقائے نامدار نے اس حکمِ الٰہی پر کاربند رہتے ہوئے تن من دھن کی بازی لگا کر پوری زندگی اس کے لئے وقف کر دی اور عمر بھر اس حکم پر پوری طرح عامل رہے۔ اور چونکہ یہ آیتِ کریمہ مکی دور میں نازل ہوئی تھی، جس میں عسکری جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے آپ نے مکی دور میں کبھی تلوار نہیں اُٹھائی۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ قرآن کے ذریعہ دعوت و تبلیغ میں پوری سرگرمی کے ساتھ مشغول و منہمک رہے۔ کیونکہ مکی دور میں مسلمان مغلوب و مقہور اور پوری طرح کمزور و بے بس تھے۔ لیکن اُن کے پاس صرف ایک چیز موجود تھی جسے وہ اپنے سینوں سے لگائے ہوئے دعوت و تبلیغ اور دلیل و استدلال کے میدان میں "علمی جنگ" لڑتے رہے۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ جس دور میں بھی مسلمان کمزور رہوں وہ اس آیتِ کریمہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے قرآنِ حکیم کے علمی دلائل و براہین کے ذریعہ کافروں سے زور و شور کے ساتھ علمی جنگ کریں۔ یہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا ایک انمول اور درخشاں پہلو ہے جو تا قیامت تمام مسلمانوں کے لئے دلیلِ راہ اور منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے اور بھٹکے ہوئے مسافروں کو منزل کا اتہ پتہ بتاتا ہے۔

(جاری)

ضروری گذارش

اِدارہ ندوۃ المصنفین کی ممبری یا برہان کی خریداری وغیرہ کے سلسلے میں جب آپ دفتر کو خط لکھیں یا منی آرڈر ارسال فرمائیں تو اپنا پتہ تحریر کے ساتھ ساتھ برہان کی چٹ پر آپ کے نام کے ساتھ درج شدہ نمبر بھی ضرور تحریر فرمائیں۔ اکثر منی آرڈر کوپن اور نمبر خالی ہوتے ہیں جس سے بڑی زحمت ہوتی ہے۔ (مینیجر)

ابن قتیبہ

بحیثیت ناقد

از۔ ڈاکٹر ایم اقبال حسین ندوی، لکچرار ڈپارٹمنٹ آف عربک یونیورسٹی
(حیدرآباد)

ابن قتیبہ (۲۱۳ - ۲۷۶ھ) کی شخصیت علمی دنیا میں ایک مفسر، محدث، فقیہہ، ادیب، ناقد، صرفی، نحوی اور لغوی کی حیثیت سے معروف ہے۔ مختلف علوم و فنون کے موضوع پر اس نابغۂ روزگار شخص کی تصنیفات و تالیف کا ایک بڑا ذخیرہ ہے لیکن ان سب میں علمی ذوق کے پہلو بہ پہلو ان کا ادبی مذاق اور تنقیدی شعور موجود ہے۔ ان کی تحریر جس موضوع پر بھی ہے اس میں قوتِ فکر، وسعتِ نظر، زندگی کا احساس، تہذیب و ثقافت کے اقدار کی معلومات غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔ اور ان تحریروں میں زندگی کے لیے صحیح رُخ متعین کرنے کا جذبہ ہر جگہ موجود ہے۔ اور شعر و ادب میں سچے اقدار کی تلاش اور معیار متعین کرنے کا رجحان کارفرما ہے۔ عبد السلام رقمطراز ہے:-

"ابن قتیبہ کی تحریریں عام طور پر اس بات کی غماز ہیں کہ اس نے ان ہی علوم کو موضوع سخن بنایا ہے جو انسان کے لیے مفید کارآمد ہونے کے ساتھ زندگی میں تبدیلی اور انقلاب لانے کا کام انجام دے، اس نے علوم کی خدمت اپنی ذات کے لیے نہیں کی ہے بلکہ اس سے انسانی زندگی میں تبدیلی اور فکری ترقی

لانے کے لیے تعاون حاصل کرنا مقصود ہے۔ اس بات نے اس کی ذات
اور علمی کارناموں کو اعلیٰ مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔ ۱؎
جہاں تک ادبی تنقید کے موضوع کا تعلق ہے . . . . .

ابن قتیبہ کے ادبی مذاق اور شعری ذوق کا نمونہ تقریباً ان کی سب ہی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن شعر و ادب کے موضوع پر ان کی چار کتابیں مشہور ہیں۔

۱۔ کتاب المعانی الکبیر، ۲۔ ادب الکاتب، ۳۔ الشعر والشعراء، ۴۔ عیون الشعر مؤخر الذکر کے علاوہ سب ہی کتابیں دستیاب ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب خالص فن نقد پر نہیں لکھی گئی ہے۔ سب میں تنقید کا موضوع ضمنی ہے۔ لیکن جو تنقیدی مباحث ان کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور اصولی باتیں کی گئی ہیں۔ ان میں ابن قتیبہ کا تنقیدی فکر نمایاں ہے۔ ادب و شعر پر جس دور میں ابن قتیبہ نے گفتگو کی اصرف و نحو، بلاغت اور دوسرے علوم مدون ہو چکے تھے، یا ہو رہے تھے، یونانی، فارسی، اور دوسری زبانوں سے بلاغت اور دوسرے موضوعات سے کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے ان کے اثرات شعر و ادب کے افہام و تفہیم اور غور و فکر پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ ابن قتیبہ کی تحریروں میں عجمی علوم و فنون کے واضح اثرات تو نہیں لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ زندگی اور اس کی ترجمانی کی تبدیلی کا احساس ضرور ہے۔ اور شعر و ادب سے متعلق جو مباحث وجود میں آرہے تھے ان پر اظہار رائے بھی ہے۔ اس لیے اس کے ضمنی تنقیدی مباحث کو بھی ادبی تنقید کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

ابن قتیبہ کی تنقیدی فکر تو واضح ہو کر اس کی کتاب "الشعر والشعراء" کے مقدمے میں سامنے آئی ہے۔ لیکن "کتاب المعانی الکبیر" میں بھی ادب و زبان اور تنقید کا ایک اچھا مطالعہ موجود ہے۔ ابواب کے تحت اشعار کے انتخاب میں مضمون و معانی کا لحاظ اس کے علاوہ اشعار کے پیچیدہ اور دشوار مفاہیم و معانی کی تحلیل و تفسیر اس کتاب کی خاص خوبیاں ہیں۔ ابن قتیبہ کے سامنے یہ بات شاید ضرور رہی ہوگی کہ شعر زندگی تعبیر و تشریح کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے ابواب کے قائم کرنے اور پھر اشعار کے انتخاب میں زندگی کی تعبیر کا لحاظ،

ماحول و حالات کی تصویر کشی، متحرک زندگی کا نمونہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ آداب
زندگی، طرز معاشرت، حیوانات اور زندگی کی دوسری باتوں سے متعلق اشعار کی تجمیع کے
ساتھ تحلیل میں تنقیدی بصیرت اور تنقیدی اصول کی پیروی کی ہے۔ عبدالسلام
عبدالحفیظ رقمطراز ہے:۔

"شعر میں زندگی کی جو تصویر کشی کی جاتی ہے اور شعر میں جو کچھ بیان کیا
ہے ابن قتیبہ اس کتاب میں اس کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔" [۲]

اور بقول ڈاکٹر محمد طاہر درویش :۔

"وہ ایک عمدہ لغوی ادبی کتاب ہے۔ ابن قتیبہ کے وسیع لغوی و ادبی
معلومات اور ثقافت پر دلالت کرتا ہے۔" [۳]

"ادب الکاتب" بھی اس کے خالص فنی ذوق اور زبان و ادب سے گہری واقفیت
کا عمدہ نمونہ ہے۔ ابن قتیبہ گرچہ نسلاً عرب نہیں ہے لیکن اس پر زبان و ادب کے سلسلہ
میں خالص عربی ذوق غالب ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے گہری محبت، عربیت اور عرب،
اور عربی زبان کے احترام کے نتیجہ میں عربی زبان و ادب کی اصل روح کو برقرار رکھنے کی خاطر
اس نے شعوبیوں سے زبردست مدافعت کیا ہے۔ عربی زبان و ادب [illegible] کو برقرار
رکھنے، نحوی و صرفی غلطیوں سے پاک رکھنے، عربی زبان کی امتیازی خصوصیات [illegible]
عربیت کو باقی رکھنے کی غرض سے عربی ادب کا ایک بہترین ذخیرہ جمع کیا ہے [illegible]
جذبہ کتاب میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے عربی زبان و ادب کے [illegible]
لیے یہ کتاب ایک شاہکار ہے۔ اس میں بھی ابن قتیبہ کا تنقیدی ذوق ہی کا [illegible]

دراصل کتاب "الشعر والشعراء" بنیادی کتاب ہے جس میں ابن قتیبہ کے [illegible]
رجحانات اور خالص فنی تنقیدی نقاط زیادہ تر پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کے دو [illegible]
پہلا حصہ اس کے مقدمہ پر مشتمل ہے اور دوسرا جزء شعراء کے کلام کے انتخاب اور تنقیدی
اقوال و احوال پر مبنی ہے۔ بنیادی تنقیدی اصول پر بحث کتاب کے پہلے جزء یا مقدمہ
میں کی گئی ہے۔ دوسرا جزء یعنی کتاب کا بقیہ حصہ خالص فنی تنقید کے اعتبار سے اس قدر اہم

ماحول و حالات کی تصویر کشی، متحرک زندگی کا نمونہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ آدابِ زندگی، طرزِ معاشرت، حیوانات اور زندگی کی دوسری باتوں سے متعلق اشعار کی تجمیع کے ساتھ تحلیل میں تنقیدی بصیرت اور تنقیدی اصول کی پیروی کی ہے۔ عبدالسلام عبدالحفیظ رقمطراز ہے:۔

"شعر میں زندگی کی جو تصویر کشی کی جاتی ہے اور شعر میں جو کچھ بیان کیا ہے ابن قتیبہ اس کتاب میں اس کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔" ؎۲

اور بقول ڈاکٹر محمد طاہر درویش :۔

"وہ ایک عمدہ لغوی ادبی کتاب ہے۔ ابن قتیبہ کے وسیع لغوی و ادبی معلومات اور ثقافت پر دلالت کرتا ہے۔" ؎۳

"ادب الکاتب" بھی اس کے خالص فنی ذوق اور زبان و ادب سے گہری واقفیت کا عمدہ نمونہ ہے۔ ابن قتیبہ گرچہ نسلاً عرب نہیں ہے لیکن اس پر زبان و ادب کے سلسلہ میں خالص عربی ذوق غالب ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے گہری محبّت، عربیت اور عرب، اور عربی زبان کے احترام کے نتیجہ میں عربی زبان و ادب کی اصل روح کو برقرار رکھنے کی خاطر اس نے شعوبیوں سے زبردست مدافعت کیا ہے۔ عربی زبان و ادب کے معیار کو برقرار رکھنے، نحوی و صرفی غلطیوں سے پاک رکھنے، عربی زبان کی امتیازی خصوصیات اور عربیت کو باقی رکھنے کی غرض سے عربی ادب کا ایک بہترین ذخیرہ جمع کیا ہے۔ یہ روح اور جذبہ کتاب میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے عربی زبان و ادب کے صحیح استعمال کے لیے یہ کتاب ایک شاہکار ہے۔ اس میں بھی ابن قتیبہ کا تنقیدی ذوق ہی کارفرما ہے۔

دراصل کتاب "الشعر والشعراء" بنیادی کتاب ہے جس میں ابن قتیبہ کے تنقیدی رجحانات اور خالص فنی تنقیدی نقاط زیادہ تر پائے جاتے ہیں۔ اس کتاب کے دو حصّے ہیں پہلا حصّہ اس کے مقدمہ پر مشتمل ہے اور دوسرا جزء شعراء کے کلام کے انتخاب اور تنقیدی اقوال و احوال پر مبنی ہے۔ بنیادی تنقیدی اصول پر بحث کتاب کے پہلے جزء یا مقدمہ میں کی گئی ہے۔ دوسرا جزء یعنی کتاب کا بقیہ حصہ خالص فنی تنقید کے اعتبار سے اس قدر اہم

نہیں ہے جس قدر ابتداء کو حاصل ہے۔ اس کتاب کی تالیف کا بنیادی مقصد ابن قتیبہ کے نزدیک دوسرا حصہ ہی ہے۔ شعراء اور ان کے کلام کے متعلق معلومات فراہم کرنا اور تحقیق و تنقید کی روشنی میں شعراء کے حالات اور ان کے کلام کو جمع کرنا اس کتاب کی غایت قرار دیا ہے۔ ابن قتیبہ رقمطراز ہے۔

"میں نے اس کتاب کو شعراء کے سلسلہ میں تالیف کیا ہے۔ اس میں شعراء اور اُن کے عہد، اقدار اور ان کے اشعار میں ان کے حالات، ان کے قبائل، ان کے اسماء ان میں سے جو لقب یا کنیت سے معروف ہیں۔ اور جن سے لوگوں کے حالات بہتر طریقہ پر جانے جاسکتے ہیں جس سے شعر کو بہتر طریقہ پر سمجھا جاسکتا ہے۔ علماء نے الفاظ معانی کی جن خامیوں کی گرفت کی ہے اور جس کی جانب متقدمین نے سبقت کی ہے۔ اور متاخرین نے ان سے اخذ کیا ہے ان سے متعلق معلومات میں نے فراہم کیا ہے۔ اور میں نے اسی میں شعر کے اقسام اور اس کے طبقات اور اسباب جن کی وجہ سے شعر بہتر سمجھا جاتا ہے اور پسندیدہ سمجھا جاتا ہے اس کی تفصیل بیان کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ چیزوں کو میں نے اس کے پہلے جزء میں پیش کیا ہے۔" ؎

ابن قتیبہ نے کتاب کے مقدمہ میں جن چند بنیادی مسائل پر گفتگو کی ہے اور ان کو تنقیدی اصول کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان پر ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ محمد مندور نے ابن قتیبہ کے متعلق جن آراء کا اظہار کیا ہے ان پر روشنی بعد میں ڈالی جائے گی، لیکن وہ الشعر والشعراء کے مقدمہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"اس نے اپنے مقدمہ میں بعض عام مسائل کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے اور [illegible] ما بات کی کوشش کی ہے کہ ان کو بنیادی اصول قرار دے۔" ؎

ابن قتیبہ نے مقدمہ میں جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں اس بات کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ اس نے قدیم و جدید شاعری کے درمیان امتیاز محاسن شعری کی وجہ سے کیا اور اس نے یہ اصول پیش کیا کہ عہد کی تقویم کی وجہ سے کسی شاعر کی

شاعری کو بہتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نظریہ کو جاحظ اور المبرد نے بھی پیش کیا تھا لیکن ابن قتیبہ نے قدرے وضاحت کے ساتھ اپنی بات کہی۔ جریر، فرزدق، واخطل، اسی طرح ابونواس، بشار بن برد اور ان تمام جیسے شعراء کی شاعری اپنے فکر و خیال، اور احساس و شعور کی جدت و ابتکار، زبان و بیان میں سلاست و روانی، اور قدیم شاعری کے اسالیب سے قدرے اختلاف کی وجہ سے معرض بحث بنی ہوئی تھی، قدیم طرز کے فکر کے ناقدین اور اہل علم قدیم شاعری کے مقابلہ میں ان شعراء کی شاعری کو کمتر درجہ کی گردانتے تھے۔ قدامت کا جو رعب غالب تھا، قدیم شعراء کی شاعری کی اہمیت بغیر فن شناسی کے جو دلوں میں تھی۔ ابن قتیبہ نے اس کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ " وہ کسی متقدم کو اس کے تقدیم کی وجہ سے جلالت کی نظر سے نہیں دیکھتا ہے اور نہ ہی کسی متاخر کو اس کے تأخر کی وجہ سے حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بلکہ دونوں فریقوں کو انصاف کی نظر سے دیکھتا ہے اور ہر ایک کو اس کا حق دیتا ہے اور اس کا حق دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ بعض اہل علم معمولی شعر کو شاعر کے متقدم ہونے کی وجہ سے عمدہ شعر سمجھتے ہیں اور اس کو اعلیٰ درجہ کا شعر شمار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک اچھے شعر کو کمتر درجہ کا سمجھتے ہیں۔ گرچہ اس شعر میں اس کے نزدیک کوئی عیب نہیں ہے سوائے یہ کہ اس کے عہد میں کہا گیا ہے۔ یا شاعر سے اس کی ملاقات ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے شعر، علم اور بلاغت کو کسی ایک عہد کے لیے مخصوص اور محدود نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی قوم کے لیے خاص کیا ہے بلکہ اپنے بندوں میں مشترک طور پر تقسیم کیا ہے۔ اور ہر ایک قدیم کو اس کے اپنے عہد میں جدید بنایا ہے"[۶]

ابن قتیبہ کا یہ نظریہ اور اس کا پیغام اس کے نظریاتی بنیاد پر ہے اس میں کسی اثر کا دخل نہیں ہے۔ تنقید میں فکری آزادی کا یہ رجحان قابل ستائش ہے تقلید محض سے آزادی، نئی فکر کی تلاش، صالح اقدار کی قدر دانی، فن کی ترقی اور اس کے نمو و بقاء کے لیے ضروری ہے جس طرح زندگی متحرک ہے اس میں تغیر پذیری کے آثار لازمی ہیں، اسی طرح فن میں تبدیلی کی علامت اور فنی ارتقاء ایک مستحسن عمل ہے۔ ابن قتیبہ کے ادبی شعور، وسعت مطالعہ، فکر و فن میں دقت نظر نے اس بات کو محسوس کیا۔

لیکن ابن قتیبہ صرف ادیب وناقد نہیں تھے ، وہ محدّث، فقیہہ، مورّخ اور لغوی بھی تھے ۔ اس کا ذہن قدیم علمی اور ادبی سرمایہ کا پروردہ تھا ۔ اس بات نے اس میں تقلید کی خو پیدا کر دی تھی، اس لیے اس کی تجدیدی فکر محض ان الفاظ تک محدود ہے ۔ اس لیے کہ وہ جدیدیت کے اعتراف کے باوجود شعراء کو عربی شاعری کے قدیم ڈگر پر ہی چلنے کا مشورہ دیتا ہے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ قصیدے کے تمام ارکان کی اس طرح پابندی کرنے کی رائے دیتا ہے ۔ جس طرح قدیم شعراء نے کیا ہے ۔ اور اس میں ایسی تبدیلی کرنے کے لیئے کہتا ہے کہ قدیم معنی وموضوع کے پیرائے میں جدید اشیاء کا تذکرہ کرے، اور اس کا یہ مشورہ تقلید محض سے زیادہ عیب کی بات ہے ۔

ابن قتیبہ کے عہد میں لفظ ومعنی کی بحث علم تھی ، بشر بن معتمر اور جاحظ نے شعر وادب کے صوری ومعنوی خوبیوں پر بحث کا آغاز کیا ، لفظ ومعنی کی بحث کو وجود بخشا تو زبان و بیان اور شعر وادب کے نکتہ دانوں نے اس بحث میں خاص دلچسپی محسوس کی، اور زبان و ادب کے صوری ومعنوی معیار کو پرکھنے اور اس کے حسن وقبح کو جانچنے کا میزان قرار دیا تیسری صدی ہجری میں خاص طور سے جاحظ کے فکر ونظر کو وقیع علمی حیثیت دی گئی اور موافقین ومخالفین کی جماعت قائم ہو گئی ۔ بعض لفظ اور اسلوب کے طرفدار ٹھہرے اور بعض معنی اور فکر وخیال کے ۔ جہاں تک جاحظ اور ابن قتیبہ کا سوال ہے جاحظ معتزلی تھے ۔ اور ابن قتیبہ سنی العقیدہ ۔ دونوں کے اختلاف مسلک کا اثر فکر ونظر اور تنقیدی وادبی نقطۂ نظر پر پڑنا ضروری تھا ۔ جاحظ نے ضعف لفظی، الفاظ کے دروبست اور ضائع وبدائع کے استعمال کی طرف زیادہ توجہ دی اور الفاظ کو زیادہ وقعت دی، ابن قتیبہ نے معانی وخیال افکار واحساسات کو فن پارہ میں الفاظ واسلوب اور صوری خوبیوں سے کم اہمیت نہیں دی ۔ بلکہ بعض اعتبار سے زیادہ ہی ۔ اس کے نزدیک معانی اور ندرت خیال اس قدر سرراہ عام نہیں ہیں جس قدر جاحظ کے نزدیک ۔ ابن قتیبہ لفظ کو بھی اہمیت دیتا ہے اور معنی کو بھی، الفاظ اور معانی یعنی صوری اور معنوی محاسن کے لحاظ کرتے ہوئے ابن قتیبہ نے شعر کو چار اقسام میں تقسیم کیا ۔

پہلی قسم وہ ہے جس کا لفظ خوبصورت ودلکش ہے اور اس کا معنی بھی عمدہ ہے ۔

والشعراء ۔ ص ۳)

دوسری قسم وہ ہے جس کا لفظ خوبصورت، دلکش اور شیریں ہے لیکن کوئی معنوی خوبی نہیں ہے ۔ (ایضاً ص ۳)

تیسری قسم وہ ہے جس کا معنی عمدہ ہے لیکن الفاظ میں خامی ہے ۔ (ایضاً ص ۴)

چوتھی قسم وہ ہے جس کے الفاظ و معنی دونوں میں خامیاں ہیں ۔ (ایضاً ص ۴)

اس کے باوجود کہ ابن قتیبہ کے نزدیک الفاظ کی اہمیت ہے اور شعر کے لیے .. صوری محاسن کی اپنی اہمیت ہے لیکن معنوی محاسن کی قدر و قیمت کچھ زیادہ ہی ہے ۔ یہ بات اس طرز استدلال سے واضح ہے کہ اس نے شعر کے مختلف اقسام کے مثالوں کی جو تشریح کی ہے اس کا انحصار محض معنوی خوبیوں پر ہے اور پوری توجہ معنوی محاسن کی جانب ہے لیکن ابن قتیبہ کے نزدیک معنی اور فکر و خیال سے مراد کیا ہے ۔ ایک اہم بنیادی سوال ہے ۔ اس نے خود سے معنی یا فکر و خیال کی واضح الفاظ میں کوئی فنی توضیح نہیں کی ہے ۔ جہاں تک اس نے اقسام شعر کے سلسلہ میں مثالوں کا انتخاب کیا ہے اور وضاحت کی ہے ۔ اس کے مطالعہ سے ناقدوں نے مختلف رائے قائم کی ہے ۔

محمد مندور جس نے تفصیل سے ابن قتیبہ کے تنقیدی خیالات کا جائزہ لیا ہے اس کی رائے ہے کہ ابن قتیبہ کے نزدیک معنی سے مراد، ۱ ۔ فکر ۲ ۔ اور اخلاقی معنی ہے [۵]

محمد مندور کا یہ خیال اس کے منفی طرز استدلال پر مبنی ہے ۔ اس لئے کہ یہ اشعار جن میں ابن قتیبہ کو کوئی معنوی خوبی نظر نہیں آئی ۔ اس پر محمد مندور نے اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہے ۔

ولما قضينا من منى كل حاجة	ومسح بالأركان من هو ماسح
وشدت على حدف المطايا رحالنا	ولا ينظر الغادى الذى هو رائح
أخذنا بأطراف الأحاديث بيننا	وسالت بأعناق المطى الأباطح

واقعہ یہ ہے کہ ابن قتیبہ نے ان اشعار کو معنوی محاسن کے فقدان اور الفاظ کے جودت اس کی شیرینی اور دلکشی کی مثال میں پیش کیا ہے ۔ اور ابن قتیبہ نے دعوی کے ساتھ کہا ہے کہ ان اشعار میں حسن الفاظ اور شیرینی کے علاوہ تلاش یا غور و فکر کے بعد بھی کوئی چیز نہیں

ملتی ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرلینا کہ چونکہ اس میں فکر اور اخلاقی معنی نہیں ہے اس لیے ابن قتیبہ کو ان اشعار میں کوئی معنوی خوبی نظر نہیں آئی۔ اور ابن قتیبہ کے نزدیک معنی سے مراد فکر اور اخلاقی معنی ہی ہے۔ محمد مندور کا یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے محمد مندور نے مزید تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اخلاقی معنی یا فکر شعر کی اصل روح نہیں ہے بلکہ فنی تصویر کشی شعر کی اصل قدر و قیمت ہے جو ان اشعار میں موجود ہے۔ اور عبدالقاہر الجرجانی نے بھی ان اشعار کے فنی جمالیات کو محسوس کیا ہے ــــ محمد مندور مزید تحلیل کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ آج کے معیار پر اس (ابن قتیبہ) کے خیالات کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ پھر بھی ابن قتیبہ میں ایک حساس ادیب کا صداقت احساس نہیں ہے۔ جس کا تعلق ذوق سے ہے۔ بلکہ وہ ذوق سے زیادہ فکر سے کام لیتا ہے۔ بہر حال مختلف تجزیہ کے بعد محمد مندور نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابن قتیبہ کے نزدیک معنی سے مراد فکر اور اخلاقی معنی ہی ہے [۸]

دور جدید کے ایک دوسرے ناقد محمد زکی عشماوی نے ابن قتیبہ کی تشریحات و توضیحات کو کھنگالنے کے بعد یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ ابن قتیبہ کے نزدیک معنی سے مراد "فلسفیانہ افکار، خاص قسم کے انسانی عادات و اطوار، دلچسپ تصورات اور نادر باتیں" ہیں [۹]

لیکن عبدالسلام عبدالحفیظ نے شعری اقسام کی مثالوں کی تشریح سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ابن قتیبہ کا فکری دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ اس کے معنوی محاسن کا دائرہ وسیع ہے۔ اس کے نزدیک فکر و خیال اور معانی کے دائرہ میں اخلاقی افکار انسانی زندگی کے تجربات و مشاہدات سے حاصل ہونے والی باتیں، انسانی نفسیات و احساسات کی تصویر کشی اور ترجمانی شامل ہیں [۱۰]

ابن قتیبہ کی فکر و نظر میں جو وسعت تھی اس کے پیش نظر فکر، و اخلاق، عادات و خصائل اور تصورات تک معنی کے مفہوم، وجدان و فکر دونوں پر محیط تھا اس لیے فنی اعتبار سے عبدالسلام کی رائے زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہے۔

بہرصورت ابن قتیبہ نے جو شعر کی چار قسمیں کی ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ کسی بھی عمدہ شعر کے لیے ضروری ہے کہ اس کا معنی و لفظ دونوں ہی عمدہ ہوں اور ان میں جودت ہو۔ یعنی الفاظ و اسلوب کے ساتھ احساس و شعور اور فکر و خیال میں بلندی و پاکیزگی لازمی ہیں لیکن پرشکوہ الفاظ، اسلوب میں شیرینی و حلاوت، شگفتگی و رعنائی کے باوجود فکر و خیال یا احساس و شعور میں رفعت نہیں ہے تو وہ شعر فن کے اعلیٰ معیار پر اور اول درجہ کا نہیں ہے۔ اسی طرح وہ شعر جس کے تخیل میں رفعت، معنی یا موضوع میں پاکیزگی و بلندی تو ہے لیکن الفاظ معیار پر نہیں ہیں یا اسلوب میں چاشنی اور دلکشی نہیں ہے۔ یعنی شاعر فکر و خیال کو ادا کرنے پر قادر نہیں ہے یا زبان پر قدرت نہیں رکھتا ہے تو وہ شعر کی تیسری قسم ہے۔ اس کے علاوہ کبھی شاعر نہ تو اعلیٰ احساس و خیال پر قادر ہوتا ہے نہ ہی الفاظ ہی اس کے تابع ہوتے ہیں۔ دونوں میں ناہمواری اور سطحیت ہوتی ہے اس اعتبار سے یہ شعر چوتھی قسم کا ہے۔

اس نے شعر کے اقسام میں جن اصطلاحات کا استعمال کیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن قتیبہ نے شعر کی یہ تقسیم ذوق کے بنیاد پر کیا ہے اور اس میں ایک خاص منطقی ترتیب ہے کسی فن تحلیل کی بنیاد پر یہ تقسیم نہیں ہے۔ اور اس کی پوری نظر شعر کی معنوی خوبی پر ہے۔ غرض کہ معنی اصل ہے اور لفظ اس کو ادا کرنے کے لیے ہے شاعر کی شاعرانہ صلاحیت معنی کے انتخاب اس کے احساس و شعور اور فکر و خیال کی بلندی پر منحصر ہے۔ الفاظ کا انتخاب اس کا شگفتہ اسلوب میں پیش کرنا ایک دوسرے درجہ کا عمل ہے محض الفاظ کا تراش خراش، اس کی ظاہری فصاحت و بلاغت اور فنی اسلوب بے جان سی چیز ہے۔ لیکن فنی حیثیت سے معنی و لفظ دونوں ہی ضروری ہیں اور دونوں کی اہمیت یکساں ہیں۔

ابن قتیبہ نے فن کے معنوی حسن اور اس کے جمالیاتی عناصر پر گفتگو الشعر والشعراء کے مقدمہ کے علاوہ شعراء کے تراجم، کتاب المعانی الکبیر، اور تاویل مشکل القرآن میں جا بجا کیا ہے۔ اس نے شعر کے بہتر ہونے کے لیے یہ رائے قائم کی ہے کہ معانی و موضوع اور فکر و خیال میں ابتکار و جدت ایک اہم پہلو ہے، شاعر کسی ایسے موضوع پر شعر کہتا ہے جس پر شعراء نے اس سے پہلے طبع آزمائی کی ہے تو شاعر کو عمدہ شعر پیش کرنے کے لیے اس موضوع پر اضافہ

اور تجدیدی پہلو کا لحاظ کرنا چاہیئے ورنہ اس کے کلام کی کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

ابن قیتبہ نے الفاظ کے صرفی، نحوی قاعدے اور بلاغی نقاط (ابوعبیدہ کی پیش کشی پر کوئی اضافہ ابن قیتبہ نہیں کرسکا ہے۔) اوزان و قوافی پر جابجا بحث کی ہے لیکن کسی جگہ پر مرتب شکل میں نہیں ہے۔ ان تمام باتوں میں اس کا نقطۂ نظر روایتی ہے گرچہ اس کے نزدیک کسی صرفی و نحوی قاعدہ سے انحراف، بلاغت کا لحاظ نہ کرنا اوزان و قوافی کے اصول کی پابندی عمود شعری کے مطابق نہ کرنا کسی بھی فن کا عیب ہے۔

ابن قیتبہ نے شعر کے معیار قائم کرنے اور تنقیدی نقطۂ نظر سے اس کی بعض خصوصیات معلوم کرنے کے لیے یہ معیار بھی قائم کیا ہے کہ شعر فی البدیہہ کیا گیا ہے یا اس کے بنانے سنوارنے میں فنی کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ پہلی صورت کو "مطبوع" اور دوسری صورت کو "متکلّف" سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے دونوں ہی اصطلاح کی جو تعبیر و تشریح کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن قیتبہ نے دونوں اصطلاح کو اس معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔ جس معنی میں عام طور سے موجودہ دور میں مستعمل ہیں۔ متکلف جس کو شاعری میں عیب سمجھا جاتا ہے۔ ابن قیتبہ کی تشریح کے مطابق وہ ایک ہنر، فنی عمل اور حسن عمل ہے۔ متکلّف شاعر کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ شاعر جس نے اپنے شعر کو آراستہ کر کے سنوارا" چھان بین کر کے اس کی تنقیح کی، اور اس پر بار بار غور کیا وہ متکلّف ہے اس کی مثال زہیر اور حطیئہ سے دی ہے۔[۱۱]

اسی طرح وہ متکلّف شعر کے متعلق کہتا ہے کہ عمدہ شعر جو فنی معیار پر ہے اور اہلِ علم کے نزدیک اس کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اور ان کے سامنے یہ ظاہر ہے کہ شاعر نے طویل غور و فکر، پوری توجہ صرف کر کے محنت شاقہ کے بعد شعر کہا ہے اور جس خیال یا معنی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو حذف کر دیا گیا ہے اور جس معنی یا خیال کی شعر میں ضرورت ہے اس کو باقی رکھا گیا ہے۔[۱۲]

یہاں پر دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک تو یہ کہ ابن قتیبہ نے جس کو تکلف سے تعبیر کیا ہے۔ اسے لفظ "صَنْعَة" سے تعبیر کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ جس چیز کو وہ "تکلف"

کہتا ہے۔ وہ فنی اعتبار سے "صَنْعَة" ہے، اسی طرح اس نے ان دونوں الفاظ کے مفہوم کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اس لیے کہ عام طور سے جو مفہوم "صَنْعَة" کا ہے وہ "تکلف" کا نہیں اور جو تکلف ہے وہ "صَنْعَة" کا نہیں۔[۱۳]

دوسری بات جو اسی سے متعلق ہے یہ کہ تنقیح و تہذیب اور شعر کہتے وقت غور و فکر، کسی لفظ کی جگہ پر بہتر لفظ کا انتخاب اور قصیدہ میں کسی شعر کے خارج کر دینے یا شعر میں تقدیم و تاخیر کرنے، شعر کو زیادہ دلکش اور زبان و بیان کو بلیغ و شگفتہ بنانے کا عمل فنی کاوش اور فنی عمل ہے۔ وہ معیاری شعر یا قصیدہ کے لیے اچھی بات ہے کوئی عیب نہیں ہے۔ اسے تکلّف نہیں کہہ سکتے اس کو "صَنْعَة" یا فنی طرز عمل کہہ سکتے ہیں۔

ابن قتیبہ کے نزدیک متکلف، مطبوع کے مقابلہ میں کمتر درجہ کی شاعری ضرور ہے۔ لیکن وہ عیب نہیں ہے۔ اس نے جسے شعر متکلف کہا ہے اس کے نزدیک وہ عمدہ اور فنی معیار پر ہوتا ہے۔ زہیر اور حطیئہ کی شاعری میں یقیناً فنّی معیار پر تھی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے عیوب ہوں جو شاعر کی خوبیوں پر اثر انداز ہوتے ہوں لیکن جس تکلّف کو ہم عیب سمجھتے ہیں وہ بات ان دونوں شعراء کے کلام میں نہیں پائی جاتی ہے۔ ابن قتیبہ یقیناً زہیر اور حطیئہ کی شاعری کو فنّی معیار سمجھتے تھے، پھر بھی ڈاکٹر محمد مندور نے ابن قتیبہ پر الزام لگایا کہ اس کے علاوہ کسی نے زہیر اور حطیئہ کی شاعری پر تکلّف کا الزام نہیں لگایا۔[۱۴]

ابن قتیبہ پر مندور کے اس الزام کی نفی خود اس کی باتوں سے ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دور جدید میں لفظ تکلف کو تصنع کے قریب ترین مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ابن قتیبہ کے نزدیک تکلف کا دوسرا مفہوم تھا جیسا کہ اس نے تکلف سے مراد تثقیف، تنقیح، تراش و خراش، اور کلام کا سنوارنا لیا ہے۔ اس سے قبل جاحظ اور اصمعی نے تقریباً اسی مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اصمعی کا ایک قول حطیئہ اور زہیر کے سلسلہ میں ابن قتیبہ نے خود نقل کیا ہے[۱۵] جاحظ نے اصمعی کا ایک قول نقل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ہر وہ شاعر جس نے اپنے تمام شعر میں فنی خوبی پیدا کیا ہے۔ شعر کہنے سے پہلے اس نے غور و فکر سے کام لیا ہے۔ اور قصیدہ کے سب کے سب اشعار کو یکساں فنّی معیار پر لانے تک غور و خوض اور

سنوارنے کا کام کیا ہے[16] غرض کہ جاحظ اور اصمعی کے نزدیک تکلف کا بنیادی مفہوم یہی ہے جو ابن قتیبہ کا ہے۔ یعنی وہ ایک فنی عمل ہے ۔۔۔ محمد مندور بھی اس بات کو طہ احمد ابراہیم کے حوالے سے تسلیم کرتا ہے کہ شعر میں بدیع یا بلاغت یا ظاہری جمالیاتی خوبی اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب شعر دو مرحلے سے گذرے ایک فکر دوسرے اس کی تحسین و تزیین کے مرحلہ سے[17] اور یہ فنی عمل شاعری یا فن کے لیے کوئی عیب نہیں ہے۔

اس بنیاد پر محمد مندور کی تحریروں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ مندور نے زہیر اور حطیئہ کی شاعری کے سلسلہ میں جس بات کو عیب قرار دیا وہ درحقیقت عیب نہیں ہے بلکہ "تکلف" کے مفہوم اور معنوی استعمال کا بنیادی فرق ہے۔

عبدالسلام عبدالحفیظ عبدالعال کے حوالہ سے ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر علی عمار نے اپنے تحقیقی مقالہ میں ابن قتیبہ کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ ابن قتیبہ نے تکلف کو کئی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تکلف سے مراد شعر کا عمدہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں تکلف کا مفہوم فنی عمل اور فن کاری ہے اور اس کی دوسری قسم "ردئ الصَّنعَۃ" یعنی فن کے معیار پر نہیں ہے[18] علی عمار کی یہ اپنی تاویل ہے ورنہ ابن قتیبہ نے تکلف کو جس مفہوم میں استعمال کیا ہے وہ واضح ہے کہ تکلف سے مراد.. دور جدید کا معنی تصنع نہیں ہے۔ بلکہ ایسا فنی عمل اور شاعری مراد ہے۔ جو فی البدیہہ نہیں کہی گئی ہے بلکہ اس کو مکمل شکل میں پیش کرنے سے پہلے شاعر احساسات اور فکر و خیال کی ترجمانی کے لیے بہتر سے بہتر اسلوب، پیرایۂ بیان، طرز ادا، تقدیم و تاخیر، زبان و بیان کی صحت پر غور و فکر اور بار بار کے امعان نظر کا جو عمل انجام دے وہ تکلف ہے۔ اور جو شعر اس مرحلہ سے گذرے اسے متکلّف کہا گیا ہے اور جو شاعر ایسا کرے اسے متکلّف کہا گیا ہے اور ابن قتیبہ کے نزدیک دوسرے درجہ کی شاعری ہے۔

مشاعر بطوع کا مفہوم ابن قتیبہ کے نزدیک یہ ہے کہ شاعر فطری طور پر قادر الکلام ہے وہ شعر برجستہ کہنے پر قادر ہوتا ہے۔ اور اس کی شاعری طبع زاد ہوتی ہے اس کو شعر کو صوری و معنوی اعتبار سے مکمل طور پر پیش کرنے میں کسی تنقیح یا تہذیب کے مرحلہ سے گذرنے

کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ احساسات و جذبات، افکار و معانی شاعر میں اس طرح موجزن ہوتے ہیں کہ شاعر طبعی طور پر شعر کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس میں آمد ہی آمد ہوتی ہے ایک مصرع کہتے ہی دوسرا مصرع سیل رواں کی طرح سامنے آجاتا ہے اور اس میں شاعرانہ جمالیاتی کیفیت بغیر تہذیب کے پیدا ہوتی ہے۔ فطری طور پر رعنائی جمال اور جمالیاتی عناصر پوری شعریت کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ افکار و معانی کے لیے فکری کاوش یا معنوی تجسس کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ الفاظ و معانی شاعر کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور شاعر جب جس طرح چاہے اسے شعری سانچہ میں ڈھالتا ہے۔ فکر و خیال اور زبان و بیان پر اس قدر اس کو قدرت حاصل ہوتی ہے کہ شاعر بآسانی ایسا فن پیش کرتا ہے جس میں حسن دلآویزی اور تاثیر کلام بیک وقت پائی جاتی ہے۔
ابن قتیبہ رقمطراز ہے:۔

> "شاعر مطبوع وہ ہے جو شعر (کہنے پر) قادر اور قوافی پر اس کی گرفت ہے۔ شعر کے پہلے مصرعہ میں اس کے دوسرے مصرعہ کی کیفیت آپ کے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے ابتداء ہی میں اس کے قافیہ کا اندازہ ہوجاتا ہے اس کے شعر میں فطری حسن اور دلکش اسلوب نمایاں ہوتا ہے اور جب اس سے برجستہ شعر کے لیے کہا جائے تو اس کی زبان نہ لڑکھڑائے"۔ [۱۹]

ابن قتیبہ نے جس قسم کی شاعری کے لیے مطبوع کی تعبیر استعمال کی ہے اس کو ارتجال کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ شعر مطبوع کے دوسرے اوصاف کے ساتھ اس نے ایسی شاعری کے شاعر کے لیے یہ بھی قید لگائی ہے کہ جب امتحاناً شاعر سے کسی بھی موضوع یا خیال کو ادا کرنے کے لیے کہا جائے اور وہ برجستہ شعر کہہ دے تو وہ مطبوع ہے۔ حالانکہ جب فرمائش پر یا موقع محل سمجھ کر شاعر برجستہ شعر کہے۔ اور شعر اپنے تمام محاسن شعری کا حامل ہو تو یقیناً وہ شعر مرتجل بھی ہو سکتا ہے یعنی جسے عام اصطلاح میں مرتجل یا ارتجال سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے اسی کو طبع اور مطبوع سے تعبیر کیا ہے۔
شعر مطبوع کا ذکر کرتے ہوئے ابن قتیبہ نے ایک بات یہ بھی کہی کہ شعراء کے طبائع

مختلف ہوتے ہیں اس لیے ہر ایک صنف شاعری پر ان کی طبیعت یکساں نہیں چلتی ہے۔ اور ہر ایک شاعر مرتجلاً صنف شاعری پر طبع آزمائی نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اچھا شعر کہہ سکتا ہے۔ اس کی طبیعت خاص صنف کے علاوہ دوسری صنف شاعری پر جولانی طبع کا اظہار نہیں کر سکتا ہے۔ بعض شعراء مدحیہ قصائد، بعض ہجو گوئی، بعض مراثی اور بعض غزل گوئی پر زیادہ قادر ہوتے ہیں، اور ان کی طبع زاد مرتجل شاعری ان ہی اصناف تک محدود رہتی ہے۔ اس کی مثالیں کثرت سے شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

ابن قتیبہ کے تنقیدی مباحث کا ایک اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ اس نے وجدان و شعور کو شعر کے معنوی محاسن کا ایک لازمی جز قرار دیا ہے۔ اس نے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ انسان فطری طور پر حالات سے متاثر ہوتا ہے، اس کی زندگی میں خوشی و مسرت کے مواقع بھی آتے ہیں، غم اور حزن و ملال کے لمحے بھی آتے ہیں۔ کہیں امید کی گھڑیاں بھی آتی ہیں، مایوسی اور قنوطیت کے اوقات بھی آتے ہیں۔ فطری شاعر جو فطری طور پر حساس ہوتا ہے یہ نفسیاتی کیفیات اور حالات مختلف کیفیت میں اس کے وجدان اور عاطفہ کو ابھارتے ہیں۔ اور شاعر شدت احساس کی کیفیت میں تخیل و فکر کو ترتیب دے کر معانی کا گلدستہ الفاظ کے گل و بوٹے کے ساتھ سجاتا ہے۔ شعر گوئی کے لیے احساسات کو بیدار کرنے کے عوامل پر بحث کرتے ہوئے ابن قتیبہ رقمطراز ہے کہ شراب یا طرب، طمع یا غضب یا شوق، شعر گوئی کے لیے شاعر کے جذبہ کو ابھارتا ہے تو وہ شعر کہتا ہے[۲۰]۔ اس کے بعد اس نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کئی شعراء کی مثالیں دی ہے۔

ابن قتیبہ اس نقطہ کو تو سمجھ سکا کہ انسانی جذبات و احساسات شعر گوئی کے لیے اہمیت کے حامل ہیں اور شعر گوئی کا سبب بنتے ہیں لیکن اس نے انسانی جذبات کے ابھارنے اور احساسات کے تار کو چھیڑنے کے جو اسباب یہاں بیان کئے ہیں ان میں غضب اور طمع کو بھی شامل کیا ہے یہ ادبی ذوق و مذاق اور شعر گوئی کے اصول کے خلاف ہے مال و دولت کی حرص اور غیر شریفانہ رویہ پر شاعر کے جذبات برانگیختہ ہو جائیں اور شعر وجود میں آجائے یا اس طرح نشہ کی حالت میں عمدہ فکر و خیال کا وجود میں آنا کوئی ممکن بات نہیں ہے اور اس

کی وجہ سے ایسی شاعری وجود میں آئی جس سے شریفانہ جذبات اور پاکیزہ جمالیات کا اظہار بھی ہو۔ شاید ہی ممکن ہو۔ اس لیے جن نفسیاتی کیفیات کو ابن قتیبہ نے شعر گوئی کا داعی اور باعث قرار دیا ہے۔ ادبی مذاق اور اصول کے خلاف ہے۔ بنت الشاطی نے اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب جذبہ پاکیزہ نہیں ہے۔ اس کے عوامل پاکیزہ نہیں ہیں تو یقیناً ان کی وجہ سے جو خیال وفکر وجود میں آئے گا وہ بھی پاکیزہ نہیں ہوگا۔[۲۱]

اس کے بعد ابن قتیبہ نے جو بات کہی ہے وجدان وعاطفہ اور انسانی نفسیات کے جس پہلو پر غور کیا ہے بنیادی اصولی طور پر اہم ہے۔ اور شعری تنقید کے لیے اصول فراہم کرتی ہے۔ شاعر کی نفسیاتی کیفیت کا مزید تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بسا اوقات آسان خیال کا اظہار مشکل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی آسان مشکل ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ انسانی . . نفسیات پر مختلف عوارض کام کرتے رہتے ہیں اور نفسیات مختلف چیزوں سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمان ومکان بھی انسانی جذبہ وشعور پر اثر انداز ہوتے ہیں اگر کوئی جگہ ایسی ہے جہاں مناظر خوبصورت ہیں۔ زمین سرسبز وشاداب ہے۔ باغات حسین ہیں یا کوئی قدرتی حسین علاقہ ہے۔ جس میں خوبصورت درخت، نوع بنوع اور رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں۔ صاف وشفاف چشمے اُبل رہے ہیں۔ نہریں بہہ رہی ہیں۔ اور آبِ رواں مدھم نغمے چھیڑتے ہوئے جاری ہے۔ اس باغ وبہار اور قدرت کے حسین مناظر پر جب فطری اور حساس شاعر کی نظر پڑتی ہے تو اس کا وجدان اس کو شعر کہنے کے لیے بے چین وبے قرار کر دیتا ہے۔ نفسیاتی کیفیت شعر گوئی کے لیے اسے مجبور کر دیتی ہے۔ اور کسی بہتے ہوئے چشمے کی طرح شعر رواں ہو جاتے ہیں۔ موسم بہار ہو تو شاعر کی طبیعت کچھ اور ہی ہوتی ہے ـــــ اگر اس کے برخلاف ہو تو طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اور شعر کہنا دشوار ہو جاتا ہے۔[۲۲]

ابن قتیبہ نے انسانی نفسیات، شاعرانہ تخیل، وجدان واحساس اور زمان ومکان کے متاثر کرنے والے عوامل کو شعر کی تنقید کے اصول کی حیثیت سے پہلی بار عربی تنقید میں شامل کیا ہے۔ یہ اس کے شعری ذوق اور ادبی تنقیدی نقطۂ نظر

کی واضح علامت ہے۔

ابن قتیبہ نے بعض اور جزئی مسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔ بعض تنقیدی اصول اور نظریاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ شعراء کے تراجم میں بعض بنیادی نقاد کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ لیکن جن اہم بنیادی باتوں کی طرف مقدمۂ الشعر والشعراء میں اشارہ کیا ہے اس کا جائزہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا اور ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد مندور نے کہا تھا کہ ابن قتیبہ نے ان کو اصولی کی حیثیت سے وضع کرنے کی کوشش کی ہے[۲۳] ابن قتیبہ نے کتاب کے مقدمہ میں اور شعراء کے تراجم اور ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے جن تنقیدی مباحث کو پیش کیا ہے محمد مندور خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ واقعہ ہے کہ "ابن قتیبہ کی شخصیت ایسی تھی جس کی اپنی مستقل رائے ہوتی تھی، ادب کے میدان میں عربوں کی تقلید یا روش کے سامنے جھکنے والے نہیں تھے، ان کی (تنقیدی) رائے اور فیصلہ پر اعتبار بھی کرنے والے نہیں تھے اور اس کے زمانہ میں جو ادبی خیالات و افکار عام تھے ان سے مطمئن نہیں تھے"[۲۴]

اور یہ حقیقت ہے کہ ابن قتیبہ نے جس تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس کی بالغ نظری اور جامعیت پر دلیل کرتا ہے۔ اپنے عہد کے اعتبار سے اس کے تنقیدی نظریات ترقی یافتہ تھے، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اس کے افکار و خیالات میں جدّت کی روشنی ہونے کے باوجود اس کے عقل و دماغ پر قدامت اور تقلید کا اثر غالب تھا۔ بیک وقت مسجد و میخانہ دونوں کا حج کرنا چاہتا تھا۔ عربوں کے قدیم ورثہ کے معیار کو باقی رکھنے کے خیال اور علوم عقلیہ پر مہارت نے اس کے تنقیدی افکار کو وہ برگ و بار لانے کا موقع نہیں دیا۔ جس کی توقع ابن قتیبہ کے عملی مطالعہ اور فکری وسعت سے کی جا سکتی تھی، پھر بھی ادبی تنقید کے میدان میں اس کا ایک حصّہ ہے۔ محمد مندور کی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب کچھ کے باوجود وہ ناقد نہیں ہے اس لیے کہ ناقد وہ ہے جو نصوص پر اصول کی طرح تطبیق کرتا ہے اور مختلف اسالیب کے مابین فرق کرتا ہے[۲۵]
محمد مندور کا یہ خیال اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن اسی محمد مندور نے تنقیدی منہج کی

تلاش ابن قتیبہ کے منتشر افکار و خیالات میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور عربی..
تنقید کے ارتقاء میں ایک کڑی کی حیثیت سے جوڑنے کی سعی کی ہے۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ ابن قتیبہ ناقد ضرور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کے عہد کے ناقدین کے معیار
پر نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس ارتقائی عہد میں اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔

حواشی

لہ۔ عبد السلام عبد الحفیظ عبد العال۔ نقد الشعر بین ابن قتیبۃ وابن طبا طبا العلوی (دار الفکر العربی، قاہرہ ۱۹۷۸ء) ص ۱۶۔ ۲ہ۔ ایضاً ص ۱۰۹۔
۳ہ۔ ڈاکٹر محمد طاہر درویش۔ فی النقد الأدبی عند العرب (دار المعارف۔ قاہرہ ۱۹۷۹ء) ص ۱۹
۴ہ۔ ابن قتیبہ:۔ الشعر والشعراء تحقیق احمد محمد الشاکر (دار المعارف، قاہرہ ۱۹۸۲ء) الجزء الاول ص ۵۹۔ ۵ہ۔ ڈاکٹر محمد مندور۔ النقد المنہجی عند العرب (دار مصر) ص ۲۲۔
۶ہ۔ الشعر والشعراء (مطبعۃ بریل) ص ۲۔ ۷ہ۔ النقد المنہجی عند العرب ص ۳۳۔ ۸ہ ایضاً ص ۳۴، ۳۵۔ ۹ہ۔ محمد زکی العشماوی: قضایا النقد والبلاغۃ (دار الکتاب العربی ۱۹۶۷) ص ۲۸۱
۱۰ہ۔ عبد السلام عبد الحفیظ عبد العال ص ۲۳۲۔ ۱۱ہ۔ الشعر والشعراء (قسطنطینیۃ ۱۲۸۲ھ) ص ۷۔ ۸۔ ۱۲ہ۔ ایضاً ص ۱۱۔ ۱۳ہ۔ ڈاکٹر عز الدین اسماعیل: الاسس الجمالیۃ فی النقد العربی (دار الفکر العربی ۱۹۷۴) ص ۱۴۹۔ ۱۴ہ۔ النقد المنہجی عند العرب ص ۳۹۔
۱۵ہ۔ الشعر والشعراء (قسطنطنیہ ۱۲۸۲ھ) ص ۸۔ ۱۶ہ۔ جاحظ البیان والبیین۔ (قاہرہ ۱۹۶۱) ۱۳/۲۔ ۱۷ہ النقد المنہجی عند العرب ص ۳۷۔ ۱۸ہ عبد السلام عبد الحفیظ عبد العال ص ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۹ہ الشعر والشعراء (قسطنطینیۃ ۱۲۸۲ھ) ص ۱۲۔ ۲۰ہ ایضاً ص ۹۔ ۲۱ہ بنت الشاطی۔ قیم جدیدۃ الادب العربی ص ۵۷۔
۲۲ہ۔ الشعر والشعراء ص ۹۔ ۲۳ہ النقد المنہجی عند العرب ص ۲۲۔
۲۴ہ ایضاً۔ ۲۵ہ۔ ایضاً ص ۴۶۔

مصر میں عربی صحافت کی ابتداء

"امتیاز احمد اعظمی ریسرچ اسکالر شعبہ عربی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی"

(۱)

یہ حقیقت ہے کہ یکجا اور ایک سماج وسوسائٹی میں رہنے والے لوگ ابتداء ہی سے اس بات کے خواہاں رہے ہے کہ ان کو دوسرے لوگوں، دوسرے معاشرے، ایک دوسرے ملک کے حالات وکوائف، دہاں کی تہذیب وتمدن، اور وہاں پیش آنے والے روزمرّہ کے واقعات سے آگاہی حاصل ہو۔ اگرچہ ذرائع ابلاغ کی کمی اور وسائل نشریات کی ایجاد نہ ہونے کی وجہ سے خبر رسانی اور ابلاغ ونشریات کا کام بحسن وخوبی انجام نہ پاسکا۔

دنیائے عربی میں خبر رسانی کا فریضہ زبانی، مکتوبہ بھیج کر، یا کسی چیز پر کوئی خاص بات لکھ کر کسی مشہور جگہ پر لٹکا کر انجام پاتا، چنانچہ قدیم عرب میں یہ بات صاف طور پہ نظر آتی ہے کہ ہر فرد ایک دوسرے شخص کے بارے میں، اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے معاملات سے جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شعراء تو قدیم دور میں صحافتی کام کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہر بات اور ہر خبر سے وہ لوگوں کو باخبر کرتے۔ دراصل ان کو وہی نمایاں مقام اور امتیازی مرتبہ حاصل تھا جو عصر نو میں صحافی حضرات کو حاصل ہے۔ اس طرح جاہلی شعروشاعری اس دور کی صحافت کے مانند نظر آتی ہے اور ایک شاعر ایک صحافی کی طرح خبر رسانی کا کام کرتا دکھائی پڑتا ہے۔

صدرِ اسلام اور اموی دور میں خبر رسانی اور اپنی بات کو ایک دوسرے تک پہونچانے

کے ذرائع و وسائل میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ فنِ کتابت کی ایجاد کے باعث خبر رسانی کا کام تحریری شکل میں ہونے لگا اور رسائل کے ذریعہ یہ کام انجام پایا۔ قرآن نے اس فن کو مزید تقویت پہونچائی۔ خبر رسانی کی اہمیت و افادیت سے لوگ آشنا ہوئے۔ عرب جاہلی قوم جن حالات و کوائف تہذیب و تمدن، اور جن ادوار سے گذری، قرآن نے لوگوں کو ان سے چیزوں سے باخبر کیا گویا کہ اس کتاب (قرآن) نے ایک صحیفہ اور جامع رسالہ کی شکل میں خبر رسانی کا فریضہ انجام دیا۔

اس دور میں رسائل نے خبر رسانی، ایک فرد کی بات دوسرے تک پہونچانے اور ایک خطہ کے حالات سے دوسرے علاقہ کے لوگوں کو باخبر کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ خلفاء کے عہد میں اس کا عام چلن ہوا۔ رسائل خلفاء کی جانب سے مختلف جگہوں پر گورنر اور وزیروں کے پاس جاتے۔ خاص طور پر حضرت علیؓ اس میدان میں کافی شہرت یافتہ ہوئے۔

عہد عباسی میں فن کتابت اور تحریر کا باقاعدہ رواج ہوا۔ خیالات و جذبات اور واقعات و حادثات کو قلمبند کیا جانے لگا۔ تحصیل علم و فن اور تاریخ نویسی کا عام چلن ہوا اس طرح ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے رہن سہن، تہذیب و تمدن، سیاست و معیشت اور علم و فن سے واقف ہوئے اور خبر رسانی کے وسائل و ذرائع میں کافی اضافہ ہوا، لیکن اس فن کا آغاز نہیں ہوا جو آج صحافت کے نام سے معروف و مشہور ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان نے جب سے ایک سوسائٹی، ایک سماج اور ایک معاشرہ کی شکل میں رہنے کی ابتداء کی، اس کے اندر فطرتاً یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے ماسوا دوسروں کے بارے میں بھی خبر رکھے، چاہے وہ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا۔ چنانچہ مغرب کے لوگ بھی اس صنعت سے عاری نہیں رہے اور ان کے یہاں بھی یہ کام مختلف طریقوں سے انجام پاتا رہا۔

جدید صحافت

ابلاغِ عامہ کا وہ فن جسے آج صحافت کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کا سماج و معاشرہ سے بے انتہا تعلق ہے، جس کو انسانی سوسائٹی میں غیر معمولی قدر و منزلت

حاصل ہے اور جس نے سماج و معاشرے کی اصلاح، قوم و وطن کی سلامتی اور رائے عامہ کی استواری میں اہم رول ادا کیا، اس کا آغاز مغرب میں مشرق سے قبل ہوا۔ یوربی ممالک اور مغربی دنیا نے مشرقی ممالک اور خاص طور پر دنیائے عرب سے بیشتر ترقی کی۔ جدید علم و فن کے باعث اس کے پاس مختلف قسم کی مشینریاں اور چیزیں ایجاد ہو چکی تھیں چنانچہ ہر میدان میں مغرب مشرق سے فوق تر تھا۔

اسی طرح فن صحافت کی بادِ نسیم سے مغربی سرزمین کافی پہلے سے محظوظ ہو رہی تھی اور اس وقت مصر اور دوسرے عرب ممالک اس فن سے بالکل نا آشنا تھے۔ مصر میں اس فن کی ابتداء فرانسیسیوں کی آمد سے ہوتی ہے۔ یہ آمد ۱۷۹۸ء میں ہوئی۔ نپولین بوناپارٹ نے مصر کو جدید علم و فن سے روشناس کرنے میں ایک بنیادی اور کلیدی رول ادا کیا۔ مختلف علم و فن کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی وادی مصر آشنا ہوئی اور پریس بھی قائم ہوا جس نے فن صحافت کی تخم ریزی کرنے اور اس کو نشو و نما دینے میں مثالی کردار ادا کیا۔ جنرل بوناپارٹ نے اپنی آمد کے ساتھ اسکندریہ میں ایک پریس کے قیام کا حکم دیا۔ چنانچہ یہ پریس "المطبعہ الاھلیہ" کے نام سے قائم ہوا۔ یہ وہ عظیم نعمت تھی جو مصریوں کو حاصل ہوئی اور جس سے علم و فن اور صحافت کی شمع روشن ہوئی۔

صحافت کے میدان میں پریس نے عظیم خدمت انجام دی۔ رسائل و جرائد کی طباعت و اشاعت میں پریس نے وہ کارنامہ انجام دیا جو کام ایک طرح سے مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس قدر اخبارات و جرائد کا نکلنا، اور اتنی سرعت رفتاری کے ساتھ اخبار نویسی کا چلن پریس کے بغیر ناممکن تھا۔

دراصل عربی صحافت کے آغاز و ارتقاء کا دور وادئ مصر ہی سے شروع ہوتا ہے۔ معمولی عرصہ میں مصر کی عربی صحافت نے مثالی ترقی و شہرت حاصل کر لی۔ یہاں کی عربی صحافت، دیگر عرب ممالک سے نمایاں ہے، بلکہ فن کے اعتبار سے یہاں کی صحافت مغربی صحافت سے کسی قدر کم نہیں۔ صحافت کے جو اصول و مبادی اور قواعد و ضوابط ہیں تمام تر مصری صحافت میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ واقعات و حادثات کی رپورٹنگ میں وہ تمام

ذرائع اور راستے اپنائے جاتے ہیں جو مغرب میں رائج ہیں۔ ان واقعات و حادثات کو بہترین شکل میں پیش کرنے کے علاوہ بہترین افتتاحی کلمات، مایہ ناز فنکاروں اور محققین کے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی فضا میں بھی اس کی زینت و زیبائش میں اضافہ کرتے ہیں۔

ہر اخبار یا مجلہ کی ادارت کے لیے ایسے صاحب علم و فراست کا انتخاب ہوتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل و بہتر ہو۔ خود مصر کا ہر فرد اخبارات و جرائد سے غیر معمولی تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت تمام مصری اخبارات اپنی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ بہترین خبروں، دلفریب تصویروں، علم و جانکاری سے پر مقالوں اور طباعت کی صفائی و ستھرائی کے اعتبار سے صحافت کے میدان میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر کچھ تفصیلی بحث ضروری معلوم پڑتی ہے۔

پہلا دور

مصر میں صحافت کا آغاز ایک فرانسیسی اخبار LE COURRIERDE L, EGYPT. "برید مصر" سے ہوا۔ فرانسیسی زبان کا یہ پہلا اخبار ہے جس کو فرانسیسیوں نے ۱۷۹۸ء میں مصر میں آنے کے بعد نکالا۔ یہ خالص سیاسی اخبار تھا جس میں سیاسی چیزیں، اور حکومت کی کاروائیاں شائع ہوتی تھیں۔ یہ ہر پانچویں دن شائع ہوتا۔

دوسرا فرانسیسی اخبار LADECADE EGYPTIANNE "العشریۃ المصریہ" ہے۔ دونوں اخبار کی اشاعت تقریباً ایک ساتھ ہوئی۔ یہ اخبار ہر دسویں دن نکلتا۔ یہ ایک علمی و ادبی اخبار تھا۔ زراعت و تجارت سے متعلق چیزیں شائع ہوتیں۔

مصر میں "عربی صحافت" کا آغاز بھی فرانسیسیوں کے ہاتھوں ہوا، اور عربی اخبار جو وادی مصر سے نکلا اس کا سہرا بھی ان کے سر جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں انھوں نے "التنبیہ" کے نام سے ایک عربی جریدہ نکالا۔ خاص طور پر اس میں فرانسیسی حکومت کی کارکردگی اور اس کے ترقیاتی منصوبوں، پلان، کا ذکر ہوتا۔ چونکہ نپولین مصریوں کو اپنے سے قریب تر کرنے اور ان کی جانب سے حسن ظن حاصل کرنے کا خواہاں تھا، اس لیے اس اخبار کے ذریعہ اس نے لوگوں کی مقبولیت حاصل کرنے اور خاص لوگوں کو ساتھ

لے کر چلنے کی کوشش کی۔

بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ فرانس نے اہلِ مصر کو عربی صحافت سے روشناس کیا۔ اور جریدہ "التنبیہ" کے ذریعہ عربی اخبار نویسی کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا نگراں ایک فرانسیسی تھا اور اس کی ادارت کی ذمہ داری ایک مصری کاتب اسماعیل الخشاب کو حاصل تھی۔ یہ جریدہ تقریباً دو سال تک برابر نکلتا رہا[۵] اور ۱۸۰۱ء میں فرانسیسیوں کے چلے جانے کے ساتھ اس کی اشاعت بند ہوگئی۔

وادیٔ مصر سے فرانسیسی اقتدار کے خاتمہ کے بعد ۱۸۲۷ء میں محمد علی پاشا نے اخبار "جورنال الجدیو" نکالا اور اس کی ادارت محمود افندی نے انجام دی۔ اس کی ۱۰۰ کاپیاں شائع ہوئیں۔ یہ حکومت کی تحویل اور زیرِ نگرانی نکلتا۔ عربی اور ترکی دونوں زبانوں میں نکلتا۔ اس میں عام طور پر حکومت کی کارکردگی، منصوبے، اور اس کی کامیابیاں منظرِ عام پر آتیں۔ الف لیلہ ولیلہ کے قصے بھی چھپتے۔ یہ پہلا مصری سیاسی اخبار تھا اور خاص لوگوں کے پاس بھیجا جاتا اور عام لوگوں کا اس سے کوئی خاص ربط نہیں ہوتا تھا۔ ۱۸۲۸ء میں یہ اخبار "الوقائع المصریۃ" کے نام سے نکلنے لگا۔ اب اس میں سیاسی خبروں اور حکومت کی پالیسیوں کے ساتھ دوسری خبریں اور پیش آنے والے واقعات بھی شائع ہونے لگے۔ کچھ مقالے اور مضامین بھی منظرِ عام پر آنے لگے۔

یہ جریدہ ۱۸۸۶ء تک مصر میں ہر دلعزیز رہا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کے بعد ہفتہ میں صرف تین روز شائع ہونے لگا۔ سماجی و معاشی چیزوں کا زیادہ تذکرہ ہونے لگا۔ عمرانی مسائل پر مباحث لکھے جاتے اور عوام کی بہبودی، اصلاحِ معاشرہ اور تہذیب سماج کے لیے تعلیم کی اہمیت اور بالخصوص تحصیل علوم غربیہ پر زور دیا جاتا۔ بعد ازاں حکومت نے اپنے مفاد اور مصلحت کے پیشِ نظر اس جریدہ کو سرکاری گزٹ کی حیثیت دے کر سہ روزہ کر دیا۔

۵۔ ڈاکٹر عبد اللطیف حمزہ کے مطابق اس اخبار کو منظرِ عام پر آنے کا موقع حاصل نہ ہو سکا۔ "ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر، جزء ۱، ص ۴۵"

اس کی ادارتِ تحریر پر نظر ڈالتے ہیں تو نمایاں قلمکاروں، صائب الرائے مفکروں اور بہترین و تجربہ کار انشاء پردازوں کی شخصیات نظر آتی ہیں۔ رفاعہ کی مایہ ناز شخصیت سے قبل اس کی ادارت کی ذمہ داری شیخ حسن العطار اور شیخ شہاب الدین کے پاس رہی۔ اس کی ایڈیٹری ہمیشہ ماہر و اکمل فرد کے ہاتھوں میں رہی۔ احمد فارس الشدیاق، شیخ احمد عبدالرحیم، شیخ مصطفی سلامہ، صالح مجدی بک، شیخ محمد عبدہ اور سعد زغلول جیسے ماہرین علم وفن اور محبّانِ وطن اس سے وابستہ رہے۔ اُن میں سے ہر ایک پختہ فکر و نظر کا حامل تھا۔ یورپ کے اثرات اور مغرب کے سفروں نے ان کے لیے فکر و نظر کے نئے زاویئے بنا دیئے تھے۔ ان کی سوچ و فکر جدید مغربی آب و ہوا سے آشنائی تھی، اس لئے یہ جریدہ روز افزوں مقبولیت و شہرت کا حامل ہوتا گیا۔ اس میں غیر معمولی علمی و فنی مباحث ہوتے، سماجی اور سیاسی مسائل کا بھی تفصیلی تذکرہ ہوتا جس کے باعث ہر خاص و عام کے لیے یہ جریدہ یکساں طور پر مفید اور باعث دلچسپی ثابت ہوا۔

چونکہ یہ اخبار محمد علی پاشا کے حکم اور منشا سے نکلنا شروع ہوا، اس لئے اس کی چھپائی و تقسیم کا کام بھی اس کے مشورہ سے ہوتا۔ ابتدائی دور میں اس کی بہت کم کاپیاں نکلتی تھیں۔ اور یہ کاپیاں حکومت کے ذمہ داروں، عہدیداروں، وزیروں، عالموں اور خاص طالب علموں کے پاس بھیجی جاتی تھیں۔ محمد علی نے اس میدان میں کافی دلچسپی دکھائی تاکہ وہ خاص لوگوں کو اپنی پالیسی اور نظام سیاست کے موافق و متفق بنا سکے۔ اس کے نزدیک یہ بات اہم تھی کہ خاص لوگ بمقابلہ عام لوگوں کے اس کی جدید پالیسی اور نئے دستور سے روشناس ہوں۔ الغرض اس کی تشہیر و اشاعت میں اس نے اہم رول ادا کیا جس کی جانب ابراہیم عبدہ اشارہ کرتے ہیں۔

"محمد علی نے اس جریدہ کی نشر و اشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ اگرچہ اس کا مقصد اپنے فرمانوں اور حکموں سے لوگوں کو آشنا کرنا تھا اور اپنی تعریف و مدح سرائی کرانا۔ اس میں کام کرنے والوں کی تقرری اور تنخواہیں دینے کا کام خود انجام دیتا۔ اس بات کی بھی کوشش کی کہ اس کی نشر و اشاعت پورے جزیرۂ عرب، شام اور

روم و ایران تک ہو۔ مغربی ممالک میں بھی اس جریدہ کو بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ اس کے نمائندے باہر ملکوں میں بھی گئے۔ پاشا اپنے اس کام میں کافی حد تک کامیاب ہوا اس میں اس کی سیاسی پالیسی اور اس کی اصابت رائے کی تشہیر کے لیے مضامین و مقالے شائع ہوئے جن کے ذریعہ اس کی شخصیت کو جمہور کی نظر میں پسندیدہ و قابل ستائش بنانا تھا۔ ایسے مقالے شائع ہونے سے قبل محمد علی کے سامنے پیش کئے جاتے اور جب اس کی جانب سے پسندیدگی کا اظہار ہو جاتا تو یہ شائع کئے جاتے۔" لہ

ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ نے اس جانب اشارہ کیا ہے۔

"محمد علی اس جریدہ کا ذمہ دار و نگراں تھا۔ خبروں کی اشاعت و طباعت سے قبل وہ ان پر نظر ثانی کرتا۔ گویا کہ وہ خبروں کی "تصحیح" کا ذمہ دار تھا۔ اس میں لکھنے والوں اور ایڈیٹر سے وہ باقاعدہ کہتا کہ وہ اس کی مدح و ستائش میں مضامین لکھیں۔ ملک میں اس کی نمایاں و روشن کارکردگی کا تذکرہ کیا جائے۔ چنانچہ افتتاحی کلمات اور اداریہ پاشا کی تعریف کے لیے وقف تھا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ محمد علی کے نظریۂ سیاست اور اس کی اصلاحی و تعمیری کارکردگی کو بیان کرنے کے لیے یہ جریدہ بہترین ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔" ٹہ

الغرض محمد علی نے اس جریدہ کی تحسین و تشہیر میں مثالی رول ادا کیا۔ اس نے نمایاں انداز میں اس کو نکلنے کا موقع عطا کیا اسی حسن و خوبی کے ساتھ یہ نکلتا رہا۔ ہمیشہ اس کی ادارت و نگرانی زمانہ کے مایہ ناز مفکروں اور عالموں کے ہاتھ میں رہی۔ خاص طور پر رفاعہ طہطاوی نے اس کو نشاۃ ثانیہ میں داخل کیا اور اس کو شہرت کے بلند ترین مقام تک پہونچایا۔ چنانچہ ۱۸۴۱ء میں جب انھوں نے اس کی ادارت سنبھالی تو اس کو عہد طفولیت سے نکال کر عہد

لہ۔ اعلام الصحافۃ العربیۃ۔ ص ۱۰-۱۴۔

ٹہ۔ الصحافۃ المصریۃ فی مائۃ عام، ص ۱۳۔

شباب میں داخل کردیا۔ اب اس میں صرف مصری سیاسی وسماجی حالات نہیں ہوتے بلکہ آفاقی خبریں وچیزیں شائع ہونے لگیں۔ دینی کاموں اور رپوٹیں شائع ہونے لگیں۔ عدالتوں کے فیصلے اور مقدمات کی تحریریں بھی ہوتیں۔ وقتاً فوقتاً چیزوں کی قیمتیں بھی نظر آتیں۔ اس اس میں تمام سیاسی وسماجی ومعاشی چیزوں کا تذکرہ ہونے لگا۔ اس طرح رفاعہ نے اپنی صلاحیت وعلمی مہارت کا وافر حصہ اس جریدہ کی نشر واشاعت میں لگایا اور اس کے ذریعہ ملک ووطن کی ہر اعتبار بہترین خدمت انجام دیں۔

دوسرا دور

صحافت کا دوسرا دور روشن وتابناک دور محمد اسماعیل پاشا کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے ۱۸۴۷ء میں محمد علی پاشا کے تخت سیادت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۶۲ء تک بالترتیب ابراہیم پاشا، عباس پاشا اور سعید پاشا کی حکومت رہی۔ ان تینوں کا دور حکومت علم وفن، صحافت وثقافت اور تہذیب وتمدن کے اعتبار سے نہایت مایوس کن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت کی جو لہر وموج چل رہی تھی اس کو بھی باقی رکھا نہ جاسکا چہ جائیکہ اس میں طغیانی پیدا ہو۔

۱۸۶۳ء میں جب محمد اسماعیل پاشا تخت نشین ہوا تو صحافت کو ایک دوسری زندگی حاصل ہوئی۔ خود اسماعیل پاشا نے صحافت کی نشر واشاعت میں اہم رول ادا کیا ہر بندش سے اس فن کو آزاد کیا۔ ہر مصری کو آزادیٔ تحریر وتقریر عطا کی۔ وادی کا ہر فرد آزادانہ طور پر اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کرسکتا تھا۔ اخبارات ورسائل پر کوئی قانونی پابندی قانونی ودستوری گرفت نہ رہی بلکہ سرکاری طور پر ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ خود اسماعیل نے اخبارات ورسائل اور ان کے ایڈیٹروں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کو ہر قسم کی قانونی ودستوری مدد کرنے کے ماسوا صحافت کی اشاعت کو فروغ دینے اور عام کرنے کی خاطر پیرس میں ایک صحافتی کمیٹی قائم کی۔ عربی صحافت کا آغاز مغرب میں بھی کیا۔ جریدہ "الوقائع المصریہ" کو دوبارہ جاری کرایا۔ اس کی اشاعت وشہرت کے لیے کوشاں رہا۔ اس کے اجراء کے لیے سرکاری طور پر انتظام کیا۔

چنانچہ اس جمہوری نظام اور سازگار ماحول میں صحافت غیر معمولی پھیلی اور اس کا عام چلن ہوا۔ صحافیوں نے اس کھلی اور صاف فضا میں میدانِ صحافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بے شمار اخبار و رسائل نکلنے شروع ہوئے۔

۱۸۶۵ء میں ایک ماہنامہ طبی رسالہ محمد علی البقلی نے نکالا۔ اس کی ادارت میں شیخ محمد الدسوقی بھی شامل تھے۔ یہ پہلا علمی، طبی، و عربی رسالہ تھا جو افقِ صحافت پر نمودار ہوا۔ یہ "مجلۃ الیعسوب" کے نام سے مشہور تھا اسی سال سرکاری طور پر دو جریدے "الجریدۃ العسکریہ المصریۃ" اور "ارکان الحرب الجیش المصری" کے نام سے نکلے۔

۱۸۶۶ء میں عبداللہ ابوالسعود کی ادارت میں "وادی النیل" نامی ایک سیاسی، علمی اور ادبی اخبار نکلا۔ یہ سہ روزہ اخبار تھا۔ ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ نے بھی اسے ایک سیاسی و علمی جریدہ بتایا ہے جو ہفتہ میں دو بار نکلتا تھا[۵] یہ جریدہ اپنے بانی کی شہرت یافتہ شخصیت کے باعث ہرکس و ناکس کے درمیان نہایت مقبول ہوا۔ اس میں کہنہ مشق قلمکاروں و ادیبوں کے نظریات و مقالات شائع ہوتے گویا یہ کہا جا سکتا ہے یہ وہ پہلا علمی و ادبی اور غیر سرکاری جریدہ تھا جس سے اہل مصر واقف ہوئے۔ اس کا پہلا نمبر ۱۸۶۷ء میں چھپا۔ ۱۸۷۸ء تک یہ متواتر نکلتا رہا اور اپنے بانی کی وفات کے بعد اس کا نکلنا بند ہو گیا۔ اس جریدہ کی متواتر نشر و اشاعت اور اسماعیل کی صحافت سے غیر معمولی دلچسپی، ادیبوں و صحافیوں کو فکر و فن کی مکمل آزادی نے مصری صحافت کو ایک نئی راہ دکھائی۔ آزادیٔ صحافت نے فن اخبار نویسی میں چار چاند لگا دیئے۔ سوچ و فکر کے نئے لب و لہجہ کے ساتھ عبارت کی تزئین و تحسین نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ خبروں کے تفحص و تلاش، تصدیق و تحقیق اور ان کو جلد از جلد عوام کے سامنے لانے کا ذوق عام ہوا۔ ملکی و قومی خبروں کے ساتھ بین الاقوامی خبروں نے بھی صحافت میں جگہ حاصل کر لی۔ اس طرح اخبار نویسی وادیٔ مصر میں رائج و عام ہو گئی۔

---

[۵] ۔ ادب المقالۃ الصحفیہ فی مصر ج ۱، ص ۲۵۔

۱۸۶۹ء میں ابراہیم مویلحی اور عثمان جلال کی ادارت میں ہفت روزہ سیاسی جریدہ "نزھۃ الافکار" نکلا۔ اس میں سیاست وسلطنت کے اصول ومبادی کا تذکرہ ہوا۔ موجودہ سیاسی ڈھانچہ میں تبدیلی لانے کے مسائل پر بحث ہوئی۔ خاص طور پر مغرب کے طور طریقے اور جدید تہذیب وتمدن پر تنقیدی مضامین شائع ہوتے۔ مصر میں مغرب پرستی کی جو سنگین صورتِ حال تھی اور اسماعیلی حکومت کی جو مغرب نواز پالیسی تھی اس پر نہایت تنقیدی نظر ڈالی جاتی۔ چنانچہ خدیوی حکومت کو اس جریدہ سے خطرہ محسوس ہوا اور اس کو بند کر دیا۔ بمشکل سے اس کے دو تین شمارے نکل سکے۔

۱۸۷۰ء میں پندرہ روزہ "روضۃ المدارس" نکلا۔ اس کا اجراء اسماعیل کے ایماء پر ہوا۔ اس کے ذمہ دار علی پاشا مبارک تھے اور اس کے ایڈیٹر شرقی وغربی صحافیوں کے استاد رفاعہ طہطاوی تھے۔ اس میں اسماعیل فلکی، شیخ حسن مرصفی، عبداللہ فکری اور اس طرح کی دوسری مایہ ناز شخصیات کے نظریات وخیالات چھپتے تھے۔ ادب وسماجیات، تاریخ و جغرافیہ، حساب وریاضیات اور دیگر موضوعات سے متعلق مضامین شائع ہوتے۔

اس کا پہلا شمارہ ماہ اپریل میں نکلا۔ اس کی تین سو پچاس سے لے کر سات سو کاپیاں نکلتی تھیں۔ یہ ایک علمی وادبی رسالہ تھا جس میں علم وادب کے متعلق مضامین شائع ہوتے اور خبریں بھی۔ خاص طور پر مدارس و یونیورسٹیوں کے امتحانات اور ان سے متعلق دوسری خبریں ہوتیں۔ اس نے مصری طلبہ کے اندر علم وادب کی روح پھونکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مصری نوجوانوں کو علم وادب کی اہمیت وافادیت اور اس کی وسعت سے روشناس کیا۔ چند سال تک یہ برابر نکلتا رہا۔ اس کے بند ہونے کی تاریخ معلوم نہیں۔

۱۸۷۳ء میں سلیم حموی شامی نے مصر میں آنے کے بعد اسکندریہ شہر سے "الکوکب الشرقی" نامی ہفت روزہ اخبار نکالا۔ اس جریدہ کو کامیابی وشہرت حاصل نہ ہو سکی۔ اور زیادہ دنوں تک نہ نکل سکا۔ بمشکل سے ایک سال نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔

(آئندہ)

حضرت شیخ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح

بعد از ختم قرآن کریم اور دعائے مغفرت کے ایصالِ ثواب برائے روحِ پاک مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کٹرہ نظام الملک دہلی ۶۔
منجانب :۔ مدرسہ دار الاصلاح شاہی مسجد بارگ والی سوہنہ ضلع گوڑگانوہ ہریانہ (بتاریخ ۱۱ رمئی ۱۹۹۱ء)

درسِ اخلاق و محبّت کا سکھایا تو نے
قوم کی شان و عزت کو بڑھایا تو نے

بے نوا بیکس و مظلوم کا معاون بن کر
ظلم کو جادۂ انصاف دکھایا تو نے

انسانی تاریخ میں جن لوگوں کو عزّت و شرف کا مقام حاصل ہوا ہے وہ لوگ ہیں جنہوں نے انسانیت کو کوئی درسِ ہدایت دیا یا کوئی صحیح راہنمائی کی اور راہِ راست دکھلانے کی کوئی خدمت سرانجام دی ہو انہی کا احسان مانا انہی کی عزّت کی اور انہی کے نام کو محبت سے یاد کیا۔ مرحوم بھی ان میں سے ایک شخصیت ہے یہ صحیح ہے کہ وہ ایک کارِ نمایاں کے مالک تھے لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ بہت اچھے انسان تھے آج اس دور میں جب اچھے انسانوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں تو ایک بہت اچھے انسان سے جدائی ایک ایسا ناقابلِ تلافی نقصان ہے جسے شاید محسوس تو کیا جا سکتا ہے پوری طرح نہ تو بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔ نرگس جب اپنی بے نوری پر ہزاروں سال رو لیتی ہے تب جا کر دنیا کے چمن میں ایسی دیدہ ور شخصیت پیدا ہوتی ہے جن میں ایک مرحوم تھے۔

جن میں اخلاق و محبت مروّت و شفقت اور ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا کسی کے دکھ کو برداشت نہیں کر پاتے تھے وہ غلط سمجھوتہ کے عادی نہیں تھے اُن کی دلنواز اور جامع شخصیت اُن کی دردمندی، فراخ دلی، عالی ظرفی اور انسان دوستی اُن کی محنت، اُن کی لگن، اُن کی ایمانداری، اُن کی تمام جگہوں پر عزت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اُن کی ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثالیں ہی کیا اُن کی پوری زندگی اُنہیں اوصاف سے عبارت ہے مرحوم میں صبر و استقلال کے اور اخلاق کے وہ اعلیٰ کردار کمالات موجود تھے جو عام انسانوں میں نہیں پائے جاتے مرحوم کی ذات خود ایک معجزہ تھی۔ مرحوم نے سینکڑوں دُشواریوں کے باوجود اپنے اصول اور اسلام کے آئین کی حفاظت کی۔ آپ کی شخصیت بے مثال تھی موصوف اسلامی اخلاق کی زندہ مثال تھے۔ آپ کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُن کی اس صفت کے گرویدہ تھے وہ اچھے ارادہ و عمل کے لحاظ سے کبھی جھکے نہیں اور انہوں نے بے عملی کو کبھی اپنے پاس آنے نہیں دیا آسمان اُن کی لحد پر شبنم افشانی تو کرے گا ہی لیکن اُن کی یاد میں اُن کے چاہنے والوں کی آنکھیں بھی بہت دنوں تک نم رہیں گی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

تیرے حُسنِ سیرت میں ایسی کشش ہے　　　جو انسان سے چھین لیتی ہے دل کو

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی تمام دینی، ملی، قومی خدمات کو بے حد قبول فرما کر آغوشِ رحمت میں چھپا لیں۔ آمین ثُمَّ آمین۔ اور اُن کی پوری پوری مغفرت فرما کر جنّت الفردوس میں مقام عطا فرمائیں۔ آمین ثُمَّ آمین۔ اور جملہ پسماندگان میں اُن کے عزیزوں کو اُن کی پیروی کی توفیق دیں۔ آمین ثُمَّ آمین۔

ہم مر رہے ہیں جس پہ وہ ہے بات ہی کچھ اور　　　عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

احقر:۔ رحمت علی غفرلہٗ، مدرسہ دارالاصلاح، شاہی مسجد بانگ والی سوہنہ "SOHNA"، ضلع گوڑگانوہ، پن کوڈ ۱۲۲۱۰۳، (ہریانہ)

برہان

جلد ۱۰۸ | اکتوبر ۱۹۹۱ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

عبادت گاہوں سے متعلق بل منظور

حال ہی میں پارلیمنٹ نے عبادت گاہوں کے تحفظ سے متعلق قانونی بل اتفاق رائے سے منظور کردیا۔ اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو عبادت گاہوں کی جو پوزیشن تھی اُسے جوں کا توں برقرار رکھا جائے گا۔ بل کا اطلاق جموں و کشمیر پر نہیں ہوگا۔ بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ بھی اس بل کے دائرہ سے خارج ہوگا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حکمراں پارٹی کانگریس آئی کی طرف سے پیش کردہ اس بل پر ایوان میں زوردار بحث ہوئی۔ ایک طرف کانگریس آئی، جنتا دل، نیشنل فرنٹ میں شامل پارٹیوں کے ممبران تھے۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیوسینا جیسی فرقہ پرست پارٹیاں تھیں جن کے ممبران نے بل کی شدید مخالفت کی۔ وزیرِ داخلہ مسٹر ایس۔ بی چوان نے بل پیش کرتے ہوئے اسے ایک بروقت اقدام قرار دیا۔ اور کہا کہ اس بل کے ذریعہ اقلیتوں کے ذہن سے اپنی عبادت گاہوں کے متعلق خدشات دور کرنے میں مدد ملے گی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس بل کو اقلیتوں کی چاپلوسی بتایا۔ پارٹی کے لیڈر مسٹر ایل۔ کے اڈوانی نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا ایودھیا تنازعہ ۱۹۸۹ء سے پہلے کبھی چناؤ کا موضوع نہ تھا۔ اس معاملہ نے اُس وقت اہمیت حاصل کی جب سرکار شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں کچھ لوگوں کے دباؤ کے آگے جھک گئی۔ اور پھر بابری مسجد ایکشن کمیٹی کی سرگرمیوں کی وجہ سے اس معاملہ نے زور پکڑا —— بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیوسینا کے ممبر بل کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے واک آؤٹ کر گئے۔

وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے موجودہ سخت ماحول میں بھی عبادت گاہوں سے متعلق یہ بل منظور کرالیا۔ یقینی طور پر یہ اقدام ان کی اعلیٰ خدمات میں شمار کیا جائے گا۔ گذشتہ کئی برسوں سے ہندو فرقہ پرست تنظیموں نے فرقہ پرستی کا جو ماحول بنا رکھا تھا۔ اس میں کانگریس کے تیار کردہ اس بل کے پیش کئے جانے کے امکانات موہوم ہو گئے تھے۔ یہ بل دراصل آنجہانی مسٹر راجیو گاندھی کی دین ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ کانگریس اپنے وعدہ پر قائم رہی۔ اور مسٹر نرسمہا راؤ کے ہاتھوں اس اہم فریضہ کی تکمیل ہوئی۔ بل پر بحث کے دوران میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے ذمہ داروں نے جو کچھ کہا۔ اس میں کچھ بھی نیا پن نہیں ہے۔ وہی گھسی پٹی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ پرستی کا حالیہ ماحول، مسٹر اڈوانی کی رتھ یاترا کی پیداوار ہے۔ انھوں نے ایک دو صوبوں کو چھوڑ کر تمام صوبوں میں رتھ یاترا نکالی۔ جہاں جہاں سے بھی یہ یاترا گذری بھارتیہ جنتا پارٹی شیوسینا اور وشو ہندو پریشد کے ہزاروں ورکروں اور دیہاتیوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس رتھ یاترا کا واحد مقصد "ہندو عوام کی سیاسی حمایت" حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اس بار لوک سبھا میں ۱۱۵ ممبر لانے میں کامیاب رہی۔

رام مندر اور بابری مسجد کا تنازعہ بھارتیہ جنتا پارٹی، شیوسینا اور وشو ہندو پریشد اپنی سیاسی اغراض کے لئے زندہ رکھنا چاہتی ہیں جس دن یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ انھیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ جہاں تک بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور دوسری مسلم تنظیموں کا تعلق ہے، انھوں نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ اس تنازعہ میں انھیں عدالتی فیصلہ منظور ہے۔ ان تنظیموں کو ملک کے عدالتی نظام پر اعتماد ہے۔ اور وہ اس سے انصاف کی توقع رکھتے ہیں۔ کم از کم ایک عبادت گاہ سے متعلق غیر منقسم ہندوستان کی عدالتی تاریخ میں نظیر موجود ہے، وہ ہے لاہور کی مسجد شہید گنج، جسے عدالت نے گوردوارہ قرار دیا تھا۔ اُسے غیر منقسم ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے مان لیا تھا۔ اسی طرح بابری مسجد کے تنازعہ میں بھی تمام مسلمان الٰہ آباد ہائیکورٹ کا فیصلہ ماننے کے لئے تیار تھے۔ اور تیار ہیں، لیکن یہ ہندو فرقہ پرست پارٹیاں ہیں، جو

یہ معاملہ عدالت پر محض اپنی سیاسی اغراض کے باعث چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ اور اسے اپنے سیاسی اقتدار کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتی ہیں۔

ہمیں یاد ہے ۱۹۴۷ء کے بعد جب بھی ہندو فرقہ پرست تنظیموں اور ان کی مسلم دشمنی کا تذکرہ ہوتا تھا تو کچھ بڑے لیڈر کہا کرتے تھے یہ فرقہ پرستی، مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست کا ردِ عمل ہے۔ (حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بھی قابل بحث بات ہے) لیکن ہم آج ہندو لیڈروں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اُن کی موجودہ فرقہ پرستی کس چیز کا ردِ عمل ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان ہندو تنظیموں کو اپنی دُکان چلانے کے لئے ایسے مسائل زندہ رکھنے ہیں — بہر حال ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ بھی ایک سیاسی مرحلہ ہے۔ جو اور مراحل کی طرح گذر جائے گا۔

سوویت یونین کو زوال

۱۹ ویں صدی کا آخری نصف اگر سائنسی معجزات کا دور تھا تو بیسویں صدی کا آخری دور سیاسی معجزات کا دور ہے۔ اس میں ایسے سیاسی انقلابات آرہے ہیں جن کا تصور تک نہیں ہوتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روس میں زار کا تختہ پلٹ دیا گیا تھا۔ اور کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد آس پاس کے ممالک کو ملا کر روس نے سوویت یونین کی تشکیل کی تھی۔ سوویت یونین ایک طاقتور ملک کی حیثیت سے اُبھرا۔ کمیونسٹوں نے اپنے ملک پر آہنی پردہ ڈال دیا۔ دُنیا یہ بھول ہی گئی تھی کہ اس پردہ کے پیچھے بھی عام انسان رہتے ہیں۔ اُن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز بھی وہی ہے جو دُنیا کے دوسرے خطوں کے انسانوں کا ہے۔ ۱۹ اگست کا دن وہ تاریخی دن تھا۔ جب انتہا پسندوں نے ماسکو میں صدر میخائیل گورباچیف کا تختہ پلٹ دیا۔ نائب صدر گینا رڈی نیایف کی سرکردگی میں آٹھ ممبروں پر مشتمل ایک انقلابی کمیٹی بنا دی گئی۔ اس زمانہ میں گورباچیف کریمیا میں اپنے گاؤں میں چھٹیاں گذار رہے تھے۔ انھیں مکان میں نظر بند کر دیا گیا — ادھر قدرت کو اور

ہی کچھ منظور تھا۔ روسی فیڈریشن کے صدر مسٹر یلتسن اس مرحلہ میں ڈٹ گئے۔ انھوں نے اس بغاوت کو نہیں مانا۔ اور وارننگ دی کہ اگلے ۲۴ گھنٹوں میں مسٹر گورباچیف کو لایا جائے وہ یا تو بیمار ہیں، یا نظر بند ہیں۔ دنیا انھیں زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے ہڑتالیں اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ اُدھر موقعہ دیکھ کر تین بالٹک ریاستوں اسٹونیا لٹویا اور لتھوانیا نے سوویت یونین سے آزاد ہونے کا اعلان کر دیا۔ تین دن کے بعد ہی یہ بغاوت ناکام ہو گئی۔ گینارڈی ینایئف اور کے جی بی کے چیف کو گرفتار کر لیا گیا۔ سوویت وزیر داخلہ، اور مسٹر گورباچیف کے ایک فوجی مشیر نے خودکشی کر لی۔ باقی ماندہ باغیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بغاوت کی خاص وجہ یہ بتائی گئی کہ مسٹر گورباچیف نے اصلاحات کی جو تحریک شروع کی تھی۔ اُسے ناپسند کیا جاتا تھا۔ —— تین دن بعد مسٹر گورباچیف شاندار ڈھنگ سے واپس آ گئے —— انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کو ممنوع قرار دیا۔ اس کے اثاثہ جات ضبط کر لئے گئے۔

سوویت یونین کافی مدت سے زوال پذیر تھی۔ اس کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ سوویت بلاک میں جگہ جگہ اس نے اپنی جو فوج رکھی تھی۔ اُس کا خرچہ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا علم تو دنیا اور امریکہ کو تھا۔ لیکن سوویت یونین میں سیاسی انقلاب بھی آ سکتا ہے اور وہ اندر سے ٹوٹ بھی سکتا ہے اس کا اندازہ کسی بڑے سے بڑے سیاسی مبصر کو بھی نہیں تھا۔ امریکہ کا انٹلی جنس سسٹم دُنیا کا سب سے بڑا سسٹم سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی فیل رہا۔ اور کسی سیاسی انقلاب کی پیشین گوئی نہ کر سکا۔

ہر کمالے را زوالے کے قدرتی اصول کے تحت سوویت یونین ٹوٹ رہا ہے۔ تین بالٹک ریاستوں کے علاوہ قازقستان اور تاجکستان نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔ آذربائیجان سے بھی ایسا ہی اعلان متوقع ہے۔ وسطی ایشیا کی ان ریاستوں میں مسلم اکثریت ہے —— صدر گورباچیف جلد ہی نئی تجویز لا رہے ہیں۔ سوویت یونین کو فیڈریشن کی بجائے کنفڈریشن قرار دیا جا رہا ہے جس میں صرف دفاع اور خارجہ امور مرکز کے پاس رہیں گے۔ باقی امور میں یہ ریاستیں آزاد ہوں گی۔

اس موقعہ پر ہم ۱۹۵۸ء کا وہ دن یاد دلاتے ہیں جب سوویت یونین نے پہلا مصنوعی سیارہ خلا میں داغا تھا، اس وقت کے صدر مسٹر خروشچیف نے بڑے طمطراق سے کہا تھا ہم آسمانوں میں پہنچ گئے ہیں۔ وہاں خدا کا کوئی وجود نہیں"۔ خدا پرست ان کے اس طنزیہ جملہ پر ہنستے تھے۔ آج خدا نے سوویت یونین سے خود کو منوالیا ہے، سوویت یونین کو زوال آگیا ہے۔ دیکھئے یہ زوال کہاں جا کر رکتا ہے۔

جگموہن اور کشمیر

مسٹر جگموہن بھلے ہی ایک اچھے بیوروکریٹ رہے ہوں لیکن وہ سیاستدان بھی ہوگئے ہیں، اس کا اچانک انکشاف حال ہی میں شائع شدہ ان کی کتاب FROZEN TURMOIL سے ہوا۔ مسٹر جگموہن بیوروکریٹ کے طور پر بھی کامیاب نہیں رہے۔ اب وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی نوازشوں سے راجیہ سبھا کے ممبر بھی بن گئے ہیں۔ انسان زیادہ دیر چھپتا نہیں۔ ہم اس وقت بھی ان کو جن سنگھی ذہنیت کا آدمی سمجھتے تھے جب وہ دلی کے ڈی ڈی۔ اے کے وائس چیرمین تھے۔ ان ہی کے دور میں ترکمان گیٹ میں مکانات کو منہدم کرنے پر وہ زبردست ہنگامہ ہوا تھا جس نے بعد میں ایمرجنسی کو فیل کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایمرجنسی پر جس سے ڈر کر بڑے بڑے "سیاسی شیر" "کاغذی شیر" میں تبدیل ہوگئے تھے۔ پہلا پتھر ترکمان گیٹ ہی سے پھینکا گیا تھا۔

جگموہن، دو بار کشمیر کے گورنر رہے ہیں۔ دوسری بار انھیں جب گورنر بنایا گیا، تو ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور دوسرے سیاستدانوں نے شدید نکتہ چینی کی تھی لیکن مرکزی حکومت نے اس مشورہ کو نہ مانتے ہوئے، انہیں کشمیر پر ٹھونس دیا تھا۔ آخر وہی ہوا جو ان کی موجودگی میں ہونا چاہیئے تھا ـــــــ یوں تو اس کتاب میں خرافات ہی خرافات ہے جس کا جواب دینا بھی ہم معقولیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس میں دو واقعات کا ذکر ہم کریں گے۔ یہ زمانہ وہاں کانگریس اور نیشنل کانگریس کی مخلوط حکومت کا تھا۔ سری نگر کے ایک چوک میں گاندھی جی کا مجسمہ لگایا جاتا تھا لیکن سیاستدانوں نے عین آخر وقت میں مجسمہ کا افتتاح

ملتوی کر دیا ـــــ جگموہن آئی اے ایس افسر رہے ہیں۔ انھوں نے مذہب اسلام کے بارے میں بھی پڑھا ہوگا ـــــ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلمان مجسموں کے خلاف ہیں، کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان میں اور کن کن مقامات پر مسلمانوں نے مجسّمے نصب کیے ہیں۔ جو سری نگر میں مجسمہ ٹھیک کرنے کی ضرورت آپڑی تھی مجسموں کے تئیں مسلمانوں کے عام رویّہ کو وہ اگر جانتے ہوتے تو یہ سب کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔

مسٹر جگموہن کی کتاب کا بڑا حصّہ یہ ثابت کرنے کے لیے وقف ہے کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور دوسرے نیشنل کانگریسی لیڈر نہ تو سیکولر ہیں اور نہ فرقہ پرست، وہ صرف اقتدار پرست ہیں۔ لکھتے لکھتے وہ شیخ عبداللہ مرحوم کے بارے میں بھی یہی ریمارکس دے گئے کہ وہ بھی صرف اقتدار اور گدّی کے طالب تھے۔

یہ بہت اچھا ہوا، اِس کتاب کے ذریعہ مسٹر جگموہن کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔ اُن کی سیاسی زندگی کا طول و عرض ہی کتنا ہے کہ اُن جیسے "سیاسی بونے" کو شیخ عبداللہ مرحوم جیسی قد آور شخصیت پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہوگیا۔

گذارش

جوابی اُمور و خط و کتابت نیز منی آرڈر کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ خریداری یاد نہ ہونے کی صورت میں کم سے کم جس نام سے آپ کا رسالہ جاری ہے اس کی وضاحت ضرور فرمائیں۔ چیک سے رقم نہ روانہ کریں صرف ڈرافٹ سے روانہ کریں۔

اور اس نام سے بنائیں۔ "بُرہان دہلی" "BURHAN DELHI"

پتہ:-

دفتر بُرھان۔ اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا شہاب الدین ناظم فرقانیہ اکیڈمی - بنگلور نمبر ۵۷

(۵)

اگر مسلمانوں نے اس طریقہ کو اپنایا ہوتا تو آج سارا ہندستان حلقہ بگوش اسلام ہو چکا ہوتا۔ اور انہیں بھیونڈی، احمد آباد، میرٹھ اور بھاگلپور جیسے روح فرسا واقعات دیکھنے نہ پڑتے۔ اصل میں یہ مسلمانوں کو اللہ کی طرف سے ایک سزا ہے اپنے اصلی فرضِ منصبی کو ترک کرنے کی۔ اگر مسلمان خداوندِ قدوس کے حکم کے مطابق صحیح معنی میں جہاد نہیں کریں گے اور اس کے حکم سے اسی طرح سرتابی کرتے رہیں گے تو شاید ہمیں اور بھی بہت سے میرٹھ اور بھاگلپور دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ (لا فعل اللہ ذٰلك) -

تو کیا اہلِ اسلام پر اس صورت میں یہ سب سے بڑا شرعی فریضہ عائد نہیں ہوتا کہ جہاد کی ایک شکل (عسکری جہاد کی) اگر ہمارے لئے جاری رکھنا ممکن نہیں ہے تو پھر ہم جہاد کی دوسری شکل جو قرآنی تصریح کے مطابق اصل اور "سب سے بڑا جہاد" ہے جاری رکھتے ہوئے اسلام کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوشش کریں؟ ہمارے علماء کے نزدیک ان دونوں شکلوں کو چھوڑ کر جہاد کی پھر کونسی شکل باقی رہ جاتی ہے جس کے مطابق عمل کرکے وہ خداوندِ قدوس کے دربار میں سرخرو ہو سکتے ہیں؟ اور اس سلسلے میں حسبِ ذیل حدیثیں حجت ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب سے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے اُس وقت سے جہاد برابر جاری ہے یہاں تک کہ میری اُمت کا آخری فرد دجال سے جنگ نہ کرلے۔ [۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حال میں مرا کہ اُس نے نہ تو غزوہ (جہاد) کیا اور نہ غزوہ کی بات اُس کے جی میں آئی تو وہ ایک قسم کے نفاق میں مرا۔ [۲]

غرض جب ہم ان دونوں میں سے کسی بھی قسم کا جہاد نہیں کریں گے بلکہ اس سے جی چرا

---

[۱] سنن ابوداؤد کتاب الجہاد : ۳/۴۰ [۲] صحیح مسلم کتاب الامارۃ : ۳/۱۵۱۷

رہیں تو پھر ہم پر ہر قسم کی مصیبتیں بھی ضرور آتی رہیں گی۔ جیساکہ ایک حدیث میں اس کی بھی پیش گوئی موجود ہے:

جس نے غزوہ (جہاد) نہیں کیا یا کسی غازی (و مجاہد) کو سامان فراہم نہیں کیا اور کسی غازی (یا مجاہد) کے اہل و عیال کا بہتر طور پر جانشین نہیں بنا تو اللہ ایسے شخص کو قیامت سے پہلے کسی عذاب میں مبتلا کر دے گا[۲۳]

یہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ جیساکہ ارشادِ باری ہے:

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ: یہ تمہارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ (آل عمران: ۱۸۲، انفال: ۵۱)

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو ٭ وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

قرآن اور عقلی استدلال

جب جہاد کا صحیح مفہوم اور اس کی اصل حقیقت واضح ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جہاد کیا ہے اور اسے کس طرح انجام دینا چاہئے۔ نیز مجاہدین کی قسمیں بھی بخوبی معلوم ہوگئیں۔ تو اب سوچئے کہ آج یہ جہاد کہاں انجام پا رہا ہے؟ کیا ہمارے علماء اس کو انجام دے رہے ہیں یا ہمارے مدرسوں میں اس کی تربیت دی جا رہی ہے؟

اس سلسلے میں سورۂ فرقان کی جو آیات (۵۱ - ۵۲) اُوپر پیش کی گئی ہیں وہ اصل ہیں جو اس راہ کا نقشہ متعین کر رہی ہیں۔ یعنی قرآنی حقائق و معارف کے ذریعہ (جو دراصل خدائی دلائل و براہین کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنہیں قرآن میں "آیات اللہ" کہا گیا ہے) کافروں اور منافقوں سے لوہا لیا جائے اور ان خدائی دلائل کے ذریعہ علمی و استدلالی جنگ کی جائے۔ اور یہی تمام پیغمبروں کی سنت رہی ہے۔ جیساکہ ہمیں خصوصیت کے ساتھ قرآن میں مذکور سابق انبیائے کرام میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات اور اُن کے مباحثوں سے ظاہر ہوتا ہے، جو انہوں نے نمرود اور فرعون کے ساتھ کیے تھے۔ اگرچہ انبیائے سابقین میں حسی معجزات کا غلبہ رہا ہے، لیکن دلیل و استدلال کا وجود بھی جلوہ افروز

---

[۲۳] سنن دارمی: ۲/۲۰۹

نظر آتا ہے)۔

غرض اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عصری مزاج کے مطابق عقلی استدلال اور علمی دلائل و براہین سے کام لینا انبیائے کرام کی سُنّت ہے۔ اور یہ چیز رسالتِ محمدیؐ میں پوری آب و تاب کے ساتھ ضوء فشاں ہے۔ اور اس حیثیت سے قرآنِ مجید سراپا دلیل اور سراپا علم و استدلال ہے، جو اس سلسلے میں آخری درجے کی چیز ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کو بُرہان، نُور، ہادی اور شفاء (دلوں کی بیماری کو دُور کرنے والا) وغیرہ کہا گیا ہے۔ مثلاً:

یَاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا:

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک (واضح) دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک نورِ روشن (قرآن) بھیج دیا ہے۔ (نساء: ۱۷۴)

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے سامنے دو چیزیں موجود ہیں:

۱۔ ایک انبیائے کرام کی سُنّت اور اُن کا طریقہ کار کہ ہر دور کے لوگوں سے اُن کے ذہن و مزاج کے مطابق علمی و استدلالی انداز میں گفتگو کرکے انہیں کلمۂ طیبہ کی حقیقت اور اُس کے فلسفے کا قائل کرایا جائے۔ یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی حقیقت علمی و عقلی انداز میں ثابت کر کے خدا پرستانہ طرزِ زندگی سے انہیں روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ ہر دور میں لوگوں کو ایک خدائے واحد کی پرستش میں طرح طرح کے شبہات پیش آرہے ہیں۔ خواہ وہ مُشرکانہ نظریات ہوں یا جدید مادہ پرستانہ اور الحادی افکار اور فلسفے۔ اسی لئے ہر دور میں تمام انبیائے کرام کی مشترکہ دعوت اور اُس کا محور "لا الٰہ الّا اللہ" تھا۔ اس دعوت کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں سے محض کلمہ پڑھوا دیا جائے۔ بلکہ عقلی اعتبار سے اس کی برتری ثابت کرکے لوگوں کو اس طرزِ زندگی سے آشنا کرانا ہے جو اس کلمہ کے اقرار کے بعد ان پر عائد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دِقّت طلب مسئلہ ہے۔ کیونکہ اس عظیم عمل کے لئے پہلے لوگوں کے مروّجہ ذہنی و فکری رجحانات کا جائزہ لینا پڑے گا۔ اور ان رجحانات کا پتہ چلانے کے لئے اُن کے علوم و مسائل کا بھی مطالعہ کرنا پڑے گا۔ ورنہ نہ تو اُن کا موڈ بدل سکتا ہے اور نہ ہماری بات مؤثر طور پر ثابت ہوسکتی ہے۔ حالانکہ لوگوں کے

[illegible]

ابن عباسؓ سے مروی ہے :

أُمِرْنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ : ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں سے اُن کی سمجھ کے مطابق گفتگو کریں [۱]

اور جیساکہ پچھلے صفحات میں گزر چکا دعوت الی اللہ کے تین طریقے ہیں : (۱) حکیمانہ طریقے سے مدعو کرنا (۲) مؤثر اور دلنشین اندازِ خطاب (۳) بہترین طریقے سے بحث و مباحثہ ۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص مخاطب کے ذہن فکر اور اُس کے علوم و مسائل سے واقف ہی نہ ہو تو وہ اُس کے ساتھ بحث و مباحثہ کیسے کر سکے گا ؟ اس اعتبار سے تمام مروجہ علوم و مسائل کی تحصیل فرضِ کفایہ ہے۔ تاکہ علمی جہاد کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور کارگر بنایا جاسکے ۔

۲۔ اور اس سلسلے میں دوسری جو چیز ہمارے سامنے موجود ہے وہ خود قرآن حکیم ہے ۔ جو دراصل ہمارے سامنے انبیائے کرام کی دعوت کا نقشہ اور طریقۂ کار پیش کرتا ہے کہ ہم اس میدان میں کس طرح نبرد آزما ہوں ۔ اور لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت اور اس کے نتیجے میں عائد ہونے والی طرزِ زندگی کو کس طرح لوگوں کے سامنے پیش کریں ۔ نیز اس ابدی صحیفہ میں وہ تمام علمی دلائل بھی مذکور ہیں جو قیامت تک ہر دور کے مزاج اور ذہن و فکر کے مطابق علمی جہاد کی راہ میں مؤثر ہوسکتے ہوں ۔ مگر ان کا استنباط کرنا اہلِ علم کا کام ہے ۔ اسی وجہ سے ہر دور کے مُسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ وہ قرآن کے ذریعہ کافروں سے زور و شور کے ساتھ جہاد کریں۔ (فرقان ۵۲)

لیکن یہ دونوں چیزیں ہمارے سامنے موجود ہوتے ہُوئے بھی ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں تو اس سے بڑھ کر ہماری بدنصیبی اور محرومی اور کیا ہوسکتی ہے ۔ واضح رہے کہ عصری مزاج کے مطابق قرآن مجید کے دلائل و براہین صرف اُسی وقت واضح ہوسکتے ہیں جب کہ قرآن حکیم اور عصری علوم دونوں کا موازنہ کرکے نئے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں (اُس کے ابدی نصوص کے اندر) تلاش کیا جائے ۔

غرض اعلائے کلمۃ اللہ (خُدا کی بات کو اُونچا کرنے) کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ [illegible] ایک سبز جھنڈے پر لا الٰہ الا اللہ تحریر کرکے اسے اپنے گھروں اور مسجدوں پر

---

[۱] کنز العمال ۱۰/۱۴۳

نصب کر دے کہ چلو ہم نے کلمۂ توحید کو اُونچا مقام عطا کر دیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہی تو ہو سکتا ہے کہ کلمۂ توحید کی حقیقت کو دلوں اور دماغوں پر نقش کر دیا جائے۔ مگر کیا اس حقیقت کو منوانے کے لئے آزادانہ غور و فکر کا موقع فراہم کیا جائے یا تلوار اور بندوق وغیرہ لے کر لوگوں کو دھمکایا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک زبردستی ہوئی، دلیل و استدلال کی بات کہاں رہی؟ دینِ اسلام تو سراپا دلیل و استدلال ہے اور وہ حجت و بُرہان کے اُس مرتبے و منزل پر فائز ہے جس سے آگے کوئی مرتبہ یا منزل ہی نہیں ہے۔ اور اُس کی اس خصوصیت میں دُنیا کا کوئی بھی دوسرا مذہب اُس کا ہمسر و شریک نہیں ہے۔ بھلا ایسے دینِ فطرت کو قتل و خونریزی سے کیا واسطہ؟ قتل و خون ریزی کی راہ تو وہی دین و مذہب اختیار کر سکتا ہے جو دلیل و استدلال کی قوت سے محروم ہو۔ ہاں البتہ قتل و خون ریزی کا جواز صرف مُدافعانہ طور پر ہو سکتا ہے جب کہ دیگر اقوام و مذاہب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کریں۔ مگر اُس وقت بھی اعتدال پسندی اور حد سے عدمِ تجاوز ضروری ہے۔ چنانچہ جہاد و قتال کا یہ فلسفہ مکی و مدنی دور کے احوال و کوائف کے انطباق سے بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ اور اس اعتبار سے اسلام کی تمام جنگیں دفاعی رہی ہیں اور کوئی بھی جنگ اقدامی نظر نہیں آتی۔

تمدنی وسائل کی شرعی حیثیت

بہر حال اب سوال یہ ہے کہ کیا ہماری ملت آج یہ علمی و استدلالی جنگ لڑ رہی ہے یا لڑنے کے مُوڈ میں ہے؟ اسلام کی دعوت اصلاً دلوں اور دماغوں کو بدلنے کی دعوت ہے۔ اور یہ مقصد جس طرح بھی حاصل ہو اسے حاصل کرنے سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ اسلام میں اصل چیز مقصد ہے ذرائع نہیں۔ اصل مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو بھی ذرائع عصری مزاج کے اعتبار سے مناسب ہوں اُنہیں اختیار کرنا چاہیئے، اگرچہ وہ تمدّنی اعتبار سے بالکل ہی "نئے" کیوں نہ ہوں۔ مگر بعض لوگ جو دین کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہوتے وہ ان پر خواہ مخواہ "بدعت" کا الزام عائد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ دین میں بدعت جس چیز کا نام ہے وہ شرعی اُمور (عبادات) سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی جو چیز دین میں داخل نہیں ہے اُسے اپنی طرف سے بطورِ اضافہ شامل کر کے اور اسے عبادت سمجھ کر انجام دینا۔ اس کے برعکس تمدنی اُمور میں کوئی چیز

اختیار کر کے اسے دین کی مضبوطی اور استحکام کی غرض سے استعمال کرنا بدعت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز شرعی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے محض ذرائع و وسائل کو بدلنا ہے۔ نہ کہ انہیں عبادت تصور کر کے انجام دینا۔ اور ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور پھر تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس قسم کے ذرائع و وسائل بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس قسم کے بہتر سے بہتر "تمدنی ذرائع" اختیار کرنے کا حکم خود قرآن اور حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ اس موقع پر صرف ایک حدیث پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ لَهُ مِثْلَ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ۔ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ عَلَيْهِ مِثْلَ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا، وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ۔

جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ قائم کیا جس پر اُس کے بعد عمل کیا گیا تو جتنے بھی لوگوں نے اس پر عمل کیا اُن کے اجر و ثواب کے برابر اُسے بھی اجر دیا جائے گا اور عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح اسلام میں جس نے کوئی بُرا طریقہ (بدعت) جاری کی جس پر اُس کے بعد عمل کیا گیا تو جتنے بھی لوگوں نے اُس پر عمل کیا اُن سب کا گُناہ اُس پر ہوگا مگر لوگوں کے (اپنے) گناہوں میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ [۵۵]

استدلالی جنگ اور تحقیقی عمل

اس اعتبار سے تمدنی چیزوں میں تمدنی علوم (یا جدید علوم) بھی آتے ہیں، جن میں کمال حاصل کر کے دینِ حق کی حقانیت و برتری ثابت کرنا وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے، ورنہ پھر عقلی و استدلالی حیثیت سے عصرِ حاضر پر دلیل و حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ تو کیا دینِ حق کے علمبردار آج اس خدائی فریضے کو بخوبی ادا کر رہے ہیں؟ اور خدائی شریعت کے غلبے کے لئے عملی اقدامات کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ فکر و نظر کے میدان میں تبدیلی لائے بغیر عقلی اعتبار سے شریعتِ اسلامیہ کو غلبہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے شاہ بانو کیس نے ملّتِ اسلامیہ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ مگر ہمارے علماء اور قائدین نے سوائے سیاسی احتجاج کے علمی و استدلالی میدان میں

---

[۵۵] صحیح مسلم کتاب العلم ۴/۲۰۵۹ - ۲۰۶۰، ابنِ ماجہ ۱/۷۴، دارمی ۱/۱۳۰

کچھ نہیں کیا - (سوائے چند اخباری مضامین اور بیانات چھاپ دینے کے)۔ حالانکہ اس واقعہ نے اس چیز کی ضرورت و اہمیت کو نمایاں کرتے ہُوئے کام کرنے والوں کے لئے ایک نادر اور سُنہرا موقع فراہم کر دیا تھا۔ کیونکہ اب تک جو لوگ (خاص کر غیر مسلم اہلِ علم) اسلامی قانون کا تذکرہ تک سُننا پسند نہیں کرتے تھے وہ اس واقعہ کے بعد اسلامی قانون کی حقیقت سمجھنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مگر ہماری ملّت کی مدہوشی کا بھی عجیب حال ہے کہ ۱۹۸۶ء میں "مسلم خواتین ایکٹ" بن جانے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو کر اپنی سابقہ ڈگر ہی پر چلی جا رہی ہے۔ اور ہمارے علماء اس موضوع پر تحقیقی کام کر کے اسلامی قانون کی برتری عقلی اعتبار سے ثابت کرنا تو درکنار اس بارے میں سوچنا بھی تضییع اوقات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس موضوع پر کام کرنے کا یہ ایک بہترین وقت تھا۔

یہی حال دیگر مسائل کا بھی ہے کہ چاہے ہمارے سروں پر قیامت آجائے مگر ہم ٹس سے مس ہونا نہیں چاہتے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجائے تو ہنگامی طور پر تھوڑا بہت جوش دکھا کر پھر اپنی سابقہ رفتار پر لوٹ آتے ہیں۔ کسی سنجیدہ، ٹھوس اور منصوبہ بند کام کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ دین و ملّت کے استحکام کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ورنہ ہم علمی و استدلالی میدان میں کبھی کامیاب اور سرخرو نہیں ہو سکتے۔ جب کہ خُدائی منصوبے کے مطابق دینِ اسلام کو دلیل و استدلال کے میدان میں تمام ادیان اور کُل مذاہب پر غالب کرنا مقصود ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ : وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچّا دین دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے۔ (فتح : ۲۸)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ "افکار و نظریات کی دنیا" میں اللہ ہی کی دلیل ہمیشہ غالب رہے گی، چاہے فکری و نظریاتی اعتبار سے مادی فلسفے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لیں۔ اور تمام مظاہرِ کائنات اور اُن کے نظاموں کا جائزہ لے کر کتنا ہی اعلیٰ و برتر "فلسفہ" کیوں نہ تیار کر لیں:

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ : کہدو کہ اللہ ہی کی دلیل پوری ہوگی۔ (انعام : ۱۴۹)

یہ ایک ایسا قاعدہ وکلیہ ہے جو قیامت تک کسی بھی دور میں ٹوٹ نہیں سکتا چاہے عالم انسانی سائنسی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے۔ مطلب یہ کہ سائنسی تحقیقات کے زور پر جتنے بھی مادی فلسفے مرتب کئے جائیں گے وہ صحیح منطقی دلائل کی رُو سے خُدا کی وحدانیت اور اُس کی خلاّقیت کو ردّ نہیں کرسکیں گے۔ بلکہ ان تمام مادّی فلسفوں اور مادّی افکار و نظریات پر خُدا کی دلیل وحجت ہی ہمیشہ بھاری رہے گی۔

بہرحال دُنیا میں تمام انبیائے کرام کی سُنّت یہی رہی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہمیشہ کھلے کھلے دلائل وبراہین لے کر میدان میں آتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں دو آیتیں ملاحظہ ہوں:

رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلاَّ يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ : ہم نے (اپنے) رسولوں کو خوشخبری سُنانے اور متنبہ کرنے والے بنا کر بھیجا ہے، تاکہ پیغمبروں (کو بھیجنے) کے بعد اللہ پر لوگوں کا الزام (عائد ہونے کی گنجائش) باقی نہ رہے۔ (نساء: ۱۶۵)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ : ہم نے اپنے رسولوں کو (ہر دور میں) کھلے کھلے دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان بھی اُتاری ہے تاکہ لوگ (جادۂ) اعتدال پر قائم رہیں۔ (حدید: ۲۵)

اس اعتبار سے ہر دور میں انبیائے کرام کی سُنّت کے مُطابق خُدائی دلائل و براہین کو واضح کر کے نوعِ انسانی کو راہِ ہدایت سے ہمکنار کرنا صحیح اسلامی جہاد ہے جو تمام مُسلمانوں کے لئے ایک فرضِ کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر تمام مُسلمان اس فرضِ کفایہ کی ادائیگی سے غافل ہوجائیں تو پھر سب کے سب گنہگار ہوجائیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ دلائل و براہین کہاں ہیں؟ تو ظاہر ہے کہ وہ خدائے عز وجل کے کلامِ ابدی ہی میں موجود ہیں، جن کے ذریعہ نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی ہوسکتی ہے۔ جیسا

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ : وہی ہے (تمہارا رب) جو اپنے بندے (محمدؐ) پر کھلے کھلے دلائل اُتار رہا ہے تاکہ وہ تمہیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی میں لے آئے۔ کیونکہ اللہ تم پر بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ (حدید : ۹)

اب ظاہر ہے کہ کلام الٰہی میں موجود ان علمی وعقلی دلائل کو اُجاگر کرنا علمائے اسلام یا علمائے حقانی کا کام ہے جو ہر دور کے ذہن و مزاج اور اُس کی منطق کے مُطابق تشفی بخش ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کلام الٰہی میں ہر دور اور ہر قوم کی عقل ومنطق کا توڑ موجود ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہے کہ یہ کلام ابدی سارے جہان کے لئے ہدایت و رہنمائی کی غرض سے نازل کیا گیا ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا : (اے محمدؐ) ہم نے آپ کو (دنیا کے) تمام لوگوں کے لئے (نیکوں کو) بشارت سنانے اور (بُروں کو) مُتنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا : ۲۸)

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ : یہ قرآن تو سارے جہاں کے لئے ایک سبق ہے (ص : ۸۷)

مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ان دلائل و براہین کو عصری مزاج اور اُس کی ذہنیت کے مُطابق اُجاگر کرنے کے لئے عصری علوم و مسائل سے بھی واقفیت اور لگاؤ ضروری ہے۔ ورنہ عصرِ جدید پر انبیائے کرام کی سُنّت کے مطابق حجّت قائم نہیں ہو سکے گی، جیسا کہ اُوپر سورۂ نساء والی آیت (۱۶۵) میں کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دور سائنسی علوم کے غلبے کا دور ہے اور موجودہ دور کی عقلیت کا زور توڑنے کے لئے ان علوم و مسائل میں کلامی نقطۂ نظر سے بحث کر کے دینِ حق کا غلبہ ظاہر کرنا ضروری ہے[۶] اور یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور سب سے بڑا جہاد ہے جو ایک پیمبرانہ عمل ہے۔ لہٰذا اس راہ میں جد و جہد کرنے والوں کی ہر ممکن طریقے سے تائید و حمایت ضروری ہے۔

---

[۶] اس موضوع پر راقم سطور نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اور ایک تازہ کتاب "جدید علمِ کلام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں" بھی شائع ہو چکی ہے، جس میں اس نقطۂ نظر سے پوری اور تشفی بخش بحث موجود ہے۔

مگر آج ہمارے مدرسوں میں ان دلائل و براہین کی تعلیم دینے اور قرآن حکیم کے صحیح طرزِ فکر سے طلبۂ دین کو آشنا کرانے کے بجائے قدیم یونانی منطق و فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان فرسودہ علوم کی تحصیل میں عمریں کھپا دی جاتی ہیں، جن کا زمانہ اب پوری طرح لد گیا ہے۔ یا پھر محض فقہاء کے اختلافی اقوال کو رٹا دینا علم کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث کی صحیح تعلیم موجودہ دور کے مزاج اور اس کی ضرورت کے مطابق نہیں دی جاتی اور عصرِ جدید کے ہتھیاروں سے موجودہ دور میں "علمی جنگ" لڑنے اور قرآنِ عظیم کی عظمت و برتری ثابت کرنے کی طرف مطلق توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ بلکہ اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس تک نہیں رہ گیا ہے۔ جو بڑی افسوسناک صورتِ حال ہے۔ ضرورت ہے کہ قرآن مجید کو محض طوطے مینے کی طرح رٹ لینے کے بجائے اس کے مفہوم و مدعا اور اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن ہی ہمارے لئے نسخۂ کیمیا اور ہمارے تمام شرعی و فکری مسائل میں مرشد و رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ہم نے اسے جزدانوں اور طاقوں میں سجا کر اس کو محض دعا اور تعویذ کی چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں مجھے عوام سے زیادہ ہمارے علماء سے شکایت ہے جو نئے مسائل کا حل قرآن اور حدیث سے نکالنے کے بجائے چند اقوال و فتاویٰ کو اصل قرار دے کر انہیں ہر حال میں قرآن اور حدیث پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا اب قرآن محض برکت کی چیز یا "کتابِ تلاوت" کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ حالانکہ قرآن اور حدیث کے نصوص و احکام ہر دور میں ایک چشمۂ رواں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان پر کہنگی کی پرچھائیاں کبھی نہیں پڑ سکتیں اور اُن کے سوتے کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔ اس راہ میں ہمارے علماء کی کوتاہی دراصل موجودہ طرزِ تعلیم کا نقص ہے۔ جو قرآن اور اس کے علوم و معارف کو اصل قرار دینے کے بجائے ارسطو، افلاطون اور بطلیموس کے نظریات کو اصل قرار دے کر قرآن کو ان فرسودہ نظریات کے تابع کرتے ہیں۔ اور جدید سائنس ان کی نظر میں ناقابلِ اعتبار ہے۔

حاصل یہ کہ ہمارے جو بھی شرعی، فکری، تہذیبی اور تمدنی مسائل ہیں ان سب کا حل قرآن اور حدیث میں موجود ہے، جن کو واضح کرنے کے لئے ہر دور میں تحقیق و ریسرچ کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کام موجودہ طرز کے مدرسوں میں انجام پانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ ہمارے

علماء کسی بھی قسم کی "نئی تحقیق" سے بہت گھبراتے ہیں اور بسا اوقات اسے خلافِ دین قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ لہٰذا اس قسم کی تحقیق (جو وقت کے لحاظ سے سب سے بڑا جہاد ہے) آزادانہ طور پر ہونا چاہیئے۔ اگرچہ اس کام کو انجام دینے والے علماء ہی ہوں گے مگر ان کا مدرسوں کے "سایۂ عاطفت" سے آزاد ہونا ضروری ہوگا۔ اور اس راہ میں وسیع النظر، پختہ کار اور روشن فکر علماء کی ضرورت پڑے گی۔ لہٰذا ہماری اُمت کا اجتماعی فریضہ ہے کہ ایسے باصلاحیت علماء کو تلاش کر کے اس راہ میں لگائیں۔ اور اس راہ میں کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ ورنہ پھر یہ کارِ عظیم ہرگز انجام نہیں پا سکتا۔

واضح رہے راقم سطور اس وقت یہ تمام باتیں کسی وقتی جوش و جذبہ کے تحت نہیں تحریر کر رہا ہے بلکہ اس راہ میں اپنے طویل تجربات کے بعد اپنی پختہ رائے کا اظہار کر رہا ہے۔

کیا اب علمی جہاد بھی منسوخ ہو چکا ہے؟

اسلام ایک دائمی اور ابدی دین ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی ابدیت کو باقی و برقرار رکھنے کے لئے بہت سے انتظامات کر رکھے ہیں۔ تاکہ قیامت تک ہر دور اور ہر زمانے کے تقاضے کے مطابق دینِ برحق کی صحیح تعلیم و تبلیغ اور اُس کی نشر و اشاعت کا کام بغیر کسی انقطاع کے مُسلسل و پیہم جاری رہے۔ ورنہ پھر دین مُشتبہ ہو جائے گا۔ کیونکہ دین کی صحت کا دار و مدار علم کی صحت اور اُس کی نشر و اشاعت پر موقوف ہے۔ ورنہ ہمارا حال بھی نعوذ باللہ یہود و نصاریٰ جیسا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل کے موجود ہونے کے باوجود (جن میں قرآنی تصریح کے مطابق واضح ہدایت موجود تھی) محض آپسی رقابت اور سرکشی کی بنا پر کلام الٰہی میں اختلاف کیا اور پھر اس میں تحریف کر کے اس کے الفاظ و معانی کو بدل ڈالا۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ: اور اس میں اختلاف انہی لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی، روشن دلیلیں آچکنے کے بعد (محض) آپس کی ضد کی وجہ سے۔ (بقرہ: ۲۱۳)

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ۙ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ: وہ لوگ کلام کو اُس کی جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اُس نصیحت سے فائدہ اُٹھانا بھول گئے

جو انہیں کی گئی تھی۔ (مائدہ : ۱۳)

اس بنا پر وہ نہ صرف خود گمراہ ہوئے بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا۔ یہاں تک کہ دینِ الٰہی کی اصلیت ہی مشتبہ ہوگئی۔ اسی لئے اصلاحِ عالم کے لئے قرآنِ حکیم کو نازل کیا گیا جو سارے جہاں کے لئے ہدایت و رہنمائی کا اب واحد سرچشمہ ہے۔ لہٰذا اس سرچشمۂ علم کو اب قیامت تک کے لئے بے آمیز طریقے پر جاری رہنا ضروری ہے۔ ورنہ پھر اسلام کی اصلیت بھی نوعِ انسانی کے لئے مشتبہ ہوسکتی ہے۔ اور اس خدائی فریضے کو انجام دینے والے علمائے حق ہیں۔

اسی بنا پر علماء کو انبیاء کا وارث اور زمین میں اللہ کا امین کہا گیا ہے :

إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں[۷]

اَلْعَالِمُ أَمِيْنُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ : عالم زمین میں اللہ کا امین ہوتا ہے[۸]

اَلْعُلَمَاءُ مَصَابِيْحُ الْأَرْضِ وَخُلَفَاءُ الْأَنْبِيَاءِ : علماء زمین کے چراغ اور انبیاء کے جانشین ہیں[۹]

اَلْعُلَمَاءُ أُمَنَاءُ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهِ : علماء اللہ کی مخلوق پر اللہ کے امین ہیں[۱۰]

اس اعتبار سے علماء کا مرتبہ بہت بڑا ہے جو اللہ کی جانب سے مخلوقِ الٰہی کے نگران و محافظ اور علمِ دین کے پہریدار ہیں۔ اور اس لحاظ سے اُن کی بہت بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ ان کا فریضہ صرف اہلِ اسلام ہی کی اصلاح کا نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی اصلاح و درستی بھی ہے۔ چنانچہ انسانی افکار و نظریات اور اُس کے کردار و کیرکٹر میں جو بھی بگاڑ پیدا ہو جائے ان سب کی اصلاح کا بار بوجھ علماء ہی کے کندھوں پر ڈالا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب کوئی نیا رسول یا نیا پیغمبر آنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا نوعِ انسانی کے فکر و نظر اور اُس کے اخلاق و کردار کی اصلاح علماء نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا؟ کیا اس مقصد کے لئے آسمان سے فرشتے نازل ہوں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ انبیائے کرام ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے دور کی اعتقادی او

---

[۷] جامع ترمذی کتاب العلم : ۴۹/۵

[۸] و [۹] و [۱۰] کنز العمال : ۷۷/۱۰

عملی برائیوں کو دور کرنے کی غرض سے دنیا میں تشریف لاتے رہے ہیں۔ جب علماء انبیائے کرام کے وارث ہیں تو پھر اُن کو بھی یہ فریضہ تن من دھن کی بازی لگا کر انجام دینا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر اُن کا یہ دعویٰ بیکار ہے کہ ہم انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء کے وارثین کو تو ہمیشہ میدانِ جہاد میں برسرِ کار رہنا چاہیئے۔ مدرسوں اور مسجدوں کی چہار دیواریوں میں بند ہو کر جہاد کو معطل یا منسوخ قرار دینے کا دعویٰ کرنا انبیائے کرام کے مشن کو ختم قرار دینے کا صاف و صریح اعلان ہے۔ جہادِ عسکری تو پہلے ہی معطل ہو چکا ہے۔ اب رہا جہادِ علمی تو کیا اس کو بھی معطل و منسوخ قرار دے کر کتاب و سنّت کے ساتھ ایک مذاق کیا جائے گا ؟

حاصل یہ کہ اگر علماء کو انبیائے کرام کے صحیح وارث ہونے کا دعویٰ ہے تو پھر انہیں میدانِ جہاد میں کودنا چاہیئے۔ اپاہجوں کی طرح چہار دیواریوں میں بیٹھنا قطعاً حرام ہے۔ اگر وہ جہادِ علمی کو لغو اور بیکاری کا مشغلہ تصوّر کرتے ہیں اور انہیں " کاغذی مجاہدین " قرار دیتے ہیں[۱] تو پھر انہیں جہادِ عسکری کے میدان میں کودنا چاہیئے۔ ورنہ یہ بات اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کی صراحتاً خلاف ورزی ہوگی۔ جیساکہ ارشادِ باری ہے :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ : اور تم ان (کفار و مشرکین) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (کفر و شرک) باقی نہ رہے اور دین پورا اللہ ہی کا ہو جائے۔ (انفال : ۳۹)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ۔ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ :

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ اس بات کی گواہی نہ دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نیز وہ نماز قائم کریں اور زکاۃ ادا کریں۔ جب وہ اتنا سب کچھ کرلیں تو پھر وہ اپنا خون اور

---

[۱] دیکھئے ماہنامہ الفرقان'

مال مجھ سے بچا سکتے ہیں، سوائے اسلام کے کسی حق کے۔ اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا[۸۲]

نیز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس نے کسی بھی قسم کا غزوہ یا جہاد نہیں کیا اور نہ اُس کے خیال میں یہ بات آئی تو وہ ایک قسم کا منافق ہے:

مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ، وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهِ نَفْسُهُ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ: جو شخص اس حال میں مر گیا کہ اُس نے نہ تو غزوہ (جہاد) کیا اور نہ غزوہ کرنے کی بات اُس کے جی میں آئی تو وہ ایک قسم کے نفاق میں مرا۔[۸۳]

(جاری)

---

[۸۲] بخاری کتاب الایمان ۱/۱۱-۱۲، مسلم کتاب الایمان ۱/۵۱-۵۲، ابوداؤد کتاب الزکاۃ ۲/۱۹۸، ابنِ ماجہ ۲/۱۲۹۵، نسائی ۷/۷۵

[۸۳] مسلم ۳/۱۵۱۷، ابوداؤد ۳/۲۲، نسائی ۶/۸

کتب تفسیر میں الکشّاف کا مقام و مرتبہ

احسان اللہ فہد فلاحی۔ شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

گرچہ علامہ محمود بن عمر زمخشری (۱۰۷۵ء - ۱۱۴۴ء) کی تفسیر "الکشاف عن حقائق التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل" معتزلہ افکار و عقاید کی تفسیر و توضیح کرتی ہے اور تحریک اعتزال کے بنیادی اصولوں توحید، عدل، الوعد والوعید، المنزلۃ بین المنزلتین، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی قرآن سے تائید و تصدیق کرتی ہے تاہم آج عالم اسلام میں یہ تفسیر کافی مقبول و متداول ہے بلکہ عربی زبان و ادب کے اداشناس اور علوم دینیہ کے شیدائی ہر دور میں اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ عربی مدارس میں ہر مکتب و مسلک کے علماء و طلبہ زمخشری کے تفسیری نکات، اعجاز قرآن کی تشریحات، قرآن مجید کی بے مثل فصاحت و بلاغت کی پردہ کشائی میں اس کی مہارت و صلاحیت سے متاثر ہیں۔ تاریخ تفسیر کے ایک طالب علم کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ مختلف مسلم مذاہب و مسالک اپنے عقاید و نظریات سے بلند ہو کر اس تفسیر سے بھرپور استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآنی تفاسیر کا اگر ایک تجزیہ کیا جائے تو اس تفسیر کی وقعت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ تاریخ تفسیر و مفسرین کا ہر محقق اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ زمخشری سے پہلے ایسی تفسیریں موجود تھیں جن میں خالص فقیہانہ نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ کیا گیا تھا۔ ایسی تفسیروں کی بھی کمی نہ تھی جو کلامی مباحث کا ماخذ تھیں اور منطق و فلسفہ کے مسائل سے بحث کرتی تھیں۔ اور ہر ذوق و مسلک کی نمائندہ تفسیریں قرآن پاک کو اپنی تائید میں استعمال کرنے کے لئے مسلم معاشرے میں مروج تھیں۔ علامہ زمخشری نے معتزلہ افکار و عقاید کی تشریح کے ساتھ اصلی تحقیقات

و انکشافات، نئے علوم وفنون کی پیدائش وارتقاء، ابھرتے ہوئے افکار اور سماجی میلانات اور معاصر ضروریات کے پس منظر میں قرآن کی فکری اور عملی ہدایات کو واضح کیا اور ادب و بلاغت، نحو و اعجاز کے اسرار و لطائف کی ایسی پردہ کشائی کی کہ الکشاف پورے تفسیری ادب میں نمایاں اور ممتاز ہوگئی۔ اور بعد کا کوئی مفسر اس سے بے نیاز نہ رہ سکا۔

علامہ زمخشری خوارزم کے ایک گمنام قریہ زمخشر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد بن عمر الزمخشری ہے۔ آپ عرصہ دراز تک مکہ میں مقیم رہے اس لئے آپ جاراللہ (اللہ کے پڑوسی) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت سلجوقی سلطان جلال الدین ابوالفتح ملک شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ ملک شاہ نے اپنے عہدِ حکومت میں تجارت وصنعت، علوم وفنون اور ادب کو بہت ترقی دی۔ اس کا لائق اور مدبر وزیر نظام الملک طوسی علم اور علماء کا قدر دان تھا۔ اس نے علوم وفنون کی اشاعت اور علماء کی عزت افزائی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ اس دور میں علماء کو حکومت کے بلند مناصب سے نوازا گیا۔ اور انھیں ہر طرح کی آسانیاں پہونچائی گئیں۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ مدارس اور کتب خانے قائم کئے گئے۔ مدرسہ نظامیہ بغداد جسے امام غزالیؒ اور امام الحرمین جیسے اساطین فن کی جائے تدریس ہونے کا شرف حاصل ہے اسی کا قائم کردہ ہے۔ نظام الملک کی قدر دانی صرف اشعری اور سنی علماء کے لئے مخصوص نہ تھی، باوجود خود اشعری ہونے کے معتزلی علماء سے اس کے نہایت اچھے روابط تھے اور سب ہی لوگوں کے لئے حکومت کے دروازے یکساں کھلے ہوئے تھے۔ زمخشری کا خاندان مذہبی رجحانات کا حامل تھا۔ آپ کے والدِ مکرم بہت دیندار تھے۔ والدہ محترمہ بہت دیندار اور رقیق القلب خاتون تھیں۔ آپ کے والد محترم کا انتقال آپ کے زمانۂ طفلی میں ہی ہو گیا۔ آپ بچپن ہی سے یتیم ہو گئے۔ زمخشری کی ابتدائی تربیت کی ذمہ داری آپ کی والدہ نے لی۔ جب آپ سفر کے قابل ہو گئے تو آپ طلب علم کے لئے بخارا تشریف لے گئے۔ اور وہاں اکابر علماء سے کسب فیض کیا۔ آپ کے سب سے مشہور استاذ خوارزم میں اعتزال کی تبلیغ کرنے والی سب سے معروف ومشہور ہستی ابومضر ہیں۔ ابومضر نے آپ کو

لغت ونحو کی اعلیٰ تعلیم دی۔ اور عربی ادب کا پاکیزہ اور لطیف مذاق بخشا۔ اس کے ساتھ ساتھ اعتزال کے اس پرجوش داعی نے اپنے شاگرد کے ذہن کو معتزلی اندازِ فکر بھی عطا کیا۔ نظام الملک کی علم پروری نے اعتزال کے پرجوش داعی ابومضر کو بھی اپنی بارگاہ کا مقرب بنالیا۔ علامہ زمخشری بھی اپنے استاذ کے وسیلے سے نظام الملک تک پہونچنے میں کامیاب ہوگئے۔ نظام الملک نے زمخشری کو بھی اپنی قدرشناسی سے نوازا۔ زمخشری کی دلی تمنا تھی کہ حکومت کے کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہو جائیں۔ اپنی اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے آپ نے ملک شاہ کے دور کے متعدد اعیانِ سلطنت سے روابط قائم کئے لیکن آپ کی دلی مراد بر نہ آسکی جب وطنِ عزیز کی سرزمین آپ کو وہ عزت دینے سے قاصر رہی جس کے آپ خواہاں تھے تو آپ نے خوارزم کو چھوڑ کر خراسان کی راہ لی۔ وہاں مجیرالدولۃ ابوالفتح علی بن الحسین الاردستانی کی خدمت میں اپنی لغوی تصانیف پیش کیں۔ نیز مدحیہ قصیدہ لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا اور اپنی دلی تمنا کا اظہار کیا لیکن وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ خراسان میں ناکام ہوکر آپ نے اصفہان کی راہ لی جو لجوقی سلطان محمد بن ملک شاہ کا صدر مقام تھا۔ زمخشری نے سلطان کے اسلامی خدمات کو اشعار میں سراہا۔ اور باطنیہ کے استیصال کے لئے جو کوششیں سلطان نے کی تھیں۔ اُن کی تعریف کی۔ سنہ ۵۱۲ھ میں ۴۵ سال کی عمر میں آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ مرض اس قدر سخت تھا کہ جسم میں توانائی باقی نہ رہی۔ زندگی کی اُمید ٹوٹنے لگی۔ آپ نے اپنے ۴۵ سالہ عمر کا جائزہ لیا تو سوائے جاہ و منصب کی طلب اور اُمراءِ حکومت کے آستانوں پر جبہ سائی اور اُن کی توصیف میں خامہ فرسائی کے آپ کو کوئی ایسا عمل نظر نہ آیا جو آخرت کے لئے توشہ کا کام دیتا۔ بسترِ علالت پر پڑے ہوئے آپ نے عہد کیا کہ اگر اس جان لیوا مرض سے نجات ملی تو عمر کا باقی حصہ اور جسم و دماغ کی ساری صلاحیتیں مالکِ حقیقی کی چاکری میں لگادوں گا۔ نہ کسی بادشاہ کے دربار میں حاضری دوں گا۔ نہ کسی منصب کا اُمیدوار رہوں گا۔ نہ امراء سلاطین کے عطیات قبول کروں گا۔ بلکہ آئندہ صرف علوم وفنون کے درس وتدریس میں مصروف رہوں گا جو نفسِ انسانی کے

تہذیب و اصلاح کرتے ہیں جن سے انسانوں کو راہِ ہدایت ملتی ہے۔[۵] آپ کے اس مرض نے آپ کے رخ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ آپ کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ شفایاب ہونے کے بعد آپ نے بغداد کا سفر کیا۔ وہاں ابوالخطاب بن البطر، ابوسعد الشقانی اور شیخ الاسلام ابو منصور الحارثی سے حدیث کی سماعت کی، مشہور حنفی فقیہہ دامغانی، شریف ابن الشجری سے ملاقاتیں کیں۔ اس دوران آپ کے دینی رجحانات میں مزید اضافہ ہوگیا اور آپ حج کے لئے روانہ ہوگئے۔ جوار بیت اللہ میں زمخشری کی ملاقات امیر علوی علی بن عیسیٰ بن حمزہ بن وہاس سے ہوئی۔ امیر علوی نے زمخشری کی شاگردی اختیار کر لی۔ پانچ سال تک آپ مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ پانچ سال تک قیام کے بعد وطن کی یاد زمخشری کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اور خوارزم واپس چلے آئے لیکن ابھی وطن میں چند ہی روز گذرے تھے کہ آپ دوبارہ ۵۲۶ھ میں حج کے لئے روانہ ہوگئے اور سات سال تک مکہ معظمہ میں ٹھہرے رہے، اسی دوران آپ نے مشہور زمانہ تفسیر الکشاف لکھی۔ مکہ مکرمہ میں ایک طویل عرصے قیام کے بعد وطن کی یاد نے پھر زمخشری کو وطن کی راہ لینے پر مجبور کیا۔ زمخشری کا گذر ۵۳۳ھ میں ۶۶ سال کی عمر میں پھر بغداد سے ہوا۔ علم سے زمخشری کے والہانہ ذوق وشوق کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ بغداد میں ۶۶ سال کی عمر میں بھی امام ادب ابو منصور الجوالیقی کے سامنے ان کتابوں کے ابتدائی حصے پڑھ کر اجازت چاہی جن کے مصنفین کی ملاقات یا روایت انھیں براہِ راست حاصل نہ تھی۔ خوارزم کے صدر مقام جرجانیہ میں ۷۱ سال کی عمر میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔

علامہ زمخشری اپنے عصر و عہد کے یکتائے روزگار عالم اور امام فقہ تھے۔ آپ تفسیر، حدیث، نحو ولغت اور ادب میں عدیم المثال تھے، آپ نے معتزلہ کی حمایت میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی ساری تصانیف حقیقی اور دائمی شہرت کی مالک ہیں۔ ان میں سے چند تصانیف کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

زمخشری کی اہم ترین تصنیف قرآن مجید کی تفسیر الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل ہے۔ آپ نے یہ تفسیر ۱۱۳۲ء میں لکھنا شروع کی اور ۱۱۳۴ء میں مکمل کر لی۔ کشاف کا نقطۂ نظر معتزلی ہے لیکن پھر بھی اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے

راسخ العقیدہ مسلمانوں میں بھی خاصی مقبول ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ کشاف میں علامہ نے خالص نحوی تشریحات کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے قرآن کی ادبی محاسن کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور عقیدۂ اعجاز قرآن کی زبردست حمایت کی ہے۔ کشاف کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے عقاید کی فلسفیانہ تفسیر کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ تر مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ کشاف کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے کشاف میں تفسیر کے لغوی پہلو کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ اور قرأت کی پوری پوری تحقیق کی ہے اپنی تشریحات کی تائید میں قدیم شاعری سے دلائل اکٹھا کئے ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر کشاف کو ایک اونچا مقام ملا۔ اس شہرۂ آفاق تفسیر کو سب سے پہلے طبع کرانے کا فخر ہندوستان کو حاصل ہے الکشاف کو سب سے پہلے W. NASSAU LESS مولوی خادم حسین اور مولوی عبدالحئی نے کلکتہ سے ۱۸۵۶ء میں دو جلدوں میں شائع کیا۔ اس کے بعد بولاق نے دو مرتبہ اور قاہرہ نے چھ مرتبہ مع حاشیہ میر سید شریف نے شائع کیا۔ نشرہ دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان بھی ایک مرتبہ مع حاشیہ شائع کرنے کا شرف حاصل کر چکا ہے۔

علامہ زمخشری کی دوسری مایۂ ناز کتاب الفائق فی غریب الحدیث ہے۔ آپ نے یہ کتاب ۵۱۶ھ میں مکمل کی۔ آپ کی اس کتاب سے پہلے حدیث کے طالب علم کے لئے بہت ساری مشکلات تھیں۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر حدیث کے ماخذ کو طالبان حدیث کے لئے آسان کر دیا۔ علامہ زمخشری کی اس دوسری مایۂ ناز کتاب کو طبع کرانے کا سہرا بھی سرزمین ہند کے سر ہے۔ سب سے پہلے یہ کتاب حیدر آباد دکن سے، دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۹۱۶ء نے دو جلدوں میں شائع کی۔ اس کے بعد قاہرہ دار احیاء الکتب العربیۃ نے ۱۹۴۵ء میں اس کتاب کو شائع کیا۔

علامہ زمخشری کی تیسری شہرت یافتہ کتاب المفصل ہے۔ المفصل نحو کی مشہور و معروف کتاب ہے، یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع ہے۔ اس کا اسلوب بیان بالکل واضح ہے۔ المفصل کے بارے میں زمخشری کا دعویٰ تھا کہ "سیبویہ کی الکتاب کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو المفصل میں موجود نہ ہو کسی ادیب نے ایک مسئلے کی نشان دہی

کی کہ الکتاب میں ہے اور المفصل میں نہیں ہے زمخشری نے یہ جواب دیا کہ صراحۃً چاہے نہ ہو
گر ضمناً موجود ہے۔ اور وضاحت کرکے بتا بھی دیا[۴۲]۔ زمخشری کے بدلے ہوئے رجحان کے
بعد کی سب سے پہلی تخلیق یہی کتاب ہے اس کتاب کے مقدمے سے شعوبیت کے خلاف سخت
بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔ زمخشری کو شعوبیوں کے حال پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ یہ جاتے
پوچھتے کہ علوم اسلامیہ میں سے کوئی علم تفسیر، حدیث، فقہ کا ایسا کام نہیں جو عربی دانی کا محتاج
نہ ہو عربی کی قدر و منزلت گھٹانا چاہتے ہیں۔ زمخشری اس رجحان کو صریحاً تعصب اور بے
انصافی پر محمول کرتے ہیں۔ مقدمے ہی سے اس کتاب کی تالیف کا محرک بھی معلوم ہوتا ہے۔
زمخشری بتلاتے ہیں کہ اعجاز قرآنی اور تفسیری ایک بنیادی ضرورت اعراب کا علم ہے چنانچہ
وہ یہ احساس کرتے ہوئے کہ مسلمان دینی اعتبار سے اس علم کے حاجت مند ہیں۔ المفصل کی تصنیف
پر آمادہ ہوتے ہیں اور اس طرح قرآن اور علوم شرعیہ کی خدمت کے جذبے سے اس کام کو ہاتھ میں
لیتے ہیں۔ علامہ نے اس کتاب کی تالیف کا کام ۱۱۱۹ء میں شروع کرکے ۱۱۲۱ء میں مکمل
کرلیا۔ اسے 4 B. Broek نے Christiania سے ۱۸۰۹ء اور ۱۸۷۹ء
میں شائع کیا اور حواشی کے ساتھ مولوی محمد یعقوب رامپوری نے ۱۸۹۱ء میں دہلی سے
محمد فتح اللہ نے ۱۲۹۱ھ میں اسکندریہ سے محمد بدر الدین ابو فراس النعسانی الحلبی کی شرح الشواہد
کے ساتھ ۱۲۹۱ھ میں اسکندریہ سے اور ۱۳۲۳ھ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ مفصل
کی شرحوں میں سب سے مشہور شرح ابن یعیش کی شرح ہے۔ جو ۱۸۸۲ء میں لائپزنگ سے
دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ علماء نے المفصل کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں[۴۳]
علامہ زمخشری کی ایک مشہور تصنیف مقدمۃ الادب ہے جو عربی الفاظ کا ایک ذخیرہ
ہے۔ علامہ نے مقدمۃ الادب اور فارسی میں اس کی شرح لکھ کر اہل علم کے لئے عربی زبان
کا ایک وسیع ذخیرۂ الفاظ مہیا کر دیا۔ آپ نے یہ کتاب اتسز بن خوارزم شاہ (۱۱۲۷ء-
۱۱۵۶ء) کے لئے لکھی۔ احمد بن خیر الدین الکوز الحصاری مشہور بخواجہ اسحاق آفندی
نے اقصی الادب کے نام سے اس کا ترکی میں ترجمہ کیا۔
اس کے علاوہ آپ نے اساس البلاغۃ کے نام سے ایک لغت کی

کتاب لکھی ہے جس میں آپ نے الفاظ کے مجازی معنی اور استعمالات پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ عربی ادب پر علامہ زمخشری کو جو حیرت انگیز قدرت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتابوں سے کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے قدیم ضرب الامثال پر مشتمل المستقصی فی الامثال نام کی ایک کتاب لکھی جو حیدرآباد سے ۲ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی شاہکار کتابوں میں نوابغ الکلم، ربیع الابرار فیما یسر الخواطر والافکار، اطواق الذہب وغیرہ ہیں۔ علامہ زمخشری نے مکالموں کے انداز میں متعدد اخلاقی رسائل بھی تصنیف کئے۔ اُن کا آغاز "یا ابوالقاسم" سے یعنی خود اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کیا ہے۔ ۵۱۱ھ میں شدید علالت سے صحت یاب ہونے کے بعد زمخشری نے پانچ اور رسائل کا اضافہ کر دیا جو صرف ونحو، عروض اور ایام عرب سے متعلق تھے۔ ان مشہور ومعروف کتابوں کے علاوہ آپ نے الانموذج والامکنۃ والجبال والمیاہ، کتاب النصائح الکبار، اعجب العجب فی شرح لامیۃ العرب، مرثیہ ابی مضر، نصوص الاخبار فی الادب والنوادر، شرح مقامات الزمخشری، القسطاس المستقیم فی العروض، المحاجاۃ بالمسائل النحویۃ وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ کی کچھ تصانیف ایسی بھی ہیں جو صرف مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں میں موجود ہیں۔

علامہ زمخشری عقاید ورجحانات کے لحاظ سے مکمل معتزلی ہیں، آپ نے اپنی تفسیر الکشاف معتزلی بنیادوں کی رعایت کرتے ہوئے لکھی ہے۔ معتزلیوں کے مشہور عالم خیاط (م ۲۹۰ھ) نے مسلک اعتزال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "معتزلہ کے پانچ بنیادی اصول ہیں :۔ توحید، عدل، الوعد والوعید، المنزلۃ بین المنزلتین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ۵ ۔ یہ وہ اصول ہیں جن پر معتزلہ شروع سے آخر تک متفق رہے ہیں حتیٰ کہ نویں صدی ہجری کا مشہور زیدی عالم احمد بن یحییٰ بن المرتضیٰ (م ۸۴۰ھ) نے ان اصولوں پر معتزلہ کا اجماع نقل کیا ہے، ان اصولوں کو تسلیم کئے بغیر کوئی شخص معتزلی نہیں ہو سکتا علامہ زمخشریؒ صرف ان عقاید پر یقین ہی نہیں رکھتے ہیں بلکہ آپ نے ان اصولوں کی حمایت میں قلم بھی اٹھایا ہے۔ توحید امت مسلمہ کا بنیادی اور راسخ عقیدہ ہے اس

مکمل ایمان کے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا لیکن معتزلہ توحید کی ایک مخصوص تعبیر کرتے ہیں۔ معتزلہ کا تصورِ توحید لیس کمثلہ شئ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے اور باقی سب کچھ حادث ہے۔ وصف قدیم اس کی ذات کا اخص وصف ہے اور صرف اسی کے لئے مخصوص ہے۔ معتزلہ نے اللہ کی صفات کا بھی انکار کر دیا۔ اور نفی صفات میں اس قدر غلو کر گئے کہ بعض لوگ باری تعالیٰ کے لئے صفات کا لفظ استعمال کرنا گوارہ نہ کرتے تھے۔ معمر بن عباد السلمی (م۔ ۲۲۰ھ) نے صفات کے بجائے معانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ علامہ زمخشری نے بھی نفی صفات میں معتزلہ کی ہم نوائی کی ہے اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم میں حی کے معنی الباقی الذی لاسبیل علیہ للفناء بتاتے ہیں۔ یہاں وہ حی ذاتہ نہیں کہتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک حیاۃ باری تعالیٰ کی کوئی وجودی صفت نہیں ہے۔ نفی صفات کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت اور شہرت جس صفت کو حاصل ہوئی وہ صفت کلام ہے۔ معتزلہ کے نزدیک قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی بحث براہ راست صفات کے حدوث و قدم اور بالآخر توحید و شرک کی ہے۔ قرآن کو غیر مخلوق کہنے کا مطلب انکے نزدیک صرف یہ ہے کہ ایک حادث چیز کو ازلی اور ابدی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ قرآن کو ازلی اور ابدی کہنے سے صریح شرک لازم آتا ہے۔ علامہ زمخشری بھی قرآن کو غیر مخلوق کہتے ہیں قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا اسکی تفسیر یہ کہ اگر انسان اور جن سب کے سب ملکر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانیکی کوشش کریں تو نہ لاسکینگے چاہے وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔ علامہ زمخشری اس آیت سے قرآن کے مخلوق ہونے پر دلیل قائم کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ عجز اسی جگہ استعمال کیا جاتا ہے جہاں اس بات پر قدرت پائی جاتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام کو پیدا کرنے پر قادر ہے لیکن بندہ عاجز ہے لیکن جو چیز محل قدرت ہی نہ ہو اور جہاں قدرت کا سرے سے دخل ہی نہ ہو مثلاً خدا کا ثانی ہونا تو اس جگہ فاعل کے لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عاجز ہے اور نہ وہ چیز معجز کہلائیگی اگر یہ کہنا درست سمجھا جائے تو اللہ پر بھی عجز کا اطلاق جائز ہوگا۔ چونکہ محالات پر قدرت ہونا یہ اسکی صفت نہیں ہے۔ غرضکہ علامہ زمخشری نے توحید کے سلسلے میں

معتزلیوں کی پوری ہم نوائی کی ہے۔

مسلک اعتزال کے مباحث میں عقیدۂ عدل کو دوسرا مقام حاصل ہے معتزلہ نے اپنے تصور عدل سے اہل سنت والجماعت سے بہت سے مسائل نزاعی بحثیں کی ہیں علامہ زمخشری بھی نظریۂ عدل کے ہمنوا ہیں معتزلہ کے نظریۂ عدل کا پہلا اہم مظہر ان کا عقیدۂ خلق افعال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان اپنے ارادے اور اختیار میں قطعاً آزاد ہے وہ اپنے افعال کا خالق مخترع اور موجد ہے انسان ہی مکتسب افعال ہے خدا کی صفت تقدیر ارادے در فعل کو ایجاداً یا نفیاً مطلق کسی قسم کا دخل نہیں ہے۔ علامہ زمخشری نے قرآن کی تاویل بھی خلق افعال کو سامنے رکھتے ہوئے کی ہے قرآن مجید میں اہل علم کی زبان سے دعا کرائی جاتی ہے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ پروردگار جب تو ہمیں سیدھے راستے پر لگا چکا ہے تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ اس آیت میں زیغ پیدا کرنے کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے علامہ زمخشری لا تزغ قلوبنا کی ایسی تفسیر کرتے ہیں کہ اس نسبت کا سوال ہی اٹھ جائے۔ ان کے نزدیک اس جملے کا مفہوم ہے کہ اے اللہ تو ہم کو ایسی آزمائشوں میں نہ ڈال جن میں پڑ کر ہمارے دل راہ راست سے ہٹ جائیں۔

معتزلہ کا تیسرا عقیدہ المنزلة بين المنزلتين ہے۔ اہل سنت کے نزدیک ایمان قلبی تصدیق کا نام ہے اعمال اس قلبی تصدیق کا تتمہ و تکملہ ہیں لیکن معتزلہ کے نزدیک ایمان فرائض و مندوبات کے مکمل مجموعے کا نام ہے ایمان کو اعتقاد و اقرار و عمل کا مکمل مجموعہ قرار دینے کے بعد معتزلہ اور اہلسنت کی راہیں ایمان اور اس کے مقتضیات و نتائج کے بارے میں جدا ہو گئیں۔ مرتکب کبیرہ کے بارے میں اہلسنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ اپنے ایمان باللہ تصدیق رسالت و کتاب اور احکام الٰہی کو ماننے کی وجہ سے مومن ہے گرچہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے فاسق ہو گیا ہے تاہم اس کا یہ فسق اس کو دائرہ اسلام سے باہر نہیں نکال دیتا۔ اہلسنت والجماعت کے مقابلے میں خوارج کا مسلک بہت سخت ہے، خوارج بحیثیت مجموعی مرتکب گناہ کبیرہ کو کافر اور دائرہ ایمان سے خارج قرار دیتے ہیں یہاں تک کہ گناہ صغیرہ کے مرتکب کو بھی کافر اور دائرہ ایمان سے خارج کا فتویٰ صادر کیا ہے انھوں نے کبیرہ اور صغیرہ میں کوئی فرق نہیں چھوڑا ہے معتزلہ نے ان دونوں مسالک کی مخالفت کی اور کہا کہ گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں کبیرہ اور صغیرہ۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب ان کے نزدیک فاسق ہے اور فاسق ان کے نزدیک باتفاق رائے نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر اس طرح انھوں نے ایمان و کفر کے مرحلوں کے درمیان اور ایک اور مرحلہ ایجاد کیا جس کو انکی اصطلاح میں المنزلة بين المنزلتين (ای منزلتی الکفر والایمان) کہا جاتا ہے علامہ زمخشری نے بھی اس سلسلے میں معتزلیوں کی حمایت کی ہے قرآن کی آیت الذین یومنون بالغیب کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ صحیح ایمان تصدیق قلبی اقرار باللسان اور تصدیق بالعمل کے مکمل مجموعے کا نام ہے، اس طرح آپ ایمان کے مفہوم میں وہ دو چیزیں بھی شامل کر دیتے ہیں جو تصدیق قلبی یقین و طمانیت نفس کے علاوہ اس سے خارج ہے اور اس کے لئے آپ تصدیق بالعمل جیسا خوشنما لفظ استعمال کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

مصر میں عربی صحافت کی ابتداء

امتیاز احمد اعظمی ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

۱۸۷۶ء میں دو لبنانی نوجوان بشارہ تقلا اور سلیم تقلا کی کوشش سے ہفتہ وار جریدہ "الاہرام" اسکندریہ سے نکلا۔ نہایت کم عرصہ میں اس کو غیر معمولی مقبولیت و شہرت حاصل ہوگئی۔ یہاں تک کہ عربی صحافت میں اس کو آفاقی و بین الاقوامی مقام حاصل ہوگیا۔ یہ جریدہ مقبولِ عام کیونکر نہ ہوتا۔ اس میں سچی خبریں و واقعات اور عوام کی تمناؤں کی عکاسی ہوتی۔ کسی پس و پیش کے بغیر تمام خبریں اس کے صفحات نمایاں ہوتیں افتتاحی مضامین خاص طور سے مدارس و یونیورسٹیوں سے متعلق ہوتے جن میں اسماعیل پاشا کی علم دوستی، مدارس اور تعلیم گاہوں کے قیام کے سلسلہ میں اس کے اہم رول کا تذکرہ ہوتا۔ یہ ایک علمی و ادبی اخبار ہے۔ شاعر نجیب حداد نے اس جریدہ کی تعریف یوں کی ہے :-

"یعنی الاہرام" کی طرف دیکھو اور دوسری طرف "الاہرام" نام کے اخبار کو دیکھو اور قیاس کرو پہلا "اہرام" ہے جو سیاحوں کے لئے جنت گاہ ہے، دوسرا جریدہ "الاہرام" ہے جو متاعِ عقل و نظر ہے۔ ایک کی طرف لوگ چل کر جاتے ہیں اور دوسرا چل کر لوگوں کی طرف جاتا ہے۔ ایک ثابت

ہے اپنی جگہ قائم، دوسرا سیال ہے کوچہ و بازار میں رواں دواں۔
"ایک کے لب پر سکوت کی مہر ہے، دوسرا پیامبر و علم آموز" [۱]

الغرض اس جریدہ نے علم و ادب کے فروغ و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میں البطون جمیل نجیب ہاشم، الشیخ نجیب حداد، خلیل مطران، خلیل زیدان، نقولا حداد اور یوسف بستانی جیسے ماہرین علم وفن اور اصحاب فکر و نظر کے مضامین اور اُنکی علمی و فنی کاوشیں شائع ہوتیں۔

جریدہ "الاہرام" وہ پہلا جریدہ ہے جس کو بین الاقوامی مقام حاصل ہوا۔ اس کے نامہ نگار مغربی ممالک میں بھی تھے مشرقی ممالک میں بھی اس کے نمائندے گئے۔ ۲۲ سال بعد یہ ۱۸۹۸ء سے اسکندریہ کے بجائے قاہرہ سے نکلنے لگا۔ بشارہ تقلا کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے جبرائیل بک کی نگرانی میں یہ اپنی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا یہ کافی دنوں تک فرانسیسی زبان میں بھی نکلا۔ سیاسی بندشوں کے باعث کئی دفعہ بند بھی ہوا لیکن دوبارہ جاری ہوتا رہا۔ چنانچہ لبنانی اخبار نویسوں کا یہ وہ پہلا جریدہ ہے، جو باقی ہے۔ آج بھی نکلتا ہے اور اس کی ہزاروں کاپیاں نکلتی ہیں۔

قبطی قوم کی صحافت و اخبار نویسی سے ۱۸۷۵ء میں وادیٔ مصر روشناس ہوئی۔ اُنھوں نے بھی اپنے حقوق کے حصول اور صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے صحافت کو ذریعہ بنایا۔ ان کا پہلا ہفت روزہ جریدہ "الوطن" ۱۸۷۷ء میں نکلا۔ میخائیل عبدالسید اس کے بانی تھے۔ قبطی قوم کا دوسرا مشہور جریدہ "مصر" نکلا۔ اس کو ادیب اسحٰق نے جمال الدین افغانی کے مشورے پر فرانس سے واپسی کے بعد اسکندریہ شہر سے نکالا۔

اس جریدہ میں خاص طور پر مغربی ممالک کی اس جمہوری و ساز گار فضا کا ذکر ہوتا جس میں وہاں کے لوگ آزادانہ زندگی گذارتے تھے اور زندگی کی رونقوں شادابیوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ جہاں پر اُنھیں فکر و خیال کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ اس نے

---

[۱] "مصر کی عربی صحافت"۔ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی۔ ص ۴۹

اہل وطن کے اندر جذبۂ آزادی کو پروان چڑھانے اور نشو ونما دینے میں اہم کردار ادا کیا۔اس میں حاکم ومحکوم کے تعلقات و اختیارات سے متعلق تفصیلی بحث ہوتی۔مصریوں کے سامنے مذہب و وطن کی سچی تصویر پیش کی جاتی اور یورپ کے سماجی و سیاسی حالات بھی بیان کئے جاتے۔اس طرح ادیب اسحٰق نے مصر کے لوگوں کو جدید فکر و نظر کی حقیقت سے آگاہ کیا جس سے وہ ناواقف تھے۔ان کے اکثر مضامین ادبی انداز و اسلوب بیان میں ہوتے۔ اُن کے مضامین بالکل جدید اسلوب اور نئے طرزِ نگارش کے حامل نہیں ہوتے تھے۔الغرض جریدہ "مصر" نے اہلِ وطن کو زندگی کی نئی شاہراہوں سے آشنا کرنے میں غیر معمولی کام کیا۔

۱۸۷۶ء میں ہی فارس نمر اور یعقوب صروف کی ادارت میں رسالہ "المقتطف" نکلا۔ان دونوں حضرات نے اس رسالہ کی کامیابی اور تزئین و آسائش کے لئے بے حد کوشش کی۔یہ جریدہ انگریز نواز و برطانوی حکومت کے قیام کا حامی تھا۔اس میں اسلام پرستی وقومی آزادی کے بجائے انگریز پرستی کی دعوت دی جاتی۔چنانچہ اس کی آواز کا مصر کے مالدار طبقہ پر کافی اثر ہوا، اور وہ لارڈ کرومر کے گیت گانے لگے۔یہ جریدہ بہترین مضامین اور علم ادب سے پُر مقالوں کے اعتبار سے شہرت کے اعلیٰ مقام کا حامل ہے۔

۱۸۷۸ء میں ادیب اسحاق اور سلیم نقاش کی ادارت میں جریدہ "التجارۃ" نکلا، ۱۸۸۰ء میں ان دونوں نے اسکندریہ سے "اخبار المحروسہ" نکالا۔اس میں ادباء کی کاوشیں شائع ہوتی تھیں۔جمال الدین افغانی کے بے شمار تحریکی، سیاسی، وعلمی مضامین چھپتے اور شیخ محمد عبدہ کے اصلاحی و علمی مضامین بھی شائع ہوتے۔اس کی زمامِ کار مختلف اہلِ علم حضرات کے پاس رہی۔تقریباً ساٹھ سال تک یہ جریدہ برابر نکلتا رہا۔

۱۸۷۹ء میں سلیم عنحوری نے قاہرہ سے "مرآۃ الشرق" نامی جریدہ نکالا۔سید عبداللہ ندیم کی ادارت میں ۱۸۸۱ء میں جریدہ "التنکیت والتبکیت" جاری ہوا۔یہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی سامراج اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا اور دوسری جانب مصریوں کے اندر اس کے خلاف نفرت و عداوت کی بھٹی تیز ہو رہی تھی۔

مصری قوم جہالت و نادانی کی زندگی گذار رہی تھی۔ چنانچہ عبداللہ ندیم نے اس جریدہ کے توسط سے ملک و وطن اور مصری عوام کی بہترین خدمت کی مصر پر بیرونی طاقتوں کے تسلط کی سخت نکتہ چینی کی۔ اہلِ وطن کے دلوں کے اندر آزادیٔ وطن اور حریتِ فکر و نظر کی روح پھونکی۔ ان کو جہالت و نادانی، آبا پروری اور اوہام پرستی سے دور کرنے کی کوشش کی۔ مسلم حکومتوں اور خاص طور پر دولتِ عثمانیہ کی زبوں حالی و خستہ حالی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اور اپنے مقالہ و اداریہ میں سخت لب و لہجہ اختیار کیا۔

اس دور میں صحافت نے اپنی مقبولیت و شہرت کا سلسلہ جاری رکھا اور سماج و سوسائٹی کی عظیم خدمت انجام دی۔ اس دور میں صحافت کو جو اصل روحانی طاقت میسر ہوئی وہ جمال الدین افغانی کی شخصیت تھی۔ ان کی عقابی نگاہیں دنیائے اسلام کا جائزہ لے چکی تھیں مسلمانوں کی ضروریات اور وقت کی نغاوتیں ان کے اشارے پر ناچتی تھیں۔ ان کی شخصیت میں مقناطیسی قوت تھی جہاں پر بیٹھ گئے وہیں ایک نئی دنیا آباد کر لی۔ اُن کی موجودگی نے مصر میں ایک نیا سیاسی و فکری ماحول پیدا کر دیا انھوں نے مصر کی آزادی اور مصریوں کی خوشحالی پر برابر زور دیا۔ دینی اصلاح، دستوری نظام و اسلامی جمہوریت کے حق میں ایک بڑی جماعت تیار کی۔ سردست یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمال الدین افغانی کی شخصیت سے دنیائے صحافت کو ایک نئی سمت اور ایک نئی زندگی حاصل ہوئی جس کے باعث صحافت نے روز افزوں ترقی کی۔

اس دور کی ایک صحافتی خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ سیاسی و ادبی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ادبی صحافت اور سیاسی صحافت دونوں الگ الگ شکل میں نمودار ہوئیں خالص علمی و ادبی جرائد و رسائل جاری ہوئے جو سیاسی مباحث سے خالی ہوتے۔ جرائد کے ساتھ ساتھ ماہناموں و رسالوں کے وجود نے بزم صحافت کو مزید رونق افروز کیا۔ اخبارات کیلئے "جریدہ" اور علمی و ادبی ماہناموں کے لئے "مجلّہ" کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔

الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں عربی صحافت کو ترقی کرنے کا زرّیں موقع حاصل ہوا۔ اور بے شمار علمی و ادبی اور سیاسی جرائد و رسائل نکلے جن سے علم و ادب اور

صحافت و ثقافت کی گنگا بہنے لگی۔

تیسرا دَور

۱۸۸۲ء کا وہ زمانہ تھا جب مصر میں ایک نیا سیاسی ڈھانچہ سامنے آیا۔ سیاست کی وہ آب و ہوا جس سے مصری قوم کو کسی قدر راحت نصیب تھی اور فکر و نظر کی تھوڑی بہت آزادی حاصل تھی وہ بھی سلب ہونے لگی۔ برطانوی سامراج کے خونی پنجوں نے مصر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ بالآخر مصری عوام میں اضطراب و بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ پوری مصری فضا آزادی کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھی اور تمام ادباء، علماء اور صحافیوں نے قومی آزادی کے نعرے لگائے اور صحافت کو اہم میڈیا اور ترجمان کی حیثیت سے استعمال کیا۔

برطانوی سامراج کی دخل اندازی سے عربی صحافت نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ اس عہد میں قاہرہ علمی و ادبی اور سیاسی تحریکوں کا مرکز قرار پایا۔ جب برطانوی حکومت کی بڑھتی ہوئی حرص و ہوس نے مصر کو اپنے خونی شکنجہ میں جکڑنے کی کوشش کی تو صحافی حضرات کی سوچ و فکر اور زاویۂ خیال میں تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ سیاسی مسائل سے زیادہ دلچسپی لینے لگے اور دو گروپ میں تقسیم ہو گئے۔ وہ صحافت جس کا اصل مشن مصری سرزمین کی افادیت علمی و ادبی ارتقاء اور سیاسی و سماجی فلاح و بہبود تھا، اب وہ سیاسی رسّہ کشی و طرفداری کی جانب مائل ہو گئی۔ بعض جرائد و رسائل نے دولتِ عثمانیہ کو بہتر قرار دیا اور اس کو برطانوی و فرانسیسی حکومت سے افضل اور اہلِ وطن کے لئے زیادہ سود مند ثابت کیا۔ کچھ فرانسیسیوں کی تعریف و ستائش کرنے میں لگ گئے اور بعض نے انگریزوں کی قدم بوسی کرنی شروع کر دی۔ اس طرح روزنامے، سہ روزے اور ماہنامے تمام جرائد و رسائل سیاسی دھارے میں بہہ پڑے۔

اس وقت اکثر روزنامے قاہرہ سے نکلنے لگے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں قاہرہ سے جریدہ "الزمان" نکلا۔ یہ جریدہ انگریز کی آمد کو صحیح ثابت کرتے اور مصریوں کا خیر خواہ بنانے کی کوشش کرتا۔

"الزمان" کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اس کی موافقت ومخالفت میں بے شمار جریدے نکلے۔ ۱۸۸۹ء میں یعقوب صروف، فارس نمر اور شاہین مکاریوس نے ایک روزنامہ "المقطم" نکالا۔ ۱۹۴۰ء تک یہ برابر نکلتا رہا۔ یہ اعتدال پسندانہ نظریہ کا حامل تھا۔ نہ تو کسی کی مدح وستائش میں آسمان کے قلابے ملاتا اور نہ ہی کسی کی برائی میں حد سے تجاوز کرتا تھا۔ اس میں سرکاری خبریں، ملازمین کی تقرری، سرکاری اشتہارات اور وہ تمام چیزیں شائع ہوتیں جو سماج وسیاست سے تعلق رکھتیں۔

اس کا اصل مشن انگریز کی حمایت کرنا تھا۔ یہ برطانوی سامراج کا حامی تھا۔ اس نے انگریزی قبضہ کو صحیح ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ واضح طور پر اس نے انگریز نوازی کو بڑھاوا دیا اور صاف طور پر لکھا کہ "انگریز مصر میں قیام کی مشقت اس لئے برداشت کر رہے ہیں کہ وہ مصریوں کو نظام ظلم سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور انھیں عدل وانصاف کی بہار سے بہرہ ور کرنا چاہتے ہیں۔ مصر کو افلاس کے چنگل سے نکالنے اور مصر میں متوازی اقتصادی نظام قائم کرنے کا سہرا انگریزوں کے سر ہے"۔ [1]

گویا کہ یہ جریدہ برطانوی مشینری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس کی وطن مخالف روش کو دیکھ کر خدیو عباس نے اس کو بند کرنا چاہا تو اس پر انگیز سیاست دانوں کا شدید رَدِّ عمل ہوا اور اس کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ الغرض یہ جریدہ برطانوی حکومت اس کی پالیسی وپروگرام کی تعریف کرتا جس کی وجہ سے اسے انگریز کی سرپرستی حاصل رہی۔

"المقتطف"۔ "الزمان" اور "المقطم" کا اثر یہ ہوا کہ قوم کی حمایت میں روزنامہ "المؤید" نکلا۔ یہ جریدہ شیخ علی یوسف اور شیخ احمد ماضی کی سرپرستی میں نکلا۔ اس کو مصری علماء وادباء اور سیاسی حضرات کی جانب سے پورا تعاون حاصل رہا۔ اس میں اکثر مضامین آزادئ وطن کی حمایت اور برطانوی سامراج کی تذلیل وتنقید پر منحصر ہوتے۔

جریدہ "المؤید" کو غیر معمولی مقبولیت اور بے انتہا شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے

---

[1] حسن البنا شہید کی ڈائری، مترجم خلیل حامدی ص ۱۶

مظلوم مصریوں کے لئے ایسے وقت میں صدائے احتجاج بلند کی جبکہ انگریز استعمار اپنے خوں آشام پنجوں سے اہلِ وطن کا خون چوس رہا تھا اور ہر مصری ظلم وستم کی چکیوں میں پسا جارہا تھا۔ ایسے پُرآشوب وسنگین دور میں اس جریدہ نے قوم کو سہارا دیا۔ ان کے گم گشتہ دکھوئے ہوئے اقدار سے انھیں باخبر کیا۔ انھیں اُمنگ وحوصلہ جیسی عظیم دولت سے نوازا۔ انھیں عزت وشرف حاصل کرنے پر ابھارا۔ چنانچہ یہ محبانِ وطن اور قوم پرور لوگوں کے مابین نہایت مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تمام روزناموں میں اس کی ایک الگ ومنفرد حیثیت تھی۔ روزانہ اس کی بیس سے تیس ہزار کاپیاں شائع ہوتیں۔

چونکہ یہ جریدہ آزادیٔ وطن کا حامی اور برطانوی تسلط کے خلاف تھا اور انگریز سامراج کے خلاف نہایت سخت انداز میں نکتہ چینی کرتا تھا، اس کا پیغام تھا کہ مصر اہلِ وطن کے لئے ہے، اس کے ہر ذرہ سے مصری فائدہ اٹھائیں گے، انگریز کو اس ملک میں رہنے کا کوئی اختیار نہیں ہے، اس لئے انگریز کی جانب سے اس پر پابندی عائد کردی گئی خبروں کے معلوم کرنے کے تمام ذرائع اس کے لئے مسدود کردیئے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں ٹیلکس اور تمام ذرائع ابلاغ کو اس کے لئے خبریں مہیا کرنے سے منع کردیا گیا۔ ایڈیٹر کو متنبہ کیا گیا کہ وہ حکومت سے متعلق کوئی خبر نہ چھاپے۔ لارڈ کرومر کا یہ فرمان جاری ہوا کہ جو بھی صحافی حکومت کے راز کو فاش کرے گا یا اس سے متعلق کوئی خبر شائع کرے گا اس کے خلاف سخت قانونی کاروائی کی جائے گی۔

سردست یہ کہا جاسکتا ہے کہ کافی حد تک انگریزی قبضہ سے عربی صحافتی دنیا رہا ہوئی اور اخبارات ملکی سیاست کے مسئلہ پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک طرف وہ جرائد تھے جو برطانوی حکومت کو حق بجانب ثابت کرنے میں لگے۔ رسالہ "المقتطف" اور اخبار "المقطم" اس میں پیش پیش تھے۔ دوسری جانب وہ جرائد تھے جو انگریزی تسلط کا فی الفور خاتمہ چاہتے تھے چنانچہ اس میدان میں جریدہ "المؤید" اور دوسرے بہت سے جرائد کام کررہے تھے۔

۱۸۹۲ء میں قاہرہ سے جرجی زیدان کی ادارت میں رسالہ "الہلال" نکلا۔ ان کی شخصیت علم وادب کی دولت سے مالا مال تھی، فلسفہ وحکمت، تاریخ وجغرافیہ، سیاسیات ومعاشیات غرضیکہ تمام

علمی وادبی موضوعات پران کی گہری نظر تھی جس کے باعث "الھلال" کافی مقبول ہوا۔اس میں علم وادب سے متعلق نہایت عمدہ ومعلوم افزا بحث ہوتی۔گویا یہ ایک علمی وادبی رسالہ تھا۔ طلبہ کے لئے یہ مشعلِ علم وفن کا کام انجام دیتا۔خود جرجی زیدان کے متعدد موضوعات پر علمی وفنی مضامین شائع ہوتے۔اخبار "الاھرام" کے مانند اس رسالہ کو غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اور طویل عرصہ تک یہ نکلتا رہا۔

۱۹۱۴ء میں جورجی زیدان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے امیل زیدان نے اس کو حُسن وخوبی نکالنے کا کام جاری رکھا لیکن اس کو شہرت وبلندی کے مقام تک پہنچانے کا سہرا جورجی زیدان کے سر جاتا ہے۔

۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک بے شمار روزنامے وماہنامے جرائد ورسائل نکلے۔

۱۰ ارمارچ ۱۸۹۸ء میں قاہرہ سے ایک دینی وسیاسی وسماجی ہفت روزہ جریدہ "المنار" نکلا۔اس کے ایڈیٹر علامہ رشید رضا تھے۔یہ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔اس میں جو مضامین شائع ہوتے وہ جمال الدین افغانی اور امام عبدہ کے نظریات سے مختلف ہوتے۔اس نے میدانِ صحافت میں اہم رول ادا کیا۔یہ جریدہ سماجی ودینی مباحث کے اعتبار سے نمایاں تھا۔اس میں مختلف موضوعات پر مضامین چھپتے۔خبریں بھی شائع ہوتیں۔دوسرے سال کے آغاز میں یہ ماہنامہ رسالہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ابتدائی زمانہ میں اس کو کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ تھی اور عوام کی نظر میں زیادہ سودمند ثابت نہ ہوا لیکن چار سال بعد اس کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں اس کی پرانی کاپیاں زیادہ قیمت پر فروخت ہوئیں اور کم ہو جانے کے باعث انھیں دوبارہ چھاپنا پڑا۔

دو تین سال بعد سیاسی، سماجی ومذہبی چیزوں کے علاوہ کچھ مزید چیزیں شائع ہونے لگیں۔شیخ محمد عبدہ کی تفسیر قسط وار شائع ہونے لگی۔فتوے بھی چھپنے لگے۔خود رشید رضا کے فقہی سوالوں کے جوابات شائع ہونے لگے۔اس طرح اس میں بعض پرکشش موضوعات کا اضافہ ہوا۔

الغرض اس جریدہ کو غیر معمولی مقام حاصل ہے۔اس نے مصری سماج ووادئ نیل

کو ہوسم خزاں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہر مسلم بھائی بھائی ہے چاہے وہ دنیا کے کسی خطہ و علاقہ میں ہو۔ چنانچہ "الجامعۃ الاسلامیہ" کے قیام کا قائل تھا ــــ یعنی ایک ایسی تنظیم کا قیام عمل میں آئے جس کے تمام اسلامی ممالک نمائندے ہوں۔ اس نے حکومتِ اسلامیہ کی برابر حمایت کی۔ اس نے دولتِ عثمانیہ کو انگریزی و فرانسیسی حکومتوں سے اچھی و بہتر قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ترک بادشاہ تمام مسلم حکمرانوں میں بہتر و افضل ہے لہٰذا امتِ مسلمہ و دولتِ اسلامیہ کی سربراہی کا وہی مستحق ہے۔ اس نے انگریزی سامراجیت و استعماریت پر بھی نکتہ چینی کی اور مصری قوم کو آزادی و حریت کی دعوت دی۔

۱۹۰۰ء میں روزنامہ "اللواء" نکلا جس کو جذبۂ وطنیت سے سرشار اور رشید ائے قوم مصطفیٰ کامل پاشا نے نکالا۔ اس کی مقبولیت و شہرت کا سبب خود مصطفیٰ کامل کی مایۂ ناز محبِ وطن شخصیت تھی۔ ان کی ذات ہر خاص و عام کے لئے سرمایۂ افتخار تھی۔ قلوب و اذہان ان کی شخصیت کے دلدادہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصری قوم انگریزوں کے ظلم و ستم کی چکی میں پسی جا رہی تھی۔ اہلِ وطن غلامی و محکومی کی زندگی گذار رہے تھے۔ پوری قوم انگریزوں کے مخالف تھی اور کسی حقیقی رہنما و لیڈر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مصطفیٰ کامل قوم کی امیدوں کو بر لانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور جریدۂ "اللواء" کی خدمات کو وطنِ عزیز کی خاطر وقف کر دیا۔ خود اپنی پوری ذات کو قوم کی آزادی اور انگریزوں کے خاتمہ کے لئے وقف کر دیا۔

۱۹۰۶ء میں دانشوائی کے ہولناک و خون آشام حادثہ نے اہلِ وطن کے دلوں میں کرب و اضطراب پیدا کر دیا۔ ہر مصری انگریز کا مخالف ہو گیا۔ مصطفیٰ کامل نے اس جریدہ کے ذریعہ اہلِ وطن کو صبر و ضبط اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دی۔ انگریز کو قوم و وطن کا دشمن قرار دیا اور واقعہ دانشوائی پر قوم و ملت کی طرف سے سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔

اس جریدہ کا پہلا نمبر ۲ نومبر ۱۹۰۰ء کو نکلا۔ یہ روزنامہ جریدہ تھا۔ جمعہ کے روز بھی نکلتا۔ صرف عید الفطر و عید الاضحیٰ کو بند رہتا۔ ایک سال بعد جمعہ کا دن بھی اس کی چھٹی کا دن قرار پایا۔ آغاز میں یہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا اور کچھ سال بعد ۱۹۰۶ء سے آٹھ صفحات میں نکلنے لگا۔ کچھ دنوں بعد اس کی ماہنامہ کاپیاں بھی چھپنے لگیں۔

...ی، اسماعیل پاشا صبری، سید علی، خلیل بک مطران اور امیر الشعرا احمد شوقی جیسی ... ہستیاں ہی مقالہ نگاری کی خدمت انجام دے رہی تھیں مصطفیٰ کامل کے بڑے نادر ... مضامین بھی شائع ہوتے ۔ گویا یہ جریدہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ تھا جو اہلِ وطن کو ان کے ... مقاصد سے آگاہ کرتا ۔ انھیں آزادیِ وطن کی راہ میں جہاد کرنے پر اُبھارتا ۔ اس ... کا ادبی پہلو بھی نہایت دلکش و دلفریب انداز میں ہوتے ۔ الغرض یہ جریدہ بے حد پسندیدہ ... سے دیکھا گیا ۔

اس جریدہ کی شہرت و مقبولیت اور کثرتِ اشاعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ... ۱۹۰۸ء میں بانیٔ اخبار کا انتقال ہوا تو اس وقت اس کی روزانہ نو ہزار چھ سو کاپیاں ... ہونے لگی تھیں ۔ اس کی طباعت و اشاعت کے لئے ایک عالیشان دفتر تھا جو اس ... کے تمام فرانسیسی و عربی جرائد و رسائل کے دفتروں میں نمایاں مقام رکھتا تھا تقریباً ... لوگ کام کرنے والے تھے جن میں سے بیس محکمۂ نظم و نسق میں اور باون پریس میں کام کرتے ... ۔ ایک نئے قسم کی یورپی مشین بھی تھی ۔ اس جریدہ کا سالانہ خرچ ۹۶ ہزار اور آمدنی ... لاکھ چھبیس ہزار تھی ۔ اس طرح اس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار تھی ۔ واضح طور پر ... جا سکتا ہے کہ یہ وطنی و قومی جریدہ اہلِ وطن کے درمیان نہایت مقبول ہوا ۔

(آئندہ)

برہان

جلد ۱۰۸ | نومبر و دسمبر ۱۹۹۱ء مطابق جمادی الاول و جمادی الثانی ۱۴۱۲ھ | شمارہ ۵، ۶

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

بابری مسجد کا معاملہ

بھارتیہ جنتا پارٹی نے پچھلا الیکشن بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے نام پر لڑا تھا۔ اس کا موٹا سا مطلب یہ تھا کہ بابری مسجد گرا دی جائے گی اور وہاں رام مندر بنایا جائے گا چونکہ جہاں تک رام مندر کی تعمیر کا سوال ہے نہ تو وی۔ پی سنگھ سرکار اور نہ کانگریس کی حکومت اس کی مخالف تھی۔ اعتراض تو صرف اس بات پر تھا کہ مسجد کو گرا کر مندر بنایا جائے۔

بہرحال چناؤ اسی مسئلہ پر لڑا گیا۔ یو۔پی کی بدقسمتی تھی کہ وہاں بھارتیہ جنتا پارٹی کو اکثریت مل گئی۔ ظاہر ہے کہ جس پارٹی نے بابری مسجد اور رام مندر کے نام پر ووٹ لیا ہے۔ اُسے ووٹروں کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کر کے دکھانا ہوگا۔ چنانچہ یو۔پی کی کلیان سنگھ حکومت نے بابری مسجد۔ رام جنم بھومی سے متصل حال ہی میں چار قطعات آراضی ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۷۱ اور ۱۷۲ ایکوائر کئے ہیں۔ ان قطعات آراضی پر رام مندر کی تعمیر ہوگی۔ حکومت نے کہا ہے کہ یہ چاروں پلاٹ سیاحت کے فروغ کے لئے ایکوائر کئے گئے ہیں۔ ان میں یاتریوں کے لئے سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ ضلع فیض آباد کے حکام نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ جن چار قطعات آراضی کو حکومت نے ایکوائر کیا ہے۔ اُن میں متنازعہ پلاٹ شامل نہیں ہے محکمہ قانون کا کہنا ہے کہ حکومت نے ان چار قطعات کو ایکوائر کر کے اس جائداد یا قطعہ کو نہیں چھوا نہ اس میں مداخلت کی جس کے متعلق الہ آباد ہائیکورٹ میں مقدمہ زیر سماعت ہے۔

یو.پی کی حکومت خواہ کچھ کہے۔ اب یہ مرکزی حکومت کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کرے۔ اور عدلیہ کا احترام برقرار رکھے۔ اب بابری مسجد کا معاملہ صرف ایک فرقہ کے مذہب، یا ایک مقامی تنازعہ کا معاملہ نہیں رہا۔ بلکہ یہ مرکزی حکومت کے لئے عدل و انصاف کا معاملہ بن گیا ہے۔ اس ساری کہانی میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یو.پی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت وشو ہندو پریشد کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔ وشو ہندو پریشد کے عزائم سب جانتے ہیں، بھارتیہ جنتا پارٹی کی اندرونی صفوں میں بابری مسجد کے معاملہ میں اختلاف رہا ہے۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی، اس تنازعہ کا تصفیہ آن لائنوں سے ہٹ کر چاہتے تھے جس پر مسٹر ایل۔ کے ایڈوانی اور ساری پارٹی چلتی رہی ہے۔ بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے بجا طور پر اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ اگر "متنازعہ زمین کی جوں کی توں" پوزیشن میں مداخلت کی گئی یا اسے چھیڑا گیا تو اس کا شدید ردِ عمل ہوگا۔ ادھر بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈروں نے یو.پی کی حکومت کو مبارکباد دینے شروع کردی ہے کہ اس نے رام مندر کی تعمیر شروع کردی ہے۔

اس وقت سارے مسلمانوں کی نگاہ بابری مسجد کی طرف ہے۔ وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ مرکزی حکومت اس سلسلہ میں کیا کرتی ہے۔ مرکزی حکومت نے یو.پی کی صوبائی حکومت سے جواب طلب کیا ہے۔ تادمِ تحریر یہ جواب نہیں آیا۔ مرکزی حکومت کی غالباً ایکوائر کئے جانے والے قطعاتِ آراضی کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے گی۔ مسلمانوں نے مجموعی طور پر برداشت کا ثبوت دیا ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ مزید برداشت کا ثبوت دیں گے۔ اور اپنی لڑائی پُرامن جمہوری طریقوں سے جاری رکھیں گے۔ جذباتی سیاست ہمیشہ نقصان کی طرف لے جاتی ہے۔ ٹھنڈے دماغ کی سیاست ہمیشہ کامیاب رہتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس معاملہ میں اپنے اتحاد کا ثبوت دیں۔ یک رائے اور ہم آواز ہوں۔ ایک کنونشن بلا کر اجتماعی فیصلہ سے مرکزی حکومت و صوبائی حکومت کو آگاہ کریں۔

بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، شیوسینا اور اسی طرح کی فرقہ پرست ہندو

تنظیموں نے ملک میں ہندو فرقہ پرستی کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی اس درجہ تک فرقہ پرستی اور نفرت کی لہر نہیں اٹھی تھی صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ اس نازک اور جذبات انگیز فضا میں خود پر قابو پانا ضبطِ نفس کا ثبوت دینا اور خود کو تعمیری کاموں میں منہمک رکھنا مسلمانوں کی شان ہونا چاہئے۔ یہ بھی تاریخ کا ایک مرحلہ ہے۔ جیسے آیا ہے گذر جائے گا۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ملی اتحاد کے ذریعہ خود کو آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کا اہل بنائیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بابری مسجد اور رام مندر کا مسئلہ اگرچہ اہم قومی مسائل میں شامل ہے لیکن قومی مسائل میں اس کا شمار پھر بھی چوتھے نمبر پر ہے۔ پہلا مسئلہ پنجاب اور کشمیر کا ہے۔ دوسرا مسئلہ آسام میں الفا اور آندھرا و مدھیہ پردیش میں نکسلیوں کا ہے تیسرا مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ چوتھا نمبر بابری مسجد۔ رام مندر کا ہے ——— ہمیں یہ معلوم ہے کہ فرقہ پرست ہندو لیڈروں نے رام مندر کی تحریک میں محض اس لئے زور پیدا کیا ہے کہ ان سے ہندو عوام یہ پوچھ رہے تھے تم پنجاب اور کشمیر میں ہندوؤں کو بچانے کے لئے کیا کر رہے ہو۔ انھوں نے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے بابری مسجد اور رام مندر کا جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی سیاست کی دکان چمکانے میں کافی حد تک کامیاب رہے ہے۔ یہ ایک عارضی صورتِ حال ہے۔ خدا تعالیٰ اس سے گذرنے کے لئے مسلمانوں کو صبر و ثبات کی طاقت دے۔

تاریخ کی تبدیلیاں

انسان بڑا نادان ہے۔ وہ تاریخ کی تبدیلیوں سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ قرآنِ کریم جو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے سعادت اور فوز و فلاح کا پیغام دیتا ہے۔ بار بار تاریخ کے واقعات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور ان اصولوں کی تشریح کرتا ہے۔ جن کے باعث افرادِ انسانی اور قوموں کو عروج و زوال حاصل ہوتا ہے۔ آیۃ کریمہ ہے :۔

تلك الايام نداولها بين الناس

"ہم اسی طرح زمانہ کو لوگوں کے درمیان گھماتے ہیں۔"
یعنی اس قانونِ قدرت کو سمجھنا چاہیے کہ کائنات میں ثبات نام کی کوئی چیز نہیں، کائنات ہمہ وقت تبدیلی و تغیر کا نام ہے۔ زمانہ ٹھہرتا نہیں مسلسل حرکت میں ہے کبھی کسی قوم کو کبھی کسی ملک کو عروج حاصل ہے۔ یہ سب کچھ خداوند تعالیٰ کے کُلی اختیار میں ہے۔ انسانوں کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے، ایک اور آیۃ کریمہ ہے:۔

قل اللھم ملک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک
ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر
انک علیٰ کل شیءٍ قدیر

کہہ دو۔ اے اللہ تو ہی ملک کا مالک ہے جسے چاہے ملک دیتا ہے جس سے چاہے ملک چھین لیتا ہے۔ جسے چاہے عزت دیتا ہے، جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں خیر و کامیابی و بھلائی ہے۔ بلاشبہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

حال ہی میں ان دونوں آیتوں کی صداقت کا اظہار دو اہم واقعات سے ہوتا ہے:۔
دوسری جنگِ عظیم ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ اور سوویت یونین دُنیا کے نقشہ پر دو بڑی طاقتوں کے طور پر اُبھرے۔ جب کہ دُنیا کی سب سے بڑی طاقت برطانیہ تیسرے نمبر پر آ گئی۔ فرانس کا شمار چوتھی بڑی طاقت میں ہونے لگا ــــــ لیکن اب ۴۵ برس بعد اس نقشہ میں یکایک تبدیلی آئی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک یعنی سوویت یونین اچانک ہی بگڑ گیا۔ آج سے بیس برس قبل اگر سوویت یونین کے بارے میں ایسی کوئی بات کہتا تو اُس کی دماغی صحت پر لوگوں کو شک ہونے لگتا، لیکن آج یہ بات ایک ٹھوس واقعہ بن چکی ہے کہ سوویت یونین بگڑ چکا ہے۔ اور مزید بگڑے گا۔ دُنیا کے مورخ اور سیاسی مبصرین سوویت یونین کے زوال کے اسباب و علل کا پتہ چلائیں گے اور تفصیلی بحث کریں گے۔ اس موضوع پر مستقبل میں ریسرچ ہو گی لیکن ان سب سے ماورا، ایک حقیقت ہے۔ وہ ہے خداوند تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ــــــ جس کے سامنے کسی کی کچھ نہیں چلتی۔ کل تک زمانہ سوویت یونین کے ساتھ

تھا آج یہ امریکہ کے ساتھ ہے۔ وہی سوویت یونین جو امریکہ کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا۔ اب مدد کے لئے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔ یہ ہے آیۂ کریمہ کا مصداق۔

تلک الایام نداولہا بین الناس

ہمارے دور کا دوسرا اہم واقعہ خلیجی جنگ کا ہے۔ امیر کویت سے سلطنت چھوٹ چکی تھی۔ ایک ہی رات میں عراق نے اُس پر قبضہ کر لیا تھا ——— پھر یہی سلطنت واپس بھی مل گئی۔ جنگ میں عراق کو شکست ہوئی۔ اور کویت و سعودی عرب کو فتح حاصل ہوئی۔

کیا یہ واقعہ دوسری آیت کا مصداق نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ جسے چاہتا ہے ملک بخشتا ہے۔ اور جس سے چاہے ملک چھین لیتا ہے۔ جسے چاہے عزت دیتا ہے جسے چاہے ذلت ———

بجا طور پر ذہن میں سوال اُبھرتا ہے کہ جب سب کچھ خداوند قدوس کے قبضہ و اختیار میں ہے تو انسان کیا کرے ——— انسانوں کا صرف ایک فریضہ ہے وہ آنکھ بند کر کے خدائی احکام پر چلیں، اور اپنے فرائض ادا کریں۔ وقت آئے گا غیب سے حالات بدلیں گے۔

ضمنی انتخابات

چیف الیکشن کمشنر نے ۱۹ پارلیمانی حلقوں میں اور اس کے ساتھ ہی کافی تعداد میں اسمبلی حلقوں میں چناؤ کا اعلان کر دیا ہے۔ اتنی بھاری تعداد میں ضمنی انتخابات کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ان حلقوں کے لئے ووٹنگ ۱۶ر نومبر کو ہو گی۔ جن پارلیمانی حلقوں میں انتخابات ہو رہے ہیں، اُن میں چار اہم ہیں۔ نندیال (آندھرا) بارہ متی (مہاراشٹر) نئی دلی اور امیٹھی (یوپی) نندیال حلقہ سے وزیر اعظم مسٹر نرسمہا راؤ اور بارہ متی سے وزیر دفاع مسٹر شرد پوار چناؤ لڑیں گے۔ جب کہ نئی دلی حلقہ سے بھارتیہ

جنتا پارٹی کے امیدوار فلمی اداکار شترو گھن سنہا چناؤ لڑ رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کانگریسی امیدوار راجیش کھنہ ہوں گے۔ امیٹھی حلقہ سے کانگریس کے امیدوار کیپٹن ستیش شرما ہوں گے۔ چونکہ مسز سونیا گاندھی سیاست میں داخل ہونے اور وہاں سے چناؤ لڑنے سے انکار کر چکی ہیں۔

ہندوستان کی پارلیمانی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر حلقوں میں ضمنی چناؤ ہو رہے ہیں۔ ابھی چناؤ کا رُخ واضح نہیں ہے۔ لیکن حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ ماہ جون کے چناؤ کے بعد ووٹروں کے رجحان میں قدرے تبدیلی آئی ہے۔ شاید ۱۶ نومبر تک اور بھی تبدیلی آ جائے۔

سب لوگ مرکز کو مضبوط اور مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک اچھا رجحان ہے آثار اس کے ہیں کہ کانگریس ۱۹ حلقوں میں سے کم از کم ۱۱ حلقوں میں میدان مار لے گی تاہم ابھی وثوق کے ساتھ کوئی پیشین گوئی ممکن نہیں۔ ووٹر ہمیشہ ہی پُر اسرار رہتے ہیں۔ اخیر تک اُن کا حقیقی فیصلہ معلوم نہیں ہوتا ——— بھارتیہ جنتا پارٹی کے لئے اس بار کوئی لہر نہیں ہے لیکن

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

وہ رام مندر کے خیال میں ہیں۔ اسی لئے رام مندر کی تعمیر کا زور و شور کے ساتھ پرچار جاری ہے۔

حضرت مفتی صاحب

اور

ندوۃ المصنفین

ازقاضی اطہر مبارکپوری

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مختلف حیثیات وجہات کا مجموعہ تھے، اور ان میں فضل وکمال کی تقریباً وہ تمام قدریں موجود تھیں جو عالم دین میں ہونا چاہئیں، ایسی جامع اوصاف شخصیتیں عام طور پر ابتدائے حال میں علم عمل کے مختلف میدانوں میں نمایاں ہوتی ہیں، مگر بعد میں کسی ایک میدان میں گوئے سبقت لی جاتی ہیں، حضرت مفتی صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، وہ ایک خالص علمی دینی اور روحانی خاندان کے چشم وچراغ تھے، اور ان کی ذات جملہ خاندانی روایات کی حامل تھی، وہ حافظ، قاری، عالم، مدرس، فقیہ، مفتی، مصنف، انشاء پرداز، خطیب، مفکر، سیاستداں اور منتظم سب کچھ تھے، مگر آخر میں ندوۃ المصنفین کے ذریعہ علمی ودینی خدمات کو مقصد ہستی بنالینا ان کا امتیاز بن گیا، اور اسی امتیاز کے ساتھ وہ دنیا سے گئے،

ندوۃ المصنفین کے قیام میں ارکان ثلاثہ (حضرت مفتی صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب) شریک تھے، ابتداء میں ان تینوں حضرات نے اس ادارے کو پروان چڑھانے میں بہترین خدمات انجام دیں اور اعلیٰ درجہ کی علمی اور دینی کتابیں تصنیف کیں، یہ تقسیم ملک سے پہلے کا دور تھا، حضرت مفتی صاحب نے اس دور میں بھی ندوۃ المصنفین کے ناظم و منتظم کی حیثیت سے اس کی افادیت عام کی، تقسیم کے بعد ندوۃ المصنفین تباہ وبرباد ہوگیا، اور اس کی بقاء کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، اس پُرآشوب دور میں مفتی صاحب عزیمت کا پہاڑ بن کر جمے رہے اور ندوۃ المصنفین کو قرول باغ کے بجائے، جامع مسجد کے علاقہ میں قائم کیا، اس میں ان کے رفقاء بھی شامل تھے، مگر ان میں نمایاں حضرت مفتی صاحب ہی تھے۔

اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء و حفاظت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی، یقیناً وہ اس بارے میں "امتِ وحدہ" کی حیثیت رکھتے تھے۔

حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدرسہ عالیہ کلکتہ چلے گئے جہاں ان جیسے باشعور اور صاحب علم شخصیت کی ضرورت تھی، باقی رہے حضرت مفتی صاحب تو انھوں نے ندوۃ المصنفین کو مقصدِ ہستی بنا کر اسی میں پڑے رہے، دونوں رفقاء کی جدائی کے بعد مفتی صاحب کی ذات ہی اس کے قیام و بقاء کی ضامن رہی، اس دور کے بعد ندوۃ المصنفین سے مختلف دینی و اسلامی موضوعات پر اعلیٰ معیار کی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں جو مفتی صاحب کے حسنِ ذوق اور حسنِ انتظام کا مظہر ہیں۔

کسی ادارہ کے قیام میں چند ہی اشخاص پیش پیش ہوتے ہیں، اور بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارے کی حیثیت ذاتی اور شخصی ہے، مگر ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ آگے چل کر اپنے بانیوں کے مکتبِ علم ونظر کا ترجمان بن جاتا ہے، یہی حال ندوۃ المصنفین کا رہا ہے کہ ابتداء میں چند فضلائے دارالعلوم دیوبند نے اس کی بنیاد رکھی، اور بعد میں اس طبقہ کی تصنیفی و اشاعتی خدمات کا مرکز بن گیا، یوں تو فضلائے دارالعلوم نے تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنی تصانیف کا انبار لگایا ہے درسیات کے شروح وحواشی میں اُردو، عربی اور فارسی زبانوں میں مستند کتابیں لکھیں، بدعات و فرقِ باطلہ کے ردّ و مقابلہ میں کتابوں کے انبار لگائے، اور مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھیں اور مجموعی اعتبار سے ہندوستان کا کوئی دینی و علمی ادارہ مختلف الجہات تصانیف میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے، اس کے باوجود ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ زبان وادب اور علم و تحقیق کے جدید اسلوب و معیار کے مطابق تصنیف و تالیف اور طباعت واشاعت کے سلسلے میں فضلائے دارالعلوم کا ادارہ ہونا چاہئے۔ اسی احساس وضرورت کے پیشِ نظر ندوۃ المصنفین کا قیام چند اہلِ علم کی طرف سے ہوا جو بعد میں ان کے مکتب علم ونظر کا ترجمان ثابت ہوا۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ اس کے بانی اور ابتدائی مصنفین حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی درس گاہ کے ممتاز فضلاء ہیں، جو حضرت شاہ صاحب کے میکدۂ علم و تحقیق کے رندانِ بلا نوش تھے، اور شاہ صاحب

کی تعلیم و تربیت نے ان میں علمی و تحقیقی ذوق پیدا کر دیا تھا، نقی صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب،
مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب، مولانا بدر عالم صاحب، مولانا قاضی زین العابدین صاحب وغیرہ
ندوۃ المصنفین کی خشتِ اولیں ہیں اور یہ سب کے سب حضرت شاہ صاحب کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان حضرات
نے اپنی بہترین خدمات سے ندوۃ المصنفین کو فضلائے دارالعلوم کا ترجمان بنا دیا تھا، بعد میں ان میں ہر ایک
ضرورت کے ماتحت دوسری علمی و دینی مصروفیات میں لگ گیا اور مفتی صاحب ندوۃ المصنفین کی قسمت
بن کر اسی میں پڑے رہے اور اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی، مگر کبھی انھوں نے اس کو ذاتی اور نجی
ادارہ کی حیثیت نہیں دی، مسلم پرسنل لاء بورڈ کا پہلا عظیم الشان اجلاس بمبئی میں ہوا جس میں مولانا
اکبرآبادی اور نقی صاحب نمایاں طور پر شریک تھے، قیام گاہ دونوں بھائی کی ایک ہی جگہ تھی، میں بھی
موجود تھا، ندوۃ المصنفین کے سلسلہ میں بات چلی اور دونوں بھائیوں میں اچھی خاصی برادرانہ جھڑپ ہوتی
رہی۔ نقی صاحب میرے بارے میں کہتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ بمبئی سے دہلی ندوۃ المصنفین میں چلیں، مگر
حالات ایسے ہیں کہ اُن کے قیام کا انتظام اطمینان بخش نہیں ہو سکتا، یہ قانع آدمی ہیں، تھوڑا بہت
کچھ انتظام ہو جاتا تو میں ان کو لے جاتا، اس پر مولانا اکبرآبادی صاحب نے کہا کہ میاں تم سے میں بار بار کہتا
ہوں کہ ندوۃ المصنفین کو کسی کھلی جگہ لے چلو۔ اور اس میں کچھ لوگوں کو رکھو، مفتی صاحب نے کہا کہ تم مجھے
یہ بات کہتے ہو اور خود ہمدرد نگر میں پڑے ہو، بار بار کہتا ہوں کہ یہ سب چکر چھوڑو اور ندوۃ المصنفین
کو آگے بڑھاؤ۔

مفتی صاحب کے رفقاء اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے ندوۃ المصنفین سے فکری طور سے منسلک
رہنے کے باوجود ان کو اس کی ترقی کے مواقع نہ مل سکے، اور مفتی صاحب اس کو قوم کی علمی امانت سمجھ کر
زندگی بھر اس کے امین رہ کر کوشش کرتے رہے کہ ادارہ زندہ رہے اور آگے بڑھے، راقم کے نام حضرت
مفتی صاحب کے جو خطوط ہیں، ان سے ندوۃ المصنفین کی بقاء و ترقی کے لئے ان کی تڑپ کا پتہ چلتا ہے،
چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ ۱۸ راگست ۱۹۶۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں "ادارے کے حالات
ناقابلِ بیان حد تک نازک ہیں، ہر مہینے یہی انتظار رہتا ہے کہ پاکستان سے سلسلہ کھلے اور کام جاری ہو

یہ پورا سال انتہائی پریشانی میں گذرا ہے، اور اب پانی سر سے اونچا ہے۔ افسوس دوستوں تک کو یہ احساس نہیں کہ ندوۃ المصنفین جیسے بہترین علمی اور مذہبی ادارے پر کیا بیت رہی ہے، جس روز بند ہو جائے گا دنیا حسرت کرے گی، بمبئی میں کام کی ابھی خاصی گنجائش ہے مگر کرے کون؟ غیر ضروری کاموں کے لئے روپیہ جمع ہو جائے گا، مگر ندوۃ المصنفین کو چند لائف ممبر، چند خاص ممبر اور بہت سے عام ممبر نہیں ملیں گے یا للعجب"

"۱۱ر مارچ ۱۹۷۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں "کیا عرض کروں پاکستان سے کاروبار بند ہونے سے ادارہ کا ڈھانچہ بگڑ رہا ہے، محض ساکھ ہے کہ گاڑی کھسک رہی ہے۔"

۲۹ر ستمبر ۱۹۷۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں "قانون فطرت کی رنگینیاں بھی عجیب ہیں، جب قوی جاندار اور مضبوط ہوتے ہیں۔ فرصت ہی فرصت رہتی ہے اور جس وقت بڑھاپا اپنی تمام ناتوانیوں اور برکتوں کے ساتھ آتا ہے، بے پناہ مشغولیتیں ہو جاتی ہیں، بہرحال جو کچھ بن پڑتا ہے ہو جاتا ہے۔"

۸ر جولائی ۱۹۷۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں "بہت دنوں سے اس ارادے میں ہوں کہ بمبئی آکر ادارے کا حلقۂ معاونین بنایا جائے، اس مشکل وقت میں اس سے بھی مدد ملے گی، کچھ لائف ممبر، کچھ معاونین خاص، اور ایک تعداد معاونوں کی مل جائے گی بشرطیکہ ایک ہفتہ قیام ہو اور کوئی دوسرا کام ساتھ نہ ہو اور احباب بھی بھرپور تعاون کریں۔"

۲۴ر اپریل ۱۹۷۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں "آپ حضرات کو اب ادارے کیطرف خاص توجہ کرنی چاہئے، نازک وقت آگیا ہے، ایسے ادارے روز روز قائم نہیں ہوا کرتے، آپ حضرات کم سے کم معاونین کے حلقوں کی توسیع کا کام کر سکتے ہیں۔"

۱۱ر دسمبر ۱۹۷۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔ "کیا عرض کروں؛ حوصلہ تو بہت کچھ ہے لیکن مزاج کی افتاد اور وسائل کی کمی کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہوں، دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر ندوۃ المصنفین اسی بے نوائی کے عالم میں ہے، ان دنوں میں اور بھی زیادہ دشواری ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ کارساز ہے۔"

ذاتی اور نجی خطوط میں تقی صاحب نے ندوۃ المصنفین کی بقاء و تحفظ کے بارے میں جس دل سوزی اور تڑپ کا اظہار کیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس ادارے کو مقصد زندگی سمجھتے تھے،

اسی طرح انہوں نے اپنے دوسرے مخلصوں اور دوستوں کو اس کے بارے میں لکھا ہوگا، یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ندوۃ المصنفین پر تباہی و بربادی کی جو آندھی چلی تھی اس میں اس کا وجود ختم ہو چکا تھا، اگر مفتی صاحب اس آندھی میں جمے نہ رہتے، تو یہ ادارہ اسی زمانہ میں ختم ہو گیا ہوتا، اسلامی علوم و فنون کی صدہا نادر و نایاب اور معیاری کتابیں وجود میں نہ آئی ہوتیں اور کئی اہلِ علم اچھے مصنفین کی صف میں نہ آتے، مفتی صاحب ادارے اور دوسری سیاسی قومی اور سماجی خدمات و مصروفیات کی وجہ سے خود زیادہ نہ لکھ سکے، مگر کئی لوگوں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو اہلِ قلم بنا دیا، اس وصف میں مفتی صاحب کو امتیاز حاصل ہے، بلند حوصلگی، عالی ظرفی، اور وسعتِ نظر کے ساتھ مفتی صاحب کا ذہن و مزاج ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا اور وہ اچھا کام کرنے والوں کی قدر شناسی اور ہمت افزائی کرتے تھے، ایک مرتبہ ندوۃ المصنفین میں مفتی صاحب کے بعض مخلصین و محبین بیٹھے تھے راقم بھی وہاں موجود تھا، بات جمعیۃ العلماء کی ہو رہی تھی، مفتی صاحب نے نہایت صاف و صریح لفظوں میں کہا کہ ہمارا مزاج اختلاف کا نہیں ہے، کام ہونا چاہیئے، بھوپال میں میرے محبین و مخلصین نے متوازی جمعیۃ بنانے پر اصرار کیا، مگر میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرا مزاج معرکہ آرائی اور جھگڑے کا نہیں ہے، مولوی اسعد میاں نوجوان آدمی ہیں، کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کام کر رہے ہیں، اس لئے اختلاف کر کے کام میں رکاوٹ ڈالنا دانشمندی کی بات نہیں ہے، بلکہ ہم کو موقع ہو تو تعاون کرنا چاہیئے"۔

مفتی صاحب کی سلامت روی اور عالی ظرفی نے ان کو ہر طبقہ میں مقبول بنا دیا تھا، اور وہ ندوۃ المصنفین کے علمی مرکز میں بیٹھ کر انواع و اقسام کی خدمات کیا کرتے تھے۔

الغرض قیام ندوۃ المصنفین سے وفات ۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء تک مفتی صاحب ندوۃ المصنفین کو سینے لگائے رہے، اس درمیان میں حوادث و فتن کے چھوٹے بڑے طوفان اٹھتے رہے، سرد و گرم حالات پیدا ہوتے رہے اور ندوۃ المصنفین کا وجود خطرہ میں پڑتا رہا، مگر مفتی صاحب عزم و ارادہ کا کوہ گراں بنکر اپنے حسن انتظام، حکمت عملی اور صبر و استقامت سے اس کی حفاظت و صیانت کرتے رہے جس

بقیہ صفحہ ۳۵

بڑے باپ کے بڑے فرزند

مفکرِ ملّت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

از محمد سالم صاحب بن مولانا عبدالاحد صاحب

محلہ ابوالبرکات سفید مسجد دیوبند۔ یو، پی

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم و بانی ندوۃ المصنفین دہلی ۱۳۱۹ھ میں اپنے آبائی وطن دیوبند میں پیدا ہوئے، آپ عارف باللہ حضرت مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی مرحوم و مغفور کے فرزند ارجمند ہیں۔ ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے علمی ذوق ودیعت فرمایا تھا اور پھر شروع ہی سے علمی ماحول میں پرورش پائی اس لئے خالص علمی اور ادبی ذوق کے آدمی تھے۔ طالب علمی ہی کے دور سے آپ کی ملکی اور سیاسی معاملات سے دلچسپی رہی چنانچہ اپنے طالب علمی ہی کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں جمیعتہ الطلباء کے عظیم الشان نظام کی بنیاد ڈالی جس نے ملی یا سی تحریکوں میں بالخصوص خلافت کے دور میں نہایت ہی شاندار کارنامے انجام دیئے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ایک عظیم شخصیت تھے۔ مرحوم دیوبند کے عثمانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے ایک علمی گھرانے میں جنم لیا۔ آپ کے والد حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب ایک بلند پایہ عالم تھے۔ ایک قابلِ قدر مفتی تھے۔ شرعی احکام اور ان کی جزئیات پر مرحوم کی گہری نگاہ تھی، اپنے ہمعصروں میں ان کا مقام نہایت اونچا تھا۔ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ یوں تو شاہ صاحبؒ کے اور بھی خلفاء تھے اور سبھی اپنی اپنی جگہ عظیم شخصیتوں کے مالک تھے لیکن ان سب میں مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کو گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے امتیاز کا درجہ حاصل تھا۔ علمی اور عملی بلندیوں پر فائز ہونے

کے باوجود مرحوم میں انتہائی انکساری بھی تھی۔ عزیز و اقارب کے یہاں آمد و رفت اُن کا معمول تھا وہ سب کے ساتھ محبت و شفقت اور عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ محلہ والوں کے ساتھ بھی اُن کا برتاؤ ایک مثالی برتاؤ رہتا تھا۔ بازار سے متعلق گھر کے تمام کام (مرحوم) خود کیا کرتے تھے بلکہ اہلِ محلہ کے کام انجام دینے میں بھی انھیں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا ـــــ اس کا اندازہ سید سلیمان ندوی کے اس آرٹیکل سے کیجئے جو انھوں نے مرحوم مفتی صاحب کی وفات پر معارف میں لکھا تھا۔

سونی رہے گی مسند افتاء دیر تک　　　اہلِ نظر میں تھا جو نمایاں گذر گیا

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا ہے، بے پناہ ذہانت، استاد اور خدا ترس والدین کی توجہ اور دُعا کی برکت سے بہت جلد ناظرہ قرآن مکمل کر لیا۔ اور پھر فوراً ہی حفظ کا سلسلہ شروع کرا دیا گیا۔ اس کی تکمیل بھی توقع سے پہلے ہی ہو گئی چنانچہ مولانا جلیل صاحب کیرانوی علویؒ نے جب دیوبند نے پہلی محراب سُنائی تو مفتی صاحب نے ان کی سماعت کی مولانا جلیل احمد صاحبؒ حضرت شیخ الہند صاحبؒ کے یہاں گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہتے تھے اور مفتی صاحب کے بے تکلف دوست اور ہم جماعت تھے۔ اس کے بعد چھوٹی مسجد میں مفتی صاحب نے تراویح میں قرآن پاک سُنایا حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی ہدایت کے بموجب مفتی صاحب روزانہ قرآن کریم میرے دادا اور اپنے ماموں حضرت مولانا عبد السمیع صاحب مرحوم کو سُنایا کرتے تھے اور اس کی پابندی کیا کرتے تھے۔ اسی لئے انھیں قرآن پاک بہت عمدہ یاد تھا اور پڑھنے کا انداز بھی نہایت دلکش تھا۔ آخر زمانہ تک آپ کا معمول تہجد میں قرآنِ پاک پڑھنے کا رہا ہے ـــــ آپ کی شادی خاندان کے بزرگ محمد ہاشم صاحب جن کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا محمد قاسم تھے جو لاولد رہے تھے، ان کی سب سے بڑی لڑکی کنیز فاطمہ سے ۱۶ ر جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ مطابق ۲ ر مارچ ۱۹۱۸ء کو ہوئی۔ آپ کو حج بیت اللہ کی دو مرتبہ سعادت بھی نصیب ہوئی ہے۔ اور اپنے والد صاحب کی ہدایت پر ہی ابتدائی کتابیں حضرت مولانا عبد السمیع صاحب سے پڑھیں۔ قرآنِ کریم اور اردو فارسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد عربی کا سلسلہ شروع ہوا تعلیم کا یہ سفر بھی خوش اسلوبی اور نیک نامی کے ساتھ چند سالوں میں پورا ہو گیا۔ اس سفر کے ساتھیوں میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حضرت مولانا بدر عالم صاحب

سیرٹھی) اور حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی وغیرہ حضرات ہے تھے۔
یوں تو ہر سال ہی دارالعلوم دیوبند سے اچھے فاضلین کی معتدبہ تعداد نکلتی تھی لیکن مفتی صاحب جس جماعت میں شریک تھے، یہ جماعت من حیث الجماعت اعلیٰ استعداد کے افراد پر مشتمل تھی۔ اور مفتی صاحب اپنے چند رفقاء کے ساتھ سرفہرست تھے۔ ان حضرات کو محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح کی شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے، علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل کے جس بلند مقام پر فائز تھے، وہاں تک لوگوں کی نگاہ بھی مشکل سے ہی پہنچتی تھی۔

افسوس ہے محدث دوراں گذر گیا شب زندہ دار صاحب ایماں گذر گیا

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے چونکہ ایک علمی گھرانے میں تربیت پائی اور بعد میں انھیں ادبی ماحول بھی ملا اور عظیم اساتذہ سے اکتساب علم کا زریں موقع بھی۔ ان سب باتوں نے ان کی شخصیت میں رکھی ہوئی مختلف النوع صلاحیتوں کو ابھارنے اور انھیں صحیح سمت دینے میں رہنمایانہ کردار ادا کیا۔

طالب علمی ہی کے زمانہ میں مرحوم نے علم و ادب میں مشغولیت کے ساتھ ساتھ ملکی و سیاسی معاملات میں بھی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اسی زمانہ میں مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں جمعیۃ الطلباء قائم کی۔ اور پھر ان کی سرگرمی عمل کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ جمعیۃ الطلباء نے سیاسی تحریکوں میں پورے شعور کے ساتھ حصہ لیا اور خاصا کام انجام دیا ——— آپ کی تعلیم ۱۳۲۴ھ سے شروع ہوئی اور ۱۳۴۱ھ میں آپ دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے ۱۳۴۲ھ میں فنون کی تعلیم حاصل کی۔ ہم اسی کے ساتھ ان کا تعلیمی نقشہ بھی پیش کریں گے۔ آپ نے کونسی کونسی کتاب کس سن میں پڑھی اور کتنے کتنے نمبرات حاصل کیے۔ آخر میں پورا تعلیمی نقشہ پیش کیا جائے گا۔ اور خاص بات ۱۳۴۱ھ میں آپ دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے اور اول نمبر کی کامیابی حاصل کی۔ اور ۱۳۴۳ھ میں دارالافتاء میں معین مفتی کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا اور اسی کے ساتھ معین المدرس بھی بنا دیے گئے۔
۱۳۴۶ھ میں اندرون دارالعلوم انقلابی کیفیات پیدا ہوئیں (جن کی تفصیل میں جانے کا

موقع نہیں) جس کے نتیجہ میں اپنے استاذ محترم کی معیت میں دارالعلوم کو چھوڑ کر جامع اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے گئے۔ جہاں پوری لگن اور احساس ذمہ داری کے ساتھ پانچ سال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ذمہ دارانِ مدرسہ نے آپ کی علمی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے دارالافتاء کی خدمات بھی سپرد کر دیں، جسے مرحوم نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تقریباً چار پانچ سال تک سرانجام دیا۔ اور دورہ حدیث کا سبق بھی۔ آپ شروع ہی سے ہندوستان کی تحریک سے وابستہ رہے، چنانچہ جب گاندھی جی نے نمک کی تحریک شروع کی تو ڈانڈی مارچ سے قبل آپ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے ہمراہ گاندھی جی سے ملے اور گاندھی جی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بتلائی جس میں نمک، گھاس اور پانی وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس موضوع پر موصوف نے بڑی طویل گفتگو کی۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس زمانے کے اخبار (ینگ انڈیا) میں اس سلسلہ میں جب آرٹیکل لکھا تو اس بات کا بالخصوص تذکرہ کیا۔ اور مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نگاہ کو اس حدیث کی روشنی میں اپنی تحریک کی تائید میں بڑے مؤثر طریقے سے پیش کیا۔

اسی زمانے میں باڑدولی میں ٹیکس کی عدم ادائیگی کی مہم شروع ہوئی اور ٹیکس ادا کرنے والوں کی جائیدادکوڑیوں کے مول فروخت ہونے لگی تو اس موقع پر آپ نے وہ تاریخی فتویٰ دیا جس میں فرمایا تھا: مسلمان اگر اپنے بھائیوں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ ان کی جائیداد کی نیلام کی بولی میں حصہ نہ لیں۔ یہ ظلم کی کھلی ہوئی حمایت ہے چنانچہ یہ فتویٰ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا اور اسی بناء پر بے شمار مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا۔ آپ پر بھی اس سلسلہ میں مقدمہ چلانے کا مسئلہ زیر غور تھا کہ اچانک حکومت سے گاندھی کا معاہدہ ہو گیا اور یہ بات آئی گئی ہو گئی لیکن اس فتویٰ کی بدولت، جامعہ ڈابھیل کو خیرباد کہنا پڑا۔ اس کے بعد ۱۳۴۹ھ کے شروع میں دیوبند تشریف لائے حسنِ اتفاق ہے کہ کلکتہ کے نامور تاجر شیخ فیروزالدین نے کولوٹولہ کی مسجد میں ایک درسگاہ بنوائی تھی اور اس میں ایک مفسر قرآن کی شدید ضرورت تھی بنا بریں حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کو لکھا کہ یہ خط نہیں بلکہ تار سمجھئے اور آپ اپنے اعتماد کا آدمی بھیجئے جو یہاں پر درسِ قرآن کی خدمت انجام دیدے۔ تو فوراً مفتی صاحب کو کلکتہ کے لئے روانہ کر دیا۔

وہاں پر تقریباً پانچ سال قیام رہا۔

۱۳۵۸ھ میں کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں بنگال میں بڑا کام کیا پھر کلکتہ میں فلسطین کانفرنس ہوئی، اس کی صدارت بھی آپ نے فرمائی۔ کلکتہ کے قیام کے دوران ہی مرحوم نے یہ عزم کر لیا تھا کہ ملازمت کے قلادہ کو اب ہمیشہ کے لئے گردن سے نکال کر پھینک دینا ہے۔ چنانچہ آپ اس جذبہ کے تحت دہلی تشریف لے آئے اور ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کے جامع نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اسی دوران ماہنامہ برہان بھی نکالنا شروع کر دیا۔ یہ دونوں کام بجائے خود انتہائی مشکل تھے اور پھر کم مائیگی کی صورت میں تو اور بھی زیادہ مشکل تھے بعض دوستوں نے منع بھی کیا کہ مفتی صاحب جو کام آپ لیکر چلے ہیں اُن کی اہمیت کا شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ کام شروع کر دینا تو آسان ہے لیکن اس کو باقی رکھنا اور آگے بڑھانا بہت مشکل ہے ـــــ لیکن مفتی صاحب کو اپنی علمی و ادبی اور انتظامی صلاحیتوں پر بھرپور بھروسہ تھا۔ اور وہ اس حقیقت سے واقف تھے۔

کوئی منزل بھی تو مشکل نہیں انساں کیلئے
عزم کامل ہو تو ہر راہ سے گذر جاتا ہے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا بدر عالم صاحب، وغیرہ رفقاء کے تعاون سے ندوۃ المصنفین بہت جلد ایک باقاعدہ ادارہ بن گیا، اور اس سے معتبر کتابیں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ آج ہمارے سامنے سیکڑوں کتابیں ہیں جو اس عظیم ادارہ سے شائع ہوئی ہیں اور جن کی افادیت اور اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ برہان مفتی صاحب کی حیات تک ایک معیاری رسالہ کی خصوصیات کے ساتھ پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اور آج بھی مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے عمید الرحمٰن صاحب اس کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے خونی ہنگاموں میں مفتی صاحب کا ندوۃ المصنفین بھی جلا کر ناک کر دیا گیا تھا جس میں لاکھوں روپے کا نقصان ہوا تھا۔ درحقیقت یہ اتنا بڑا اور بھیانک حادثہ تھا کہ مفتی صاحب کی جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو ہمیشہ کے لئے شکست خوردہ ہو کر رہ جاتا لیکن مفتی صاحب

کو قدرت نے زبردست حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ وہ پست ہمت نہیں ہوئے۔ مایوسی اُن کے یہاں کوئی چیز نہیں تھی۔ یہ آگ اسلاد شہ قرولباغ میں پیش آیا تھا۔ مفتی صاحب جامع مسجد کے علاقہ میں منتقل ہو گئے۔۔۔

اور خدا کے بھروسہ پہ پھر ندوۃ المصنفین کا کام شروع کر دیا۔ قدرت اپنے بلند ہمت بندوں کی ضرور مدد کرتی ہے۔ چنانچہ چند ہی سال میں یہ ادارہ پھر ترقی کی راہ پر آ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب بہت وسیع النظر انسان تھے۔ انھیں اپنے طبقے میں خامیوں کا شدت سے احساس تھا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے دینی ادارہ خصوصاً دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور و جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تصنیف، و تالیف اور مضامین لکھنے کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔

ادبی و صحافتی میدان میں دوسرے لوگ چھا رہے ہیں۔ یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے۔ میں اس کمی کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ اُن کا پروگرام یہ بھی تھا کہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ کو زیادہ وسیع کر دیا جائے اور ایک شعبہ ایسا قائم کیا جائے جس میں فضلائے مدارس کو موجودہ تقاضوں کے مطابق اُردو مضامین لکھنے کی مشق کرادی جائے۔ اور اس سلسلہ میں تجربہ کار ادیبوں سے مدد لی جائے۔ نیز ہمارے فضلاء، مدارس علوم عصریہ سے بھی قطعاً ناواقف رہتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کو وہ مقام نہیں ملتا جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں کم از کم انگریزی اور ہندی زبانیں تو انھیں آنی ہی چاہئیں مگر افسوس مفتی صاحب کا یہ حسین خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں خود مفتی صاحبؒ کی کوئی کتاب سامنے نہیں آئی۔ غالباً اس کی وجہ ادارہ کے نظم کو چست رکھنے میں ان کی مصروفیات مانع رہیں۔

دوسرے بہت سے علمی و سماجی اداروں اور تحریکوں، مسلم تنظیموں میں شمولیت نے انھیں یکسو نہیں رہنے دیا۔ اور تصنیف و تالیف کا کام بالکل یکسوئی چاہتا ہے۔ ویسے جب کوئی مضمون لکھتے تھے تو بہت اچھا لکھتے تھے۔ ابتداءً برہان کے اداریے مرحوم نے ہی لکھے ہیں وہ مصنف تو نہیں تھے لیکن مصنف گر تھے۔ انھوں نے کتنے ہی لوگوں کو مصنف و مؤلف بنا دیا کتنے ہی لوگوں کو مضمون لکھنا سکھوا دیا۔ مفتی صاحب کے مزاج میں متانت بھی تھی شرافت بھی۔ وضع داری بھی تھا

اور جرأت و ہمت بھی۔ ان میں حق گوئی بھی تھی خلوص و محبت صلہ رحمی بھی۔ ان کی خصوصیات نے
اُن کی شخصیت کو ایک عظیم شخصیت بنا دیا تھا۔ وہ کبھی کسی کو مایوس کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہر
ممکن حد تک تعاون کرنا اور اپنوں اور غیروں سب کے کام آنا اُن کا مزاج تھا، اُن کی فطرت تھی گفتگو
وہ کبھی برتری کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے، جس سطح کا آدمی اُن سے مخاطب ہوتا تھا اُسی کی سطح پر آکر
گفتگو کرتے تھے۔ اُن سے بات کرتے وقت بالکل احساس نہیں ہوتا تھا ہم بہت بڑے آدمی سے
گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹوں کو بولنے کا موقع دیتے تھے، اُن کے جذبات و خیالات
معلوم کرتے تھے۔ اپنے غریب رشتہ داروں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

شعبان ۱۳۶۷ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بنا دیے گئے اور مرحوم ایک
طویل زمانہ تک برِ اعظم ایشیا کی عظیم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے مؤثر رکن رہے ہیں۔
آپ کے مشورے دارالعلوم کے لئے ہمیشہ مفید ثابت ہوئے ہیں۔ وہ دارالعلوم یا کسی بھی علمی
ادارے میں وراثت کے سخت مخالف تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ادارے ملی ادارے ہیں، یہ باہمی
مشوروں ہی سے چلنے چاہئیں۔ اُن میں میراث کا جذبہ خود غرضانہ جذبہ ہے جس کا دین سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے ۱۹۴۷ء کے بھیانک فساد میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے دوش
بدوش رہ کر مظلومین کی زبردست مدد فرمائی ہے۔ اپنے آپ کو شدید خطروں میں ڈال کر انھیں حفاظتی
کیمپوں میں پہنچایا، اُن کے لئے کھانے وغیرہ کے انتظامات کرائے اور جو لوگ حالات کے
خونی مناظر سے گذر کر ملک چھوڑ دینا چاہتے تھے اُنھیں جمانے کی کوشش کی جس سے مسلمانوں کو
کافی تقویت ملی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب انھیں اپنا دستِ راست سمجھتے تھے۔

ان پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ مفتی صاحب کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ (جمعیۃ العلماء کے
دور کے مسلم کنونشن) میں مرارجی ڈیسائی نے فرقہ وارانہ فسادات پر بولتے ہوئے مسلمانوں کی خامیاں
بیان کرنی شروع کر دیں اور یہ کہ مسلمانوں کا فلاں رویہ غلط ہے۔ وہ ملک کے فساد کا خیال نہیں
رکھتے ہیں اُن کا یہ طریقہ پسند نہیں۔ وہ عمل پسند نہیں، اس اجلاس میں مفتی صاحب بھی موجود تھے،
کچھ دیر تو برداشت سے کام لیتے رہے اور جب دیکھا کہ مرارجی تو الزامات کا سلسلہ دراز ہی
کرتے جا رہے ہیں تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ مرارجی صاحب یہ کیا طریقہ ہے آپ تو اپنے

کو ملک کا بادشاہ سمجھ رہے ہیں۔ کیا مسلمانوں کو اپنی مرضی پر چلنے کا فرمان سُنانے یہاں آئے ہیں۔ آپ کو یہ بات پسند نہیں، وہ بات پسند نہیں۔ یہ بات آپ گوارہ نہیں کرسکتے وہ بات برداشت نہیں کرسکتے۔ آخر آپ ہیں کون کہ مسلمان آپ کی مرضی اور آپ کی خواہش کی تعمیل کریں۔ آپ کی اس جرأت مندانہ اور حقیقت پسندانہ تنبیہ پر مسٹر مرارجی جو ایک نہایت مضبوط سیاسی شخصیت کے نمایاں آدمی ہیں خاموش ہوگئے اور بالکل خاموش ہوگئے۔ اور انھیں اپنے غلط اندازِ فکر کا احساس ہونے لگا۔ اس کے بعد انھوں نے ہمارے علم کے مطابق کبھی اس انداز کی تقریر نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب میں جہاں انتہائی سنجیدگی تھی وہیں اظہارِ حق کی بے پناہ جرأت بھی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اپنی جماعت میں ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔

جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا جشن ولادت منایا گیا تو مدعو نسوی کی حیثیت سے آپ روس تشریف لے گئے اور امام صاحب مرحوم کی علمی حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور صحیح احادیث کا ایک ایسا مجموعہ جس پر کسی طرح سے بھی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا جاسکتا ہے تیار کرنے کے سلسلہ میں امام صاحب مرحوم کی امکان کی حد تک جد و جہد اور اُن کے فضل و کمال پر آپ کی تقریر بے حد پسند کی گئی۔ اس اجتماع کے علاوہ بھی اسی سفر میں مفتی صاحب نے مختلف مقامات پر تقریریں فرمائیں جس کی وجہ سے روس میں آباد مسلمانوں کو دینی معلومات بھی فراہم ہوئیں اور حوصلہ بھی پیدا ہوا نیز اُن کو اپنے مستقبل کے اُفق پر روشنی بھی نظر آنے لگی۔

۱۹۷۵ء میں آپ موتمر علماء المسلمین میں شرکت کے لئے بغداد تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے عالمی سطح پر مسلمانوں کی فلاح و بہبودی اور فروغ اسلامیہ کے موضوع پر نہایت جامع تقریر فرمائی اور دُنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے اعلیٰ درجہ کے علماء سے اپنی وسعتِ نظر اور علمی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ گو آج مفتی صاحب کی عظیم شخصیت ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ کے لئے اُن کی رہنمائی اور شفقتوں سے محروم ہوگئے ہیں تاہم مرحوم نے جو نقوش چھوڑے ہیں ہم اگر چاہیں تو ان سے رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے۔ افسوس اور بہت زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ مفتی صاحب کے بعد اُن کی اولاد میں کوئی بھی اُن کے علم و فضل اور ہمہ جہتی

خصوصیات کا وارث نہیں بن سکا۔ حق تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ راحت نصیب فرمائے اور اُن کی قبر پر ہمیشہ بہاروں کا سایہ رکھے اور اُن کی رحلت سے علمی دنیا میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے اُسے پُر کر دے۔ (آمین، ثم آمین)۔

دریائے فیض و مرکز و مقبولِ خاص و عام
وہ مقتدیٰ وہ لائق صد عزّ و احترام
آغوشِ رب میں سب کا فدائی چلا گیا!
افسوس دے کے داغِ جدائی چلا گیا!

اس کے بعد ہم آپ مفتی صاحب کا تعلیمی نقشہ پیش کر رہے ہیں جس میں ہماری مدد مولانا افضال صاحب محلہ شاہ رمز الدین، دیوبند نے فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی دارالعلوم دیوبند کی زندگی کا چارٹ

مفتی عتیق الرحمٰن ۱۳۲۴ھ	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۳۲۵ھ
سورۂ تکاثر ناظرہ نمبر ۵۰	سوا پارہ ناظرہ نمبر ۴۰
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۳۲۶ھ	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۳۲۷ھ
۵½ پارے حفظ نمبر ۵۰	۱۲ پارے حفظ نمبر ۴۸
مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۳۲۸ھ	مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۱۳۲۹ھ
۲۳ پارے حفظ نمبر ۵۰	قرآن پاک تمام حفظ نمبر ۴۸

آپ نے پہلی مرتبہ تراویح میں قرآنِ پاک دیوبند کے محلہ بھولن شاہ کی مسجد میں حضرت مولانا جلیل صاحب کا سُنا اور بعدِ مغرب حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب کو سُنایا۔

آپ نے پہلی مرتبہ قرآن تراویح میں اپنی چھوٹی مسجد میں ۱۳۳۵ھ میں سُنایا۔

اور سماعت کی حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو آن کے اکثر کتابوں میں استاذ بھی ہیں۔

فارسی کا تعلیمی چارٹ

۱۳۳۰ھ		۱۳۳۳ھ	
کریما	۴۹	حساب	۵۰
حمد باری	۴۵	بوستاں	۴۹
تشریح الحروف	۴۵	مالا بدمنہ	۴۷
۱۳۳۱ھ		رقعات عالمگیری	۴۳
مفید نامہ	۵۰	رقعات امان اللہ حسینی	۴۳
انشائے اردو	۴۹	۱۳۳۴ھ	
گفتگو نامہ	۴۷	حساب	۴۸
جمع تفریق حساب	۳۲	انوار سہیلی	۴۵
۱۳۳۲ھ		اقلیدس	۴۳
حساب	۵۳	سکندر نامہ	۴۱
حکایات لطیف	۵۰	احسن القواعد	۴۰
صفوۃ المصادر	۵۰	میزان	۵۳
رقعات نظامیہ	۴۱	منشعب	۵۲
گلستاں	۴۰		

جبکہ فارسی کی تمام تعلیم مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبندی والد ماجد مولانا مفتی شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان اور مولانا منظور صاحب والد مولانا خورشید صاحب سے حاصل کی۔

سنہ ۱۳۳۵ھ

کتاب	
فصول اکبری	۵۰
قال اقول	۵۰
نحو میر	۵۰
علم الصیغہ	۵۰
کبریٰ	۵۰
پنج گنج	۵۰
شرح مائتہ عامل	۵۰
صرف میر	۵۰

سنہ ۱۳۳۶ھ

کتاب	
تہذیب	۵۷
کافیہ	۵۳
ہدایۃ النحو	۵۲
شرح تہذیب	۵۱
قدوری	۵۱
منیۃ المصلی	۵۰

سنہ ۱۳۳۷ھ

کتاب	
شرح جامی بحث اسم	۵۴
شرح جامی بحث فعل	۵۴
اصول الشاشی	۵۳
قطبی تصدیقات	۵۳
میر قطبی	۵۱
نفحۃ الیمن	۵۱
شرح وقایہ اوّل	۵۰
کنز الدقائق	۴۸

سنہ ۱۳۳۸ھ

کتاب	
تلخیص المفتاح	۵۴
ہدایہ اولین	۵۰
مُلّا حسن	۵۰
مختصر المعانی	۵۰
میر زاہد رسالہ	۴۹
شرح عقائد نسفی	۴۳
میبذی	۴۱

سنہ ۱۳۴۰ھ

کتاب	
سراجی	۵۱
نخبۃ الفکر	۵۱
مشکوٰۃ شریف	۴۶
جلالین شریف	۴۶

سلسلہ ۱۳۴۱ھ

۱۳۴۱ھ

بخاری شریف	۵۲	موطا امام محمد	۵۱
مسلم شریف	۵۱	ابوداؤد شریف	۵۰
ترمذی شریف	۵۲	طحاوی شریف	۵۰
نسائی	۵۱	شمائل ترمذی	۵۰
		موطا امام مالک	۵۰
		ابن ماجہ شریف	۴۸

آپ اس سال پورے دارالعلوم میں اول نمبر رہے۔

۱۳۴۲ھ

توضیح تلویح	۵۳
قاضی مبارک	۵۳
بیضاوی	۵۲
تفسیر مدارک	۵۰
ہدایہ آخرین	۵۰
دیوان حماسہ	۴۸

شعبان ۱۳۴۲ھ میں فراغت ہوئی۔ اس زمانہ میں چالیس نمبر سے کم میں فیل ہوتے تھے۔ آخری نمبر ۵۰ تھے، اس کے بعد کے تمام نمبر خصوصی ہوتے تھے۔

جو کتابیں خارج میں حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب سے پڑھیں

پند نامہ	نورالانوار
مرقات منطق	ترجمہ قرآن پاک مکمل
سلم العلوم	مشکوٰۃ شریف
مقامات	

بیاد گار قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

ڈاکٹر معین الدین بقائی ، ایم ، بی ، بی ، ایس ، ایف ، سی ، جی ، پی ۔

یوں تو ازل سے ہی اس دنیائے ناپائیدار میں انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ایسے رہبران حق پیدا ہوتے رہے ہیں جو مخلوق کو خالق کی منشاء کے مطابق مائل بہ عمل کرتے رہیں ۔ اس صدی کے وسط میں یہ فرض اس خدمت کے لئے غالباً حضرت مفتی صاحب کے سپرد کیا گیا تھا ۔

حضرت مفتی صاحب کی پوری زندگی اسلامی نمونہ عمل کی آئینہ دار رہی ہے میں نے اپنے بچپن سے لے کر مفتی صاحب کی آخری سانسوں تک ان کو دیکھا ہے ، اور ہمیشہ ان کو صالح کم گو، خوش لباس ، نفیس ، ہمدرد ، صابر اور انتہائی ضبط کا مظاہرہ پایا ہے ۔ جن لوگوں نے مفتی صاحب کو قریب سے دیکھا ہے ۔ وہ بھی یقیناً اس بات کی تائید کریں گے ۔

اختلافی مسائل پر دوسروں سے بحث اور الجھنا ان کے مزاج کے خلاف تھا ۔ البتہ اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کے بعد وہ خاموشی اختیار کر لیتے ، یا انتہائی نرم لہجہ میں انکار کر دیا کرتے تھے میں نے کبھی اپنی بات کی تائید میں اونچے لہجے یا سخت الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر منواتے کبھی نہیں دیکھا ۔ ایسی شکل میں وہ فیصلہ دوسروں پر چھوڑ دیتے تھے ۔

ایک بار عید کے چاند کا مسئلہ تھا ۔ دہلی میں رویت ۲۹ رمضان کو نہ ہوئی ۔ ۳۰ کا روزہ رکھنا پڑا ۔ صبح دس بجے معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں عید ہو گئی ۔ جامع مسجد میں میٹنگ بیٹھ گئی ۔ لکھنؤ ٹیلیفون ملایا گیا ۔ فون پر جن سے بات ہوئی ان سے مفتی صاحب واقف تھے ، انہوں نے رویت کی تصدیق کی اور بتایا کہ آج یہاں عید ہو گئی ۔ مفتی صاحب نے ٹیلیفون پر

گفتگو ختم کرکے سب کو گفتگو کی تفصیل سنادی اور اس کے بعد خود روزہ کھول لیا۔ وہاں جو حضرات موجود تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب سے کہا کہ آپ گواہی دیجئے۔ مفتی صاحب ٹیلیفون کی شہادت کی شرعی حیثیت سے بھی واقف تھے اس لئے اس ٹیلیفون کو شہادت کا درجہ دینے سے گریز کیا۔ مگر خود روزہ کھول کر اپنی رائے عملی طور پر ظاہر کردی۔ وہاں آدھے گھنٹے تک اسی پر بحث ہوتی رہی کہ عید کا اعلان کیا جائے کہ نہیں۔ جو آدھے گھنٹے بعد ایک اور شہادت کے آنے کے بعد کردیا گیا۔ مگر مفتی صاحب نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی اور خود پہلے روزہ کھول کر عملی طور پر تصدیق کردی۔ جو لوگ اختلافی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنانے میں یقین رکھتے تھے۔ وہ مفتی صاحب کے درپردہ خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے مفتی صاحب ان کے ہمنوا بن جائیں۔ مگر مفتی صاحب نے ہمیشہ اس سے گریز کیا۔

مفتی صاحب شرعی حدود میں تمام آسائشوں کے قائل تھے۔ میں نے ان کو ہمیشہ انتہائی صاف ستھرے لباس، شیروانی اور ٹوپی میں دیکھا۔ میں نے مفتی صاحب کو کار خود چلاتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے مفتی صاحب کو میز اور کرسیوں پر کھانا کھاتے بھی دیکھا۔ یہ وہ حقیقت تھی جو ایک مفتی کے بارے میں ہماری خودساختہ شبیہ کے خلاف تھی۔ کیونکہ ہم نے اپنے نزدیک جو مفتی یا امام کا تصور بنا رکھا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ لمبا چغہ، ہاتھ میں تسبیح، تہبند باندھے، عمامہ پہنے۔ صرف مسجد میں رہتا ہو۔ اور مسجد میں آنے والے کھانوں پر گذر اوقات ہوتی ہو۔ اور دنیا کی آسائش اس کے لئے شجر ممنوعہ ہو۔ وہ ہماری نظر میں قابل اعتبار عالم ہوتا ہے۔

اور جب کبھی کسی کو ہم اپنی اس مفروضہ شبیہ کے خلاف دیکھتے ہیں

تو ہمیں اس عالم کے علم اور ایمان میں شک و شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسے عالم کے بارے میں انتہائی رائے قائم کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اور اس کے بعد کردارکشی سے بھی نہیں چوکتے۔ جیسے جیسے شعور بالغ ہوتا جاتا ہے تو یہ سب چیزیں ذہن میں خود بخود صاف ہوتی جاتی ہیں۔ اور نگاہ سطحیت سے آگے دیکھنے لگتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی اسلامی طرز کی عملی زندگی کا نمونہ تھی۔ اس میں بناوٹ یا ریاکاری کا دخل نہیں تھا۔ ان کی کسی تقریر میں اشتعال نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے کبھی ان کو کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔ اگر کبھی ان کے سامنے کسی کی برائی کی جاتی تو ایک مخصوص انداز میں وہ ہاں ٹھیک ہے۔ کہہ کر نہایت خوبصورتی سے موضوع بدل دیا کرتے۔

مجھے ایک طویل عرصہ تک مفتی صاحب اور ان کی فیملی کے دوسرے لوگوں کے علاج کا شرف رہا ہے۔ میں نے مفتی صاحب کو کسی شدید ترین تکلیف میں بھی چیختے چلاتے نہیں دیکھا۔ وہ تمام ہدایات کو سنتے اور اس پر پابندی سے عمل بھی کرتے۔ ہر دوا، انجکشن کو بخوشی قبول کرتے، اور ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ آخری ایام میں جب ان کو کینسر کو روکنے کیلئے بجلی لگائی گئی اس کے بعد کافی تکلیف رہی جسے انہوں نے نہایت ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور وہ نہایت CO-OPERATIVE اور منکسر المزاج مریض تھے۔ البتہ گھر کے دوسرے افراد کی علالت پر کافی متفکر ہو جاتے، مگر مریض کو تشفی اور تسلی دیتے تھے۔

آج مفتی صاحب ہم میں نہیں۔ میرے نزدیک ان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے مزاج کو اپنے قول و فعل و عمل سے زندہ کریں۔ اور دنیا کو امن اور عافیت کا گہوارہ بنائیں۔

ضروری گذارش

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ایک ہمہ گیر شخصیت

توفیق احمد نظامی ، ریسرچ شعبہ سیاسیات ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڈھ

مفتی صاحب کی یاد آتے ہی ان تمام حالات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے جس کا مقابلہ انھوں نے بڑی سنجیدگی اور ہمت سے کیا۔ مسلمانوں کے مسائل میں اور ملک کی ترقی میں جو انہیں دلچسپی تھی ، اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ میں اپنے طالب علمی کے زمانے سے... مفتی صاحب کے پاس دہلی جاتا اور جس لگن اور دلچسپی سے ان کو مسائل پر گفتگو کرتے پاتا ، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی قومی کاموں کے لئے وقف کر دی ہے ۔ ان کے پاس لوگوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور ہر شخص کے مسائل کو بڑی دلچسپی سے سنتے تھے۔ اکثر میں نے دیکھا کہ سعید احمد اکبرآبادی صاحب ندوۃ المصنفین کے دفتر میں موجود ہیں اور... مفتی صاحب ان سے اسلامی تاریخ پر محو گفتگو ہیں ، دونوں عالموں کی گفتگو سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ مفتی صاحب میں مزاح کا ایک خاص انداز تھا۔ اور اسی طرح بہت سے مسائل کو بڑی آسانی سے سمجھا دیتے تھے۔

جب میں دہلی جاتا اور ان سے ملاقات ہوتی تو بڑی محبت سے ملتے ، اور میرے آرام کا بے حد خیال رکھتے۔ اور اس وقت اگر ان کو کہیں باہر جانا ہوتا ، تو مجھ سے کہتے کہ تم یہاں آرام کرو اور اپنے کمرے کی چابی مجھ کو دیدیتے ، بہت ہی پر تکلف اور حساس شخصیت

کے مالک تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے معاملات میں انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اور برابر یہاں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ کئی بار مفتی صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی کے مقاصد پر روشنی ڈالی، اور ان کا خیال تھا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے ایک تعلیمی گہوارہ ہے جس میں اپنے اسلامی تعلیم اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے سائنس کے میدان میں ترقی کی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ۔ علی گڑھ مسلمانوں کے سیاسی سماجی اور مذہبی تقاضوں کو پورا کرے گا۔

مفتی صاحب کی وفات سے جس کمی کا احساس ہوتا ہے اس کو بیان کرنا مشکل ہے، ان کی شہرت۔ خدمات صرف اسی ملک کے لئے نہیں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ندوۃ المصنفین نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کا سہرا مفتی صاحب کے سر ہے۔

عمید الرحمٰن صاحب نے "برہان" کے ذریعہ جو مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر نکالا ہے اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اس کو پڑھنے کے بعد مفتی صاحب کی شخصیت کے لاتعداد پہلو سامنے آتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مفتی صاحب کی خدمات کو منظر عام پر لانے کی جدوجہد جاری رہے گی، ان کی خدمات و افکار ہی قوم کو صحیح راستہ دکھانے میں مدد کریں گے۔

از خورشید حسن قاسمی، رفیق دار الافتاء
دارالعلوم دیوبند

مفکرِ ملّت کے فتاویٰ
اور
علمی تحقیقات کا جائزہ

دارالعلوم دیوبند ایشیاء کی وہ عظیم یونیورسٹی ہے کہ جس نے گذشتہ صدی میں عالم اسلام کی متعدد ایسی نامور شخصیات پیدا کیں کہ جنہوں نے ملت کی فکری و عملی رہنمائی کر کے مسلمانوں کی تاریخ پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے۔

عالم اسلام کی ان ہی نامور شخصیات میں سے مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی صاحبؒ کی ذات گرامی بھی ہے، آپ کی ولادت باسعادت سنہ ۱۹۰۱ء کی ہے، اور سنہ ۱۹۱۰ء میں آپ نے جناب حافظ محمد نامدار خاں صاحبؒ دیوبندی کے یہاں حفظِ کلام اللہ کیا اور حضرت مولانا محمد یاسین صاحبؒ، اور مولانا منظور احمد صاحبؒ دیوبندی سے فارسی و ریاضی کی تعلیم حاصل کی، اور سنہ ۱۳۳۱ھ میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ اور آپ کو ان اولیاء کاملین اور سلف صالحین اور یگانۂ روزگار شخصیات سے شرف تلمذ ہوا کہ جن کی نظیر ملنا ناممکن ہے، فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ راقم الحروف کے جد المکرم عارف باللہ حضرت مولانا محمد ؟ حسن صاحبؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحبؒ سے آپ نے درس نظامی کی تکمیل کی فراغت کے بعد آپ نے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ عثمانی قدس اللہ سرہ العزیز

کی زیر نگرانی "فتویٰ نویسی" کی خدمت انجام دینا شروع کیں اور ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۴ھ میں آپ نے دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں افتاء کا کام انجام دیا اس کے بعد ڈابھیل تشریف لے گئے، جہاں آپ نے عرصہ تک فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی اور اس عرصہ میں آپ نے ملک اور بیرون ملک، اور عالم اسلام سے آمدہ فقہ وافتاء، تفسیر وحدیث سلوک وتصوف کلام وعقائد، وعظ وارشاد، عائلی قوانین اور اسلام کے ازدواجی نظام سے متعلق سینکڑوں سوالات کے جوابات تحریر فرمائے یہ فتاویٰ علوم ومعارف کا بیش بہا خزانہ ہونے کے علاوہ ایک لحاظ سے برصغیر پاک وہند کے ان تمام نظریاتی، سیاسی، معاشرتی رجحانات کی تاریخ بھی ہیں جو کہ گذشتہ ربع صدی میں امت کے مختلف طبقات میں پیدا ہوئے، ایک مفتی کے لئے فکری آفاقیت لوگوں کے احوال وتعامل سے واقفیت، عرف کا لحاظ، حدود شرع میں رہتے ہوئے گنجائش نکالنا اور فتویٰ میں آسان پہلو اختیار کرنا سہولت دینا، منشاء سوال کو پوری طرح محسوس کرنا وغیرہ وغیرہ یہ وہ شرائط ہیں کہ جن کا خیال رکھنا مفتی کے لئے ضروری ہوتا ہے چنانچہ آپ کے فتاویٰ میں ان امور کا پوری طرح لحاظ پایا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ سوال مختصر ہوتا ہے لیکن جواب میں تفصیل اور دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طریقہ پر بعض دفعہ سوال مفصل ہوتا ہے لیکن سائل کو محض نفس مسئلہ بتلا دینا، درحکم شرع کا اظہار کافی ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ نے فن فتویٰ نویسی کے لئے ضروری ان شرائط کا بھی پورا پورا خیال فرماتے ہوئے استفتاء کے جوابات تحریر فرمائے آپ کے فتاویٰ تفسیری نکات، حدیثی اشکالات کے جوابات اور فرق باطلہ کے رد سے متعلق بھی ہیں، اور بعض فتاویٰ فن افتاء کے مشکل ترین باب فرائض اور مناسخہ سے بھی متعلق ہیں ذیل میں بطور نمونہ حضرت مفتی صاحبؒ کے تین[۳] فتاویٰ پیش کئے جا رہے ہیں، فتویٰ ۱ ملاحظہ ہو۔

سوال:-

زید ہندہ کے ساتھ نکاح کرکے پردیس چلا گیا، بارہ[۱۲] سال تک کچھ خبر نہ لی ہندہ والدین کے یہاں رہی اب زید واپس آگیا کیا اس کی زوجہ اس سے خرچ کا مطالبہ کر سکتی ہے، اور گذشتہ سالوں کا نفقہ

لے سکتی ہے؟ (ب) دوسرے یہ کہ سالہائے گذشتہ میں ہندہ نے جو جائداد یا رقم پیدا کی ہو وہ رقم یا جائداد ہندہ کا شوہر اس سے جبراً لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب (الف):۔ اس صورت میں اگر شوہر گذشتہ نفقہ دینے پر رضامند ہو تو عورت لے سکتی ہے ورنہ نہیں۔ کتب فقہ میں تصریح ہے کہ نفقہ بغیر قضاء یا رضاء کے دین (یعنی قرض) نہیں ہوتا پس ظاہر ہے کہ شوہر کے ذمہ گذشتہ نفقہ کوئی قرض نہیں کہ اس کی ادائیگی پر وہ مجبور ہو درمختار میں ہے: والنفقة لا یصیر دیناً إلا بالقضاء او الرضاء ...... الیٰ ان قال لم ینفق علیها بان غاب عنها۔

(شامی ص ۲۵۵ ج ۲۔)

(ب) ہندہ نے جو کچھ جائداد اپنے کسب سے پیدا کی ہو وہ خود اس کی مالک ہے شوہر کو اس پر جبر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

عتیق الرحمٰن عثمانی، معین الافتاء، دارالعلوم دیوبند، ۱۳۴۳ھ۔

مندرجہ بالا فتویٰ میں مفتی صاحبؒ نے شوہر کے غائب ہو جانے کے بعد کے زمانے کے نفقہ کا مدار شوہر کی رضا پر قرار دیا، اور فرمایا کہ شوہر کے غائب رہنے کی مدت کے زمانہ کے نفقہ کی عورت حق دار نہیں البتہ اگر شوہر بخوشی گذرے ہوئے زمانہ کا نفقہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن عورت گذشتہ زمانہ کے نفقہ کی وصولی کے لئے شوہر کو مجبور نہیں کر سکتی ایسے مسئلہ میں شریعت اسلامیہ عورت کو یہ حق دیتی ہے کہ عورت شرعی کمیٹی یا دارالقضاء میں فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے شرعی کمیٹی یا دارالقضاء شرعی قانون کے تحت کارروائی کی تکمیل کے بعد اگر نکاح فسخ کر دے تو یہ نکاح فسخ ہو جائے گا۔ (تفصیل حضرت تھانویؒ کی کتاب "الحیلة الناجزة" میں اور مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی کی کتاب "کتاب الفسخ والتفریق" وغیرہ میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔)

اسی طریقہ پر حضرت مفتی صاحبؒ کا دوسرا فتویٰ ملاحظہ ہو۔

سوال:۔ ایک شخص نے مغرب کی نماز سے ایک دو منٹ پہلے عصر کی نماز پڑھی تو یہ ممنوع ہے یا مکروہ؟ اور اس نماز کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟؟

الجواب: ۔ اگرچہ یہ وقت اوقاتِ مکروہہ میں سے ہے مگر اس میں اس دن کی عصر کی نماز پڑھنا جائز ہے البتہ اس تاخیر اور ادا میں کراہت ضرور ہے لیکن اس کراہت کے باعث اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ اوّل تو فقہاء اس نماز کا اعادہ ضروری قرار دیتے ہیں جو کہ مکروہ بکراہت تحریمی ہو۔ اور یہاں یہ مسلم نہیں دوسرے یہ کہ اعادہ کا حکم وقت ہی کے اندر ہے وقت گذرنے کے بعد اعادہ ضروری نہیں، فتاویٰ قاضی خاں میں ہے۔

وعند احمرار الشمس الی ان تغیب الا عصر یومہ فانہ یجوز اداؤھا عند الغروب وفی الشامی وقیل الاداء مکروہ کما فی النسفی والحاصل انھم اختلفوا فی ان الکراھۃ فی التاخیر فقط دون الاداء فیھما فقیل بالاول الخ وقیل بالثانی مغلیہ مشی فی شرح الطحاوی والتحفۃ والبدائع والحاوی وغیرھا علی انہ المذھب وھو الاوجہ لحدیث مسلم الخ

وفی البحر من باب قضاء الفوائت یومر بالاعادۃ فی الوقت لابعدہ ونقل العلامۃ الشامی ھذا القول فی بحث کل صلوٰۃ اُدّیت مع کراھۃ التحریم تجب اعادتھا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: عتیق الرحمٰن عثمانی

معین الافتاء دارالعلوم دیوبند۔ ۱۳۴۴ھ

مذکورہ بالا فتویٰ غروبِ آفتاب سے کچھ قبل اسی روز کی نماز عصر تنگ وقت میں ادا کرنے سے متعلق ہے اس فتویٰ میں فقہ حنفی کی بنیادی رہنما کتاب، فتاویٰ شامی، البحر الرائق، فتاویٰ قاضی خاں وغیرہ کے عباراتِ فقہیہ سے غروبِ آفتاب سے کچھ قبل اسی روز کی نماز عصر ادا ہو جانے اور ایسے تنگ وقت میں نماز عصر ادا ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی نماز کے اعادہ واجب نہ ہونے پر دلائل قائم فرمائے گئے ہیں۔

اسی طریقہ پر حضرت مفکر ملت کا تیسرا فتویٰ ملاحظہ ہو۔ اس فتویٰ میں سوال نہایت مختصر ہے لیکن مسئلہ کی نوعیت اور سائل کی حیثیت کے پیشِ نظر حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب نہایت مدلل دیا ہے

تحریر فرمایا، اور قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی عظیم کتب سے مدلل جواب تحریر فرمایا، چنانچہ فتویٰ سے ملاحظہ ہو، یہ فتویٰ خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ پڑھے جانے اور بے نمازی کی بھی نماز جنازہ ادا کئے جانے سے متعلق ہے۔

سوال:۔ ایک شخص نے خودکشی کی، آیا اس کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے اور نماز جنازہ نہ پڑھی گئی ہو تو کیا حکم ہے؟

الجواب:۔

قاتل نفس کے متعلق حضرت امام اعظمؒ وامام محمدؒ کے نزدیک حکم یہ ہے کہ اس پر نماز پڑھی جائے۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے المسلمُ اذا قتل نفسہ فی قول ابی حنیفۃؒ ومحمد یغسل و یُصلّی علیہ۔ ج اول ص۱۵۶۔

اور کبیری میں ہے۔ وعندھما یصلّی علیہ واختارہ شمس الائمۃ الحلوانیؒ لان دمہ ھدر کالمیت حتف انفہ الخ۔

غرضیکہ ائمہ احناف میں سے اکثر کا مذہب یہی ہے کہ قاتل نفس پر نماز پڑھی جائے۔ حنفیہ نے اپنی کتابوں میں بدلائل قویہ اس کو ثابت کیا ہے۔ قال الحلبی فی شرح السنہ لانہ مسلم عامی غیر ساع فی الارض فسادًا فلا یقاس علی البغاۃ وقطاع الطریق الخ۔ پھر حدیث مسلم کہ جس کو مذہب حنفیہ کے معارض سمجھا گیا ہے حقیقت میں وہ بھی اس کی مخالف نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز نہ پڑھنا کسی خاص وجہ سے نہ ہو پس اس سے کلیۃً عدم صلاۃ کا حکم نکال لینا قابلِ غور ہے۔ کیونکہ جس طرح نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدیون پر محض زجراً نماز نہیں پڑھی بہت ممکن ہے کہ قاتل نفس پر بھی اسی باعث سے نہ پڑھی ہو۔ پس جس طرح مدیون پر نماز نہ پڑھنا آپ ہی تک محدود رکھا گیا، اسی طرح قاتل نفس کا معاملہ بھی سمجھا جائے علی الخصوص جبکہ حضورؐ نے صحابہ کرام کو اس پر نماز پڑھنے سے منع بھی نہیں فرمایا، جو حقیقت میں اس کی بین دلیل ہے کہ یہ فعل کسی حکم کلی کا اعلان نہ تھا بلکہ کسی خاص سبب و وجہ پر مبنی تھا، قال الحلبی فی جوابہ انہا لا تقتضی العموم

لاحتمال انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام علم منہ اصراً تمنع من الصلاۃ علیہ علی انہ لیس فیہ انہ منع الصحابۃ عن الصلوٰۃ علیہ فیحمل انہ امتنع عنہا کما امتنع عن الصلاۃ علی المدیون للزجر لا لانہا ممنوعۃ مطلقاً فلا دلیل علی عدم صلاۃ غیرہ علیہ السلام انتہیٰ. وقد قال علیہ الصلوٰۃ والسلام صلوا علی کل بر وفاجر الحدیث وتحقیقہ فی شرح المنیہ۔

(۲) تارکِ صلاۃ باتفاق جمہور علماء اہلِ سنت کافر نہیں فاسق ہے۔ صرف امام احمد بن حنبلؒ نے اس میں شذوذ کیا ہے کہ تارکِ صلاۃ کو کافر کہا۔ در ائمہ ثلاثہ ابوحنیفہؒ و مالکؒ و شافعیؒ اور ان کے متبعین بلکہ أداز اس کا خلاف کر رہے ہیں کما ہو مصرح فی کتب مذاہب الثلاثۃ، اور ظاہر ہے کہ ہر اس مومن پر کہ جس کے دل میں ایمان کی روشنی موجود ہے، اگرچہ کتنا ہی بڑا فاسق کیوں نہ ہو۔ نماز پڑھنی ضروری ہے لہٰذا تارک صلاۃ پر نماز پڑھنی چاہئے۔ اگر کسی وجہ سے نہ پڑھی جائے تو تین دن تک اس کی قبر پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے اس کے بعد نہیں، بہر حال جب کہ تارک صلاۃ کافر نہ ہو تو اس پر نماز نہ پڑھنے کی کوئی وجہ نہیں جن احادیث میں تارک صلاۃ پر کفر کا اطلاق کیا ہے تمام علماء نے ان کی توجیہہ کی ہے کیونکہ اطلاق کفر صرف تارک صلاۃ ہی پر نہیں بلکہ بہت سے مرتکبین کبائر پر کیا گیا ہے پس اگر ظاہری الفاظ پر ہی جمود کیا جائے تو پھر تارکِ صلاۃ کے سوا اور بھی بہت سے مسلمان کافر کہلائیں گے لامحالہ اس طرح کی تمام احادیث کسی ایسے محمل پر اُتاری جائیں گی جو دوسری نصوص صریحہ کے خلاف نہ ہو۔ اور بخاریؒ نے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر کفر دُون کفر کا باب رکھ دیا ہے۔

وقال الحلبیؒ ثم المراد بہذا الحدیث وامثالہ الخ، عند الجمہور الترک اعتقاداً وھو مختار وجوبہا شرح منیہ ص۱۲۔

الحاصل شروح حدیث مثل فتح الباری، عمدۃ القاری، نوویؒ وغیرہ میں ان احادیث کے معانی پر مفصل بحث موجود ہے۔ تفصیل دیکھنی ہو تو وہاں دیکھ لی جائے، یہاں تو صرف فتویٰ کی حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر جو کچھ مناسب تھا لکھ دیا گیا۔ حقیقت میں مجیب نے اپنے مدعا کیلئے جس قدر استدلال پیش

کئے ہیں وہ سب واقعیت سے دور ہیں۔ اور آیت ولا تصل علیٰ احد منھم۔ باتفاق مفسرین راس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بارہ میں نازل ہوئی ہے، اس کو صرف تارک صلاۃ پر نماز نہ پڑھنے سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اسی طرح ابن قیمؒ کا استدلال اگر صحیح مانا جائے تو تب بھی نماز نہ پڑھنے اور زکوٰۃ نہ دینے والے دونوں کی مساویانہ حیثیت نکلتی ہے حالانکہ زکوٰۃ نہ دینے والے کو کسی نے بھی کافر نہ کہا۔ فقط

واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ، عتیق الرحمٰن عثمانی۔

مندرجہ بالا تحقیقی فتویٰ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے خودکشی کرنے والے شخص اور بے نمازی کی نماز جنازہ ادا کئے جانے اور ایسے اشخاص کو سخت گنہگار ہونے کے باوجود دائرۂ اسلام میں ہی رہنے کا حکم فرمایا اور اس مسئلہ میں بخاری شریف، مسلم شریف، فتح الباری شرح بخاری، نووی شرح مسلم کی عبارات نقل فرمائیں، اور ائمہ اربعہ کا مسلک امام ابن قیمؒ کا نقطۂ نظر بھی پیش فرمایا، مندرجہ بالا فتاویٰ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے۔ کہ حضرت مفکر ملتؒ کے فتاویٰ آپ کے والد اجد مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے فتاویٰ کے مشابہ ہیں۔ اور آپ کا طرز استخراج اور طریقہ استنباط فقیہانہ و مجتہدانہ ہے دہلی، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور دیوبند سے جاری کئے گئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ گنج گرانمایہ اور فقہ اسلامی کا عظیم ذخیرہ ہیں۔ اور آپ کے فتاویٰ کو عظیم اسلامی انسائیکلوپیڈیا قرار دیا جاسکتا ہے۔ فقہی ابواب کی ترتیب جدید اور تدوین کے بعد زندگی کے ہر پہلو پر حاوی آپ کے فتاویٰ کو اگر کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ تو دیگر اکابر مفتیان ہند کی موجودہ کتب فتاویٰ اور اسلاف کے مجموعہ فتاویٰ کی طرح ارباب افتاء، وکلاء دانشور طبقہ اور عوام وخواص کے لئے رہبر ہدایت ثابت ہوں، اسی طریقہ پر اگر حضرت مفتی صاحبؒ کی دیگر علمی خدمات کا احاطہ کیا جائے اور مفتی صاحبؒ کی درسی تقاریر، عالم اسلام کی مختلف کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالات و مضامین اور ماہنامہ برہان کے ابتدائی دور کے اداریوں کو جمع کیا جائے۔ تو یہ بھی ایک

باقی ص پر

عظیم علمی کارنامہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ ضرورت اس کی بھی ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے جن کتب کے تراجم کئے ہیں یا حواشی تحریر فرمائے ہیں، جیسے علامہ ابن تیمیہؒ کی "الکلم الطیب" اور علامہ ابن جوزی کی کتاب "صید الخاطر" کے مفتی صاحبؒ کے کئے گئے تراجم و حواشی بھی منظر عام پر لائے جائیں تو یہ بھی آپ کی زندگی کا عظیم کارنامہ ہو۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی ہمہ گیر اور بین الاقوامی شخصیت کی خدمات کا تقاضہ ہے کہ آپ پر ملک کے مختلف شہروں اور علاقوں میں سیمینار منعقد کئے جائیں۔ اور آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر کئے جائیں اور آپ کی قائم کردہ دانش گاہ ندوۃ المصنفین کی تاریخی خدمات اور اس سے شائع ہونے والے لٹریچر کے ذریعہ برصغیر ہند و پاک کی تہذیب پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ درحقیقت حضرت مفتی صاحبؒ اکابر علماء دیوبند کے علوم کے امین اور زمانہ حال کے ایک فقیہ، محقق اور عظیم اسکالر ہیں، ایک عہد، ایک انجمن اور اپنی ذات میں ادارہ ہیں۔ آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آپ کی وفات سے جو کام درمیان میں رہ گئے ہیں خدا وند قدوس ان کی تکمیل کا نظم فرمائیں۔ آمین

وما ذلک علی اللہ بعزیز

بقیہ صفحہ ۳۲۷ حضرت مفتی صاحب اور ندوۃ المصنفین

کے نتیجہ میں اسلامی علوم و فنون کا بہت بڑا ذخیرہ کتابی شکل میں سامنے آیا، مفتی صاحب کے اس ایثار و اخلاق کی قدر و قیمت ہمیشہ محسوس کی جائے گی، اور اس کا تقاضا ہے کہ ندوۃ المصنفین زندہ و تابندہ رہے۔

مفکرِ ملت
حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

متبحر عالم، بے باک قائد اور مخلص رہنما

مولانا فقیہ الدین، مہتمم جامعہ رحیمیہ مہدیان نئی دلی۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی جماعتِ دیوبند کے ان مایہ ناز بزرگوں میں سے ہیں، جن پر پوری ملت رشک کناں ہے۔ دارالعلوم کے ایسے مایہ ناز سپوت جن پر خود مادرِ علمی فخر کرے۔ جمعیت علماء ہند کی قیادت، مسلم مجلس مشاورت کی صدارت اور ندوۃ المصنفین دہلی کا نظم و انصرام اس گلدستۂ علم و عرفان کے مختلف نکھار اور دیدہ زیب مناظر ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اپنے مجاہدانہ اور مخلصانہ کارناموں کے لئے ملتِ اسلامیہ کے مسیحا اور درد آشنا تھے۔ آپ ظلمت کدہ میں قندیلِ روشن اور گو ہر شب چراغ تھے۔ انہوں نے وقت اور مصلحت کے مدنظر شرر باری بھی کی، اور شبنم ریزی بھی۔ آپ کی دینی، قومی، علمی ادبی اور معاشرتی خدمات، علمی تبحر، فکری بلندی اور تکمیلِ مقصد کے لئے مخلصانہ اور سرفروشانہ قربانیاں ملتِ اسلامیہ کا عظیم ترین سرمایہ ہیں۔ ؎

اب نہ آئے گا نظر ایسا کمالِ علم دفن
گو بہت آئیں گے دنیا میں رجالِ علم دفن

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اساتذہ کے اصرار پر برسہا برس دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے منصب کو زینت بخشی۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے ساتھ ڈابھیل گئے، وہاں

تدریس وافتاء کا کام شان کے ساتھ انجام دیا۔ جنگ آزادی کی تحریک کو ہراول دستہ کی ضرورت پیش آئی تو مفتی صاحب صفِ اول کے مجاہدین میں شامل ہوئے۔ حکومت کے مظالم برداشت کئے۔ قید وبند کی تکالیف سے گذرے۔ اور دلیر، بے باک اور اولوالعزم مجاہد وطن بن کر سامنے آئے۔

۱۹۴۷ء کا ہنگامہ خیز کتنی قیامت لئے ہوئے تھا۔ کون تھا جو سر بکف میدان میں اترا۔ اور ملتِ اسلامیہ کی کشتی کا ناخدا بنا۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے مشیر کار اور دست راست مفتی عتیق الرحمٰن صاحب۔ مجھے یاد ہے، کس طرح راقم الحروف اور مفتی صاحب محلہ محلہ گلی گلی دن کے سناٹوں میں اور رات کی تاریکیوں میں دربدر پھر رہے تھے۔ ستم رسیدہ بھائیوں کی دادرسی، اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کی مہم میں سرگرداں و پریشان۔ نہ رات کا آرام نہ دن کا چین، اور نہ بھوک پیاس کا احساس۔ بفضلہٖ تعالیٰ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے، کسٹوڈین کا کالا قانون ختم کرایا۔ اور ہزار ہا مکینوں کو ان کے آشیانوں میں واپس لا کر بٹھایا۔

ملک آزاد ہوا، مگر فرقہ پرستی کا عفریت بلند حوصلہ ہوا۔ ہر طرف نسل کشی، مار دھاڑ اور قتل و غارتگری کا سیلاب، مگر حضرت مفتی صاحب اور ان کے رفقاء طوفانوں سے ٹکراتے رہے، آتش فروزاں میں کودتے رہے، اور مظلوموں کی دادرسی سے غافل نہ ہوئے۔

ایک وقت وہ بھی آیا، کہ مسلم مجلس مشاورت کی داغ بیل ڈالی۔ اور مختلف جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ اور صدر مشاورت کی حیثیت سے اتحاد و یکجہتی، اشتراک عمل اور جہدِ مسلسل کا بے نظیر نمونہ پیش کیا۔ دمِ آخر تک آپ کل ہند مسلم مشاورت کے صدر رہے۔

"ندوۃ المصنفین دہلی" اس زندۂ جاوید ادارہ کا نام ہے، جسے مفتی صاحب نے اپنے خون سے سینچا، اور ملک کا ممتاز، ہمہ گیر اور مقبول ترین ادارہ بنایا، تحقیق و نشریات کے ذریعے علم و ادب، تاریخ و دینیات کا قیمتی ذخیرہ ملت کے ہاتھوں میں پہونچایا، اور اسلاف کی امانت اخلاف تک پہونچانے کا فریضہ پورا فرمایا۔

دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ، کا ایجوکیشنل سوسائٹی جامعہ نگر نئی دہلی۔

اور ندوۃ المصنفین کی پوری ذمہ داری ان پر ڈالدی ۔ بحمد اللہ انہوں نے ذمہ داری کا حق ادا کیا، ادارہ کو چار چاند لگائے ۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد بھی مطبوعات کا سلسلہ برابر جاری ہے ۔ اور برہان پابندی سے نکل رہا ہے ۔

عمید الرحمٰن صاحب نے انتھک محنت کرکے مفکر ملت نمبر مرتب کیا اور معیاری شان سے اس کو شائع کیا ۔ حضرت مفتی صاحب پر سیمینار بھی عمید الرحمٰن صاحب کی ہی کاوشں اور محنت کا ثمرہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کو کروٹ کروٹ چین اور سکون سے نوازے، علیین میں قرار عطا فرمائے ۔ اور عمید الرحمٰن صاحب و دیگر صاحبزادگان اہل خاندان اور محبین کو ان کا مشن جاری رکھنے اور اس کو ترقی دینے کی توفیق سے بہرہ یاب فرمائے ۔

ع
مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

تاریخ ادبیات ایران

" تاریخ ادبیات ایران " تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ادبیات " ڈاکٹر رضا زادہ شفق " کی قابل تعریف تالیف ہے جس کو سید مبارز الدین رفعت نے اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے، اس کتاب میں ادبیات ایران اور ایران کی ثقافت کے ایک ایک گوشے پر دلپذیر اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے قبل اسلام ایرانی ادبیات سے لے کر موجودہ دور کی ادبیات، شاعری اور اس کے زبردست اثرات کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ایران کے ہر دور ... کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور کلام کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے ۔ ایرانی کلچر اور ثقافت اس کا نظم و نثر، شاعری اور شاعروں کے حالات پر آج تک اس پایہ کی کوئی کتاب اردو میں شائع نہیں ہوئی تھی ۔

صفحات ۵۰۰ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ سائز، قیمت ۸۰/- روپے مجلد ۱۰۰/- روپے

مفکرِ ملت

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی

چند یادیں چند باتیں

حاجی رفیع الدین۔ دہلی

مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی میرے لئے اہم ترین بزرگ ہیں۔ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے، ان سے فیض اٹھانے اور ان کے لطف و کرم کا مستحق بننے کی سعادت حاصل رہی۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور حضرت مفتی صاحب یہ تینوں اکابر میرے کرم فرما اور سرپرست رہے، اور ان کی خدمت اور صحبت کا شرف مجھے حاصل رہا۔

سنہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے، میں نے بالک ماتا سینٹر میں عظیم الشان جلسہ سیرت کرایا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا بصیرت افروز خطاب تھا۔ حضرت مفتی صاحب کی صدارت تھی۔ اجلاس سے قبل جناب مولانا قاری محمد ادریس صاحب امام جامع مسجد نئی دلی کے یہاں دعوت طعام تھی۔ اس میں قاری ادریس صاحب نے میرا مفتی صاحب سے تعارف کرایا۔ اور وہیں سے محبت اور عظمت کا تعلق شروع ہوگیا۔ میں ہفتہ میں ۲، ۳ مرتبہ مفتی صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہوتا۔ اور ان سے علمی دینی باتیں سنتا، حضرت مفتی صاحب کو اس خادم سے ایسا لگاؤ تھا کہ اگر میں اپنی کسی مصروفیت کے سبب زیادہ دن تک نہ پہونچتا تو حکم بھیجکر بلوالیا کرتے تھے۔

مفتی صاحب عمر اور روحانی بزرگ ہونے کے ساتھ میرے خاندانی بزرگ کا درجہ بھی رکھتے تھے۔ میں اپنے گھریلو مسائل میں بھی مفتی صاحب سے مشورہ لیتا تھا اور ان کی رائے پر عمل کرتا تھا۔ بسا اوقات ان کی رائے مجھے بہتر معلوم نہ ہوئی۔ مگر ان کی عظمت کے پیش نظر میں نے ان کے حکم کے مطابق کام کیا۔ تو نتیجہ سامنے آنے پر اس کام کا فائدہ سامنے آیا اور میں حیران رہ گیا۔ کہ مفتی صاحب خالص مذہبی آدمی ہیں۔ دنیا اور کاروبار کے معاملات سے ان کو کیا سروکار۔ مگر ان کی رائے ان معاملات میں بھی کتنی پختہ اور وزن دار ہے۔

میں کبھی ملاقات کے لئے ندوۃ المصنفین پہونچا۔ میں نے دیکھا کہ جناب یونس سلیم صاحب۔ جناب شفیع قریشی صاحب، سید حامد صاحب اور دوسرے بڑے بڑے وزیر، ممبر پارلیمنٹ اور ماہرین تعلیم بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھ کر کہ ان بڑے لوگوں کی مجلس میں میری شرکت نامناسب ہے، واپس ہونے لگتا۔ مفتی صاحب کی نظر پڑ جاتی، حاجی جی کہہ کر آواز دیتے۔ مجلس میں شریک کرتے، اور حاضرینِ مجلس سے میرا تعارف کراتے، مفتی صاحب کی غایت درجہ عنایت اور محبت سے میں شرمسار ہوتا۔

ایک روز حضرت امیر شریعت کے صاحبزادے جناب مولانا ولی رحمانی صاحب مجھ سے ملے، انہوں نے بتایا کہ مفتی صاحب نے آج مجلس میں آپ کا ذکر خیر کیا۔ توصیفی کلمات کہے۔ میرا دل چاہا، آپ سے مل کر جاؤں۔ یہ تھے مفتی صاحب کے الطافِ کریمانہ جو رہ رہ کر ہر قدم پر یاد آتے ہیں۔

مفتی صاحب کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ مجیب الرحمٰن صاحب ۔۔۔ منیب الرحمٰن صاحب، عمید الرحمٰن صاحب، اور نجیب الرحمٰن صاحب صاحبزادی کا نام مجیبہ صاحبہ ہے۔

مفتی صاحب کے تمام صاحبزادے ماشاء اللہ ہونہار اور لائق فائق ہیں۔ اور علمی اور سماجی کاموں میں مصروف ہیں۔ مگر عمید الرحمٰن صاحب، مفتی صاحب کے فکر و ذوق سے زیادہ ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنے زمانہ میں ہی ان کو اپنا نائب بنایا

مدرسہ ٹی جامعہ نگر نئی دہلی اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کے رکن رکین رہے۔ اور زبان وقلم اور فکر وشعور کے ذریعہ رہنمائی کا حق ادا کیا۔ حضرت مفتی صاحب آخر تک مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرگرم قیادت کرتے رہے۔

******

زکوٰۃ کے مستحق کون ہیں؟

علمی و قلمی جہاد کی اہمیت

مولانا شہاب الدین ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈیمی۔ بنگلور نمبر ۵۷

(۶)

لہٰذا اب علماء اور اہلِ مدارس کے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں: وہ یا تو جہا[د] علمی کا بازار گرم کریں یا پھر جہادِ عسکری میں کود پڑیں۔ بقولِ اقبال ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری　　کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی　　یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معترض نے "کتاب الزکاۃ" کی دو چار بحثیں دیکھ کر مضمو[ن] لکھنا شروع کر دیا ہے اور "کتاب الجہاد" نیز "کتاب العلم" کو ہاتھ تک نہیں لگایا ؎

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا　　صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گُل کا سُراغ

جہاد کی روح اور اُس کا فلسفہ

واقعہ یہ ہے کہ دُنیائے انسانی کا صلاح و فساد جہاد ہی پر موقوف ہے۔ جہاد د[ین] کی رُوح اور اُس کی "حرکت" کی ایک علامت ہے۔ اور انسان کو زمین میں خلیفہ مقرر کئے جانے کا صحیح مقصد ہی یہ ہے کہ زمین میں جو شر و فساد پایا جاتا ہے اُسے مٹایا جائے۔ خواہ وہ شر و فساد فکر و نظر (یعنی عقائد و افکار) کی دُنیا میں پایا جاتا ہو یا اخلاق و کردار کے میدان میں۔ غرض دنیا میں جو بھی فکری، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی بگاڑ اور ظلم و عدوان مختلف انسانی طبقات میں پایا جاتا ہے اسے دُور کرنا اور اسلامی عدل [illegible]

قائم کرنا خلافتِ ارض کا بنیادی مقصد ہے۔ اور اسی بنیادی غرض وغایت کی خاطر انسان کو دنیا میں "خلیفہ" بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ دورِ آدم سے لے کر ہر قوم اور ہر ملت کو مشروط طور پر اس کا موقع دیتا رہا ہے کہ وہ خلافتِ ارض کے تقاضے کے مطابق ظلم وعدوان اور شر وفساد سے دُنیا کو پاک کر کے عدل وانصاف اور حق وراستی قائم کرنے کی کوشش کرے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بنی اسرائیل کے سامنے یہ ربانی اُصول اس طرح پیش کیا گیا تھا:

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: موسیٰ نے کہا کہ اللہ بہت جلد تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ پھر وہ دیکھے گا کہ تم کس طرح کام کرتے ہو! (اعراف: ۱۲۹)

اور خود اُمتِ محمدی کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: پھر ہم نے تمہیں اُن (ظالم قوموں کو ہلاک کرنے) کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو! (یونس: ۱۴)

اس اعتبار سے خلافتِ ارض کے تقاضے کے مطابق دنیا کو شر وفساد سے پاک کر کے عدل وانصاف قائم کرنے ہی کا دوسرا نام جہاد ہے۔ جو وقت اور حالات کے مطابق زبان وقلم اور سیف وسنان دونوں طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جہاد اسلام کے پانچ ارکان (کلمہ، نماز، روزہ، زکاۃ اور حج) کے بعد سب سے بڑا اور چھٹا رکن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاد ہی کے باعث اسلام میں "زندگی" کی روح بیدار رہتی ہے اور اس کے پانچوں ارکان "متحرک" رہتے ہیں۔ ورنہ اگر جہاد نہ ہو تو اسلامی زندگی بالکل بے حرکت اور مُردہ ہو جاتی ہے۔ جہاد اسلام کے ارکانِ خمسہ کی اندرونی و بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرتا ہے اور کسی بھی اعتبار سے ان پر کسی قسم کی آنچ آنے نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے جہاد درحقیقت ارکانِ خمسہ کے محافظ یا باڈی گارڈ جیسی ہے جو اُن کے آگے پیچھے مُسلح ہو کر چلتا ہے اور اسلام کے ارکان وشعائر کی راہ مارنے والوں کا سر کبھی اپنے قلم سے قلم کرتا ہے تو کبھی شمشیرِ خارا شگاف سے ان کے چھکے چھڑا

دیتا ہے۔ اسی طرح جیسا موقع ہو ویسے ہی کی مدافعت [illegible]
جہاد کی اسی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ایمان باللہ کے فوراً بعد جہاد کو فرض قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ کا تقاضا ہے کہ اس کی مدافعت کے لئے ایک مومن و مسلم جہاد کے لئے ہمیشہ اور ہر آن خود کو تیار رکھے۔ کیونکہ تاریخ انسانی کی شہادت کے مطابق دنیا میں "ایمان باللہ" کو سب سے زیادہ خطرہ اس کے بیرونی دشمنوں ہی سے رہتا ہے۔ اسی لئے ارشاد باری ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ: پورے مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے (دین کے کسی بھی معاملے میں) شک نہیں کیا اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ (حجرات: ۱۵)

اس کی شرح حدیث رسول میں اس طرح ملتی ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ إِيمَانٌ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ. قِيلَ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم سے دریافت کیا گیا کہ کونسا عمل افضل ہے؟ فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔ پوچھا گیا کہ پھر اس کے بعد کونسا؟ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔[۲۳]

بعض حدیثوں میں ایمان باللہ کے بعد نماز کو اپنے وقت پر پڑھنا افضل ترین عمل قرار دیتے ہوئے جہاد کو مؤخر کیا گیا ہے[۲۴] تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد سب سے پہلی چیز جو بندے پر فرض ہوتی ہے وہ نماز ہی ہے۔ اور امام ابن ہمام کی توجیہہ کے مطابق نماز چونکہ فرض عین ہے جو مکرر ادا کی جاتی ہے اس لئے وہ جہاد سے افضل ہے، جب کہ جہاد کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ بلکہ جہاد ایمان اور اقامت صلاۃ (کی مدافعت) کی خاطر ہے۔ اس لئے وہ بالذات مقصود نہیں ہے۔ بلکہ نماز بالذات مقصود ہے۔[۲۵]

---

[۲۳] بخاری کتاب الایمان: ۱۲/۱
[۲۴] بخاری کتاب الجہاد: ۳۹۰/۱، مسلم کتاب الایمان: ۸۹/۱
[۲۵] فتح القدیر شرح ہدایہ: ۱۸۸/۵

اہل اسلام تہذیبی یلغار کی زد میں

غرض جہاد و ایمان باللہ اور اُس کے نتیجے میں عائد شدہ عبادات کی ادائیگی اور اُن کی حفاظت کے لئے بے انتہاء ضروری ہے ورنہ دشمنانِ اسلام اہلِ ایمان کو امن و امان کے ساتھ عبادت کرنے اور اپنے شعائرِ دینی کو ادا کرنے میں حارج بن کر ان کا راستہ روک سکتے ہیں۔ جیسا کہ موجودہ دور میں غیر مسلموں کی تہذیبی جارحیت ایک حقیقت دکھائی دیتی ہے جو مسلمانانِ عالم کے خلاف دُنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں برپا ہے۔ بلکہ آج دُنیا بھر کے مسلمان دراصل اقوامِ عالم کی تہذیبی یلغار کے گھیرے اور نرغے میں دکھائی دیتے ہیں۔ اور خاص کر مسلمان جن ممالک میں اقلیت میں ہیں وہاں پر اسلام کے نام لیواؤں کو اپنے عقائد و عبادات اور اپنی تہذیب کو بچانا سخت مشکل اور دُشوار ہوگیا ہے۔ کفار و مشرکین اور مُلحد و مادہ پرستوں نے چاروں طرف سے مُسلمانوں کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے اور ان پر اپنا گھیرا تنگ سے تنگ تر کرتے چلے جارہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً مختلف قسم کے فتنے اُٹھتے ہیں اور ان پر ثقافتی حملے کئے جاتے ہیں۔ اور آئے دن کوئی نہ کوئی نیا شوشہ چھوڑ کر یا نیا حملہ کرکے مُسلمانوں کے دین و ایمان کو چھلنی کیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال شیطان رُشدی کا فتنہ ہے جس نے پورے عالمِ اسلام کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

اگلے ادوار میں تو یہ ہوتا تھا کہ عالم اسلام پر فوجی و عسکری طور پر حملے کئے جاتے تھے اور مُسلمانوں کو قتل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مگر موجودہ دور میں اس کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اور اب بجائے انہیں قتل کرنے کے تہذیبی و ثقافتی حملے کرکے اِنہیں مرتد بنانے کی منظم سازشیں بین الاقوامی طور پر چل رہی ہیں۔ یورپی قومیں اس سلسلے میں دراصل صلیبی جنگوں میں اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتی ہیں اور وہ اسے اب تک بھول نہیں سکی ہیں۔ اور پھر وہ اسلام کی بڑھتی ہُوئی مقبولیت سے بھی خائف ہیں۔ لہٰذا وہ اسلام اور مسلمانوں کو ہر طرح سے زک پہنچانے کے درپے نظر آتی ہیں۔

غرض آج عالم اسلام جس نازک ترین دور سے گزر رہا ہے اُس کی مثال گزشتہ ادوار میں نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے غیر قوموں کی موجودہ تہذیبی جارحیت اور ثقافتی حملوں کا مقابلہ

صرف علمی میدان ہی باقی رہ سکتا ہے کسی اور میدان میں نہیں۔ [illegible]
سب سے بڑا جہاد ہے۔ عسکری جہاد تو پہلے ہی سے معطل ہے اور آج مسلمان عسکری جہاد کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ چیز اُن کی خودکشی کے مترادف ہوگی۔ لہٰذا اب علمی و قلمی جہاد کے سوا اور کیا چارۂ کار باقی رہ جاتا ہے؟ مگر اس قسم کے جہاد کو ایک "کاغذی جہاد" قرار دے کر اس کی قدر و قیمت کو ہلکا کرنے کی کوشش کرنا جہاد کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بلکہ یہ دراصل جہاد کی توہین ہے۔ حالانکہ جہاد (خواہ وہ عسکری ہو یا علمی) اسلام کے کامل ترین دین ہونے کی دلیل ہے۔ اگر اسلام میں جہاد فرض نہ ہوتا تو پھر یہ اُس کا ایک بہت بڑا نقص اور عیب ہوتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

اعلم أن أتم الشرائع وأكمل النواميس هو الشرع الذي يؤمر فيه الجهاد:

جان لو کہ شریعتوں میں سب سے زیادہ مکمل شریعت وہی ہوسکتی ہے جس میں جہاد کا حکم دیا گیا ہو۔[1]

تو اب سوال یہ ہے کہ کیا آج مسلمان اپنے اس فرضِ منصبی کو ادا کر رہے ہیں؟ کیا ہمارے مدرسوں میں "جہاد" کی تعلیم و تربیت ہو رہی ہے؟ یا طلبہ کے ذہنوں میں جہاد کی یہ نوعیت و اہمیت بٹھائی جا رہی ہے؟ کیا منطق و فلسفے کی موٹی موٹی کتابیں جیسے میبذی، مُسلّم، صدرا اور شمس بازغہ یا قدیم فلکیات کی کتابیں جیسے تصریح اور شرح چغمینی وغیرہ رٹا دینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے اکثر و بیشتر مدرسے غیر ضروری بلکہ فرسودہ علوم میں سر کھپاتے ہوئے اصل علوم سے غافل و بے پرواہ دکھائی دے رہے ہیں۔ اور جہاں تک جہاد کی اہمیت کا تعلق ہے اس میں تمام مدرسے اپنی کوتاہی اور لاپرواہی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور اس اعتبار سے آج ہمارے اربابِ مدرسہ کو نہ تو جہادِ عسکری کی ضرورت و اہمیت کا احساس ہے اور نہ جہادِ علمی کی اہمیت و افادیت کا۔ حالانکہ جہاد بعض علماء کے نزدیک اسلام کا چھٹا رکن ہے۔

حاصلِ بحث یہ کہ جہاد کے بنیادی مفہوم کے مطابق ایک طرف اہلِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحیح معنی میں دین کی دعوت و تبلیغ کریں تو دوسری طرف یہ بھی اشد ضروری ہے کہ وہ اسلام پر حملہ آور ہونے والی قوتوں کا بھی مقابلہ کریں۔ اگلے ادوار میں یہ حملہ فوجی و عسکری اعتبار

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۷۰ مطبوعہ مصر

سے ہوا کرتا تھا۔ مگر آج یہ حکمتِ عملی STRATEGY بدل گئی ہے۔ اور اب بجائے عسکری یلغار کے تہذیبی و ثقافتی یلغار ہونے لگی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں محاذوں پر اپنے تمام وسائل اور اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ لڑیں اور باطل کے مقابلے میں حق کو غالب کرنے کی کوشش کریں۔ یہی انبیائی عمل ہے جو اس وقت تمام مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے۔

اور جہاد جس طرح بعض صورتوں میں فرضِ کفایہ اور بعض صورتوں میں حالات کی نزاکت کے اعتبار سے فرضِ عین بھی ہو سکتا ہے (جب کہ "نفیرعام" ہو جائے) اسی طرح آج دنیا بھر کے مسلمان جن مصائب و آلام سے دوچار ہیں اُن کے مدنظر جہادِ علمی و قلمی کے فرضِ عین یا "نفیرعام" کا اعلان کیا جا سکتا ہے کہ اس مقدس جہاد میں ہر مسلمان اپنی اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے کر اس فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرے۔ اور یہ پوری ملّتِ اسلامیہ کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے ؎

دُنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

لا الٰہ الّا اللہ کی حقیقت اور عصرِ جدید کا سب سے بڑا معرکہ

اُوپر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اُس کے ملاحظہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو گئی کہ اسلام میں ایمان باللہ کے ساتھ ہی جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو ایمان باللہ کے تقاضے کے تحت جہاد کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے جہاد اصلاً ایمان "پھیلانے" اور اُس کی "مُدافعت" کرنے کا نام ہے۔ قرآن و حدیث نیز ائمہ و فقہاء کے کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔ جیسا کہ تفصیلات گزر چکیں۔ دعوتِ اسلامی میں "ایمان باللہ" ہی اصل الاُصول اور تمام عقائد و عبادات کی جڑ بنیاد ہے۔ اور ایمان باللہ کا مطلب ہے لا الٰہ الّا اللہ کا اقرار و اعتراف۔ یہی اسلام کا کلمہ ہے جس کو بلند کرنے کا نام "اعلائے کلمۃ اللہ" ہے۔ اور یہ جہاد کا بنیادی ہدف و مقصد ہے، خواہ وہ فوجی و عسکری ہو یا علمی و قلمی۔

اور لا الٰہ الا اللہ (جو بظاہر ایک سیدھا سادہ سا جملہ معلوم ہوتا ہے) صرف ایک کلمہ یا ایک بات کا محض اقرار و اعتراف نہیں بلکہ یہ مکمل فلسفہ اور طرزِ فکر کا نام ہے۔ اور [illegible] تمام

مُشرکانہ و مُلحدانہ اور باطل فلسفوں کے مقابلے میں توحیدی فلسفے اور توحیدی نظام کا اعلان ہے۔ چنانچہ دُنیا میں دورِ آدم سے لے کر موجودہ دور تک نظامِ توحید کا مقابلہ ہمیشہ مُشرکانہ اور مادہ پرستانہ فلسفوں سے رہا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک نظریاتی جنگ اور کشمکش ہر دور میں برپا رہی ہے۔ اور تمام انبیاء اسی لا الٰہ الاّ اللہ کا پرچم بلند کرنے کی غرض سے دُنیا میں تشریف لاتے اور اقوامِ عالم کو شرک و الحاد کے مقابلے میں توحید کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اور یہ فکری و نظریاتی جنگ موجودہ دور میں پورے آب و تاب اور پورے زور و شور کے ساتھ چل رہی ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں جتنے بھی مُلحدانہ و مادہ پرستانہ فلسفے اور قسم ہا قسم کے افکار و نظریات موجود ہیں اور جو نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے میں سرگرمِ عمل دکھائی دے رہے ہیں، ان سب کی بنیاد کسی نہ کسی اعتبار سے جدید سائنسی افکار و نظریات پر ہے۔ اور ان سائنسی افکار و نظریات میں اگرچہ اُصولی طور پر انکارِ خُدا یا "لادینیت" کی گنجائش تو موجود نہیں ہے مگر مادہ پرست اور الحاد پرور لوگ ان سائنسی افکار و نظریات سے (جو اصلاً خُدا پرستی کی تائید میں ہیں) فلسفیانہ اعتبار سے غلط نتائج اخذ کرتے ہُوئے (یعنی انحرافی طور پر تحقیقاتِ جدیدہ کو غلط رُخ دیتے ہُوئے) محض اپنی خواہشاتِ نفس کی بنا پر دُنیا بھر کے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔

اس حیثیت سے موجودہ دور میں لا الٰہ الا اللہ یا خُدا کی توحید کا عقیدہ مُشتبہ ہو گیا ہے۔ اور آج منکرینِ خُدا اس کو اگلے دور کی نشانی یا دقیانوسیت سے تعبیر کرتے ہُوئے اہلِ ایمان کا استخفاف کرتے ہیں اور ان پر بنیاد پرستوں کی پھبتی کستے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ اور "سائنٹفک" دور میں "خُدا کی بات" کہنا فرسودگی کی علامت ہے۔ سائنس نے تمام کائنات اور مادہ کا ایک ایک ذرہ چھان ڈالا، بلکہ ایک ایک ذرہ کو توڑ ڈالا، مگر خدا کا وجود کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ لہٰذا اب اس "فرسودہ" عقیدہ کو تہہ کر کے رکھ دینا چاہئے۔ اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس کا لازمی اور منطقی تقاضا یہ ہوگا کہ اب گویا کہ "مادہ" ہی کو "خدا" بنا لینا چاہئے۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کی رُو سے وہی تمام اشیاء کی "عِلّتِ اُولیٰ" یا "عِلّتُ العِلَل" ٹھہرتا ہے۔ گویا کہ اول و آخر مادہ ہی مادہ ہے اور اس کے سوا اور شے یا کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی "شرک" ہی کا ایک نیا رُوپ ہے۔ اگرچہ مادّہ پرست

اپنی زبان سے "خدا" کا لاکھ انکار کریں مگر واقعہ کے اعتبار سے اُنہیں کوئی نہ کوئی "خدا" تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں رہ جاتا۔ اور اس لحاظ سے مادہ پرستوں اور الحاد پرور لوگوں کا مرتبہ درحقیقت روایتی قسم کے مشرکین سے بھی زیادہ بدتر نظر آتا ہے۔ مشرکین کم از کم خدائے خلاق کو اپنا "معبودِ برتر" یا اپنا "سب سے بڑا خدا" تو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر مادہ پرستوں کی نظر میں سوائے "مادہ" کے اور کوئی خدا موجود نہیں ہے۔ گویا کہ اُن کی نظروں میں یہی پہلا اور سب سے بڑا خدا ہے۔

غرض آج مادہ پرست اور ملحد لوگ نہایت درجہ بلند آہنگی کے ساتھ نہ صرف اپنی "مادیت" اور "مادہ پرستی" کا پرچار کر رہے ہیں بلکہ نشر و اشاعت کے تمام وسائل پر قابض ہو کر بڑے زور و شور کے ساتھ خود اہلِ ایمان کو بھی ملحد و مادہ پرست بنانے اور ہماری نئی نسلوں کو ہم سے چھیننے کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ تو ایسے نازک ترین حالات میں کلمۂ توحید کی مدافعت کرنا اور ہمارے نوخیزوں کو ایمان کی اصلیت سے روشناس کراتے ہوئے صحیح اسلامی دعوت پیش کرنا کیا جہاد نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ موجودہ دور کا سب سے بڑا معرکہ ہونے کی وجہ سے یہ صرف جہاد ہی نہیں بلکہ اسے وقت کے سب سے بڑے جہاد ہونے کا فتویٰ صادر کیا جا سکتا ہے۔

اس لحاظ سے موجودہ دور میں کرنے کا صحیح کام یہ ہے کہ عصرِ جدید کے ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فلسفوں اور منحرف افکار و نظریات کا علمی و تحقیقی انداز میں مقابلہ کیا جائے اور گمراہ قوموں اور گمراہ انسانوں کو دلیل و استدلال کی روشنی میں بتایا جائے کہ توحید کی حقیقت کیا ہے اور اس کے مقابلے میں مادی افکار و نظریات غلط کیوں کر ہیں؟ مگر اس کے لئے محض فتوے جاری کر دینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ علمی انداز میں باطل و منحرف افکار و نظریات کا تحلیل و تجزیہ کر کے پورے عقلی و سائنٹفک دلائل کی روشنی میں کلمۂ توحید کی حقانیت ثابت کرنی چاہیئے۔ ورنہ موجودہ دور کے انسانوں پر اتمام حجت نہیں ہو سکتی جو ایک پیمبرانہ عمل ہے۔ مگر اتمام حجت کے لئے اس راہ میں جدید سائنسی علوم اور جدید فلسفوں کا مطالعہ بھی ضروری ہوگا۔ کیونکہ جدید سائنسی علوم اور جدید تحقیقات کی بنیاد ہی پر نئے نئے افکار و فلسفے وجود میں آتے ہیں۔ اس اعتبار سے جب تک جدید علوم کو بنیاد نہ بنایا جائے موجودہ دور کا انسان کسی بھی بات کو سنجیدگی کے ساتھ

سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آج یہ علوم و فنون نوعِ انسانی کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا کلمۂ توحید کی برتری عقلی و سائنٹفک نقطۂ نظر سے ثابت کرنے کے لئے جدید سائنسی علوم کو بنیاد بنا کر گفتگو کرنا ضروری ہوگا۔ اور موجودہ دور میں جو شخص اس طریقے کے مطابق تحقیق و تفتیش کر کے یہ فریضہ بطورِ احسن انجام دے گا وہی موجودہ دور کا سب سے بڑا مجاہد و مجدد ہوگا۔ اور وہی انبیائے کرام کا صحیح معنی میں وارث کہلا سکے گا۔

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

قرآنِ حکیم کے دلائل اور سائنسی افکار

قرآنِ حکیم کا اصل موضوع توحید، رسالت اور عقیدۂ آخرت کا اثبات ہے۔ مگر ان میں بھی عقیدۂ توحید کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں جتنے بھی علمی و عقلی دلائل مذکور ہیں ان کا اکثر و بیشتر حصہ اثباتِ توحید ہی سے متعلق ہے۔ اور اس سلسلے میں جدید سے جدید تر ہر قسم کے علمی و سائنٹفک دلائل زیرِ بحث آسکتے ہیں تو اس سلسلے میں دو بنیادی اصولوں کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ قرآنِ حکیم موجودہ دور کی ذہنیت و عقلیت کے لحاظ سے بھی ہمارے لئے ایک رہنما اور رہبر کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں ہر دور کی ذہنیت اور ہر دور کے احوال سے نپٹنے کا سامان پوری طرح ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اور قرآن میں جو "آفاقی" اور "انفسی" دلائل (یعنی سائنٹفک حقائق و معارف) رکھ چھوڑے ہیں وہ اس سلسلے میں ہماری پوری پوری رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ : ہم ان (منکرین) کو عنقریب اپنے (وجود اور اپنی وحدانیت کی) نشانیاں دکھا دیں گے، ان کے چاروں طرف بھی اور خود ان کی اپنی ہستیوں میں بھی، تاآنکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ کلام برحق ہے۔ (حٰم سجدہ: ۵۳)

یہی حقیقت ایک دوسرے اسلوب میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ ۔ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ : یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اور خود تمہاری ہستیوں میں بھی۔ تو

کیا تمہیں نظر نہیں آتا ؟ (ذاریات : ۲۰ - ۲۱)

اس قسم کی بے شمار آیتیں موجود ہیں، جن کا دائرہ جمادات، نباتات، حیوانات اور افلاک تک تمام مظاہر عالم تک وسیع ہے۔ اور ان میں علم جمادات (جیالوجی)، علم کیمیا (کیمسٹری)، طبیعیات (فزکس)، حیاتیات (بیالوجی) اور فلکیات (اسٹرانمی) وغیرہ علوم سے متعلق تمام جدید ترین حقائق و معارف اور اکتشافاتِ جدیدہ سما سکتے ہیں، جن کے ملاحظہ سے کتاب الٰہی کا چہرہ روشن ہو جاتا ہے اور شکوک و شبہات کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک حیرت انگیز کتاب حکمت ہے جس میں ہر دور سے نبرد آزمائی کے لئے ہر قسم کے علمی "ہتھیار" موجود ہیں۔ مگر آج ہمارے دماغ اتنے زنگ خوردہ ہو چکے ہیں کہ ہمیں خبر ہی نہیں ہے کہ اس کتاب حکمت میں کیسے کیسے ہتھیار اور کیسے کیسے اسباق و بصائر موجود ہیں جو عالم انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے تریاق کا حکم رکھتے ہیں۔

اور اس سلسلے میں دوسرا اُصول یہ ہے کہ "سائنسی افکار و نظریات" اور " فلسفیانہ افکار و نظریات" میں بنیادی فرق ہے۔ سائنسی افکار و نظریات یا اکتشافاتِ جدیدہ جو "قوانینِ فطرت" کا درجہ حاصل کر چکے ہوں، وہ چونکہ غیر جانب دارانہ تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے وہ وہی اُصول ہیں جو قرآن حکیم کے دعوؤں کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی اس کائناتِ مادی سے متعلق " قوانینِ فطرت" سے جو منطقی نتائج نکلتے ہیں وہ خُدا کے وجود اور اس کے ثبوت میں " سائنٹفک دلائل" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انہی دلائل کو قرآن حکیم میں "آیات اللہ" یعنی "اللہ کی نشانیاں" یا نظام فطرت کے اسباق و بصائر کہا گیا ہے۔ اور یہ "آیات" منطقِ صحیح کی رُو سے مادہ پرستانہ یا انحرافی افکار و نظریات کی تردید کرنے والی ہوتی ہیں۔ اور اس اعتبار سے دنیا کی ہر چیز اور مادّہ کے ایک ایک ذرّہ میں " خُدائی نشانات " ودیعت کر دئے گئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر مادی دُنیا کا ذرہ ذرہ " لا الٰہ الا اللہ" کا کلمہ پڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ ہائیڈروجن جیسے بسیط ذرہ (عُنصر) سے لے کر یورانیم جیسے پیچیدہ ذرہ تک تمام کے تمام عناصر اسی خدائے وحدہٗ لاشریک کی شہادت دے رہے ہیں۔ اور اس نقطۂ نظر سے مادہ کی " توحیدی تفسیر" میں دفتروں کے دفتر سیاہ کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ایک

مادہ پرست کو سوائے "بخت و اتفاق" کے اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ جب کہ مادہ میں ودیعت شدہ انتہائی نفیس و بے داغ نظام کسی اندھے بہرے عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ ایک انتہائی ذہین اور عالی دماغ ہستی کی کارفرمائیوں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ فریضہ حاملینِ قرآن یعنی علمائے اسلام پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اس نقطۂ نظر سے کام کر کے نوعِ انسانی کی صحیح اور بروقت رہنمائی کریں۔ ورنہ نوعِ انسانی مزید گمراہ ہوگی ؎

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم   گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

دجالی فتنے کا ایک رُوپ

غرض موجودہ دور میں مادہ پرستانہ افکار و نظریات پر سائنس کا لیبل چڑھا کر عوام الناس کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں ہر روز کوئی نہ کوئی نیا نظریہ یا نیا ازم فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نمودار ہو کر عوام پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ اور عوامی اذہان ان مسموم نظریات کے سحر سے مسحور و مرعوب ہو کر خود کو ان کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور نظر آ رہے ہیں۔ اس طرح آج نوعِ انسانی جدید مادی فلسفوں کے فروغ کے نتیجے میں ایک بہت بڑے فتنے میں مبتلا ہے۔ اور یہ مادی افکار و فلسفے جو بظاہر دلفریب اور خوشنما دکھائی دیتے ہیں بباطن انتہائی تاریک اور زہرناک ہیں۔ اور یہ غالباً دجالی فتنہ کا ایک واضح رُوپ ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں دجال کی دو واضح علامتیں بیان کی گئی ہیں: (۱) اول یہ کہ وہ کانا یعنی ایک آنکھ والا ہوگا۔ (۲) اور دُوم یہ کہ اُس کی پیشانی پر واضح طور پر "کُفر" لکھا ہُوا ہوگا جسے ہر آنکھوں والا شخص دیکھ سکتا ہے۔

مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا أَنْذَرَ قَوْمَهُ الْأَعْوَرَ الْكَذَّابَ ۔ إِنَّهُ أَعْوَرُ وَ إِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ، مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ كَافِرٌ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے دنیا میں جس نبی کو بھی بھیجا اُس نے اپنی قوم کو کانے اور جھوٹے (دجال) سے ڈرایا ہے۔ یقیناً وہ کانا (ایک آنکھ والا) ہوگا۔ اور تمہارا رب کانا نہیں ہو سکتا۔ دجال کی پیشانی پر کافر لکھا ہوگا[۵۵]

(باقی آئندہ)

---

[۵۵] بخاری کتاب التوحید : ۱۷۲/۸، مسلم کتاب الفتن : ۲۲۴۸/۴

ایک دوسری حدیث کے مطابق دجال داہنی آنکھ کا کانا ہوگا: وَاِنَّ مَسِیْحَ الدَّجَّالِ اَعْوَرُ عَیْنِ الْیُمْنٰی ۔ کَاَنَّ عَیْنَہُ عِنَبَۃٌ طَافِیَۃٌ[ق] : مسیح دجال یقیناً داہنی آنکھ سے کانا ہوگا۔ گویا کہ اُس کی آنکھ اُبھرے ہُوئے انگور کے مانند ہوگی (جس میں روشنی نہ ہو)[۹ق]

یہ حدیثیں موجودہ دور کے الحادی اور دہریت پسند فتنوں پر پوری طرح صادق آتی ہُوئی معلوم ہوتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید مادّہ پرستانہ فلسفے اور الحادی افکار و نظریات سائنسی حقائق و اکتشافات کو کھینچ تان کران کی تشریح و توجیہہ غلط انداز میں اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ ایک آنکھ سے دیکھ رہے ہوں اور دوسری آنکھ بند کئے ہُوئے ہوں۔ اور یہ موقف نظریۂ ارتقاء کے سلسلے میں پوری طرح واضح ہے جو تمام حقائق کو نظر انداز کرتے ہُوئے محض ایک مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کے سلسلے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ تاکہ انہیں ایک خلاّق ہستی کا وجود تسلیم کرنا نہ پڑے۔ اور اس اعتبار سے مادہ پرست بالکل اندھے اور بہرے ہیں جو محض اپنی نفسانی خواہشات کی وجہ سے کُھلے ہُوئے حقائق کا انکار کرنے پر تُلے ہُوئے نظر آتے ہیں[۹ق] اور اس راہ میں ہر قسم کے مکر و فریب اور دجل و تلبیس کو جائز تصوّر کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے اس قسم کے گمراہ کن نظریات کا مقابلہ موجودہ دور کا سب سے بڑا جہاد ہے۔ اور سورۂ فرقان میں قرآن کے ذریعہ "بہت بڑا جہاد" کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے (آیت ۵۲) اُس کے مطابق موجودہ دور کی مادیت ولادینیت یا "دجّالیت" کا مقابلہ صرف قرآن حکیم کے بنائے ہُوئے طریقے ہی کے مطابق ہوسکتا ہے۔ یعنی منکرین و معاندین کا مقابلہ خود قرآن ہی کے ذریعہ یعنی قرآنی دلائل و براہین اور اُس کے حقائق و معارف کے ذریعہ کرکے یہ کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ اور صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے مطابق جہاد کرکے آج مسلمان کامیاب اور سرخرو ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ کامیاب

۹ق بخاری ۱۷۲/۸ مسلم ۲۲۴۷/۴

۹ق نظریۂ ارتقاء پر تفصیلی بحث اور مادہ پرستانہ افکار و نظریات کے رد کے لئے دیکھئے راقم سطور کی کتاب "خلقت آدم اور نظریۂ ارتقاء"

نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا قطعی حرام ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے علماء اور اہلِ مدرسہ کو انبیائے کرام کا صحیح معنی میں وارث بننا چاہئے لہٰذا انہیں قرآنِ حکیم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق علمِ جہاد بلند کرنا چاہیئے۔ اگر وہ جہاد عسکری نہیں کرسکتے تو انہیں جہادِ علمی کا محاذ گرم کرنے میں کسی بھی قسم کا عذر نہیں ہونا چاہئے آج مسلمانوں پر جو بھی مصائب آرہے ہیں وہ نفسِ جہاد کو ترک کرنے کے باعث ہیں۔ علامہ ابنِ قیم کی توجیہہ کی رُو سے ہر مسلمان کو کسی نہ کسی قسم کے جہاد میں مشغول رہنا چاہیئے ورنہ وہ منافق ہوگا۔ (باقی آئندہ)

خانوادۂ عثمانی دیوبند سے حق تعالیٰ شانہٗ نے دو شب چراغ ملتِ ہند و پاک عالم اسلام کو عطا فرمائے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ مجدد و مجاہد اعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔

دوسرے مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ جو فقہ و سلوک کے امام اعظم تھے۔

اس دورِ انحطاط و زوال میں حق تعالیٰ نے حضرت مفتی اعظم کے صاحبزادے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ کے ذریعہ انسانی فلاح و بقاء کا عظیم کام انجام دیا۔

انگریزوں کے زوال تقسیم کے طوفان میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ صف آرا ہوئے۔ اس ملک کے بھیانک المناک حال میں تڑپتی بلکتی انسانیت کو بچانے اور بنانے کی عظیم خدمت زندگی کی آخری سانس تک انجام دیتے رہے۔ یہ ہماری دنیا آج ایسے غمگسار، چارہ ساز بزرگوں کی محتاج ہے۔

خدا ہمیں ایسے اکابر ملت نصیب فرمائے۔

والسلام

افتخار فریدی

کتبِ تفسیر میں الکشّاف کا مقام و مرتبہ

احسان اللہ فہد فلاحی۔ شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

معتزلہ کا چوتھا اہم عقیدہ الوعد والوعید کا ہے اس اصول کے مطابق جس شخص نے اپنے فعل سے اپنے آپ کو جنّت کا مستحق بنالیا وہ اتباع امر کے ذریعہ نجات پائے گا اور جس شخص نے آپ کو اپنے افعال کے ذریعہ عذاب کا مستحق بنالیا وہ بوجہ معصیت عذاب کا مستحق ہوگا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے وعد وعید کے سلسلے میں صادق ہے وہ اپنی باتوں کو بدلتا نہیں ہے بعض علماء اعتزال نے یہاں تک کہا ہے کہ اللہ تعالےٰ پر فرض ہے کہ جو شخص جنّت کا مستحق ہے اس کو جنّت اور جو جہنّم کا مستحق ہے اس کو جہنّم میں جگہ دے۔ وہ اپنی رحمتِ خاص کے ذریعہ کسی کو معاف نہیں کرسکتا۔ معاف کرنا اس کے عدل کے خلاف ہے لیکن جو شخص مرنے سے پہلے کبائر سے توبہ کرلے تو اللہ تعالےٰ پر واجب ہے کہ اس کو معاف کردے۔ علّامہ زمخشریؒ نے اس مسلک کی بھی تائید کی ہے۔ علّامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں کہ توبہ قبول کرنا اللہ پر واجب ہے۔ وجوب قبول محض اخلاقی قبول نہیں بلکہ قانونی وجوب ہے اور بندے کا حق واجبی جس کی ادائگی خدا کے ذمے اسی طرح ضروری ہے جیسے بندے پر فرائض کی ادائگی ضروری ہوتی ہے۔ [12]

معتزلہ کا پانچواں بنیادی اصول امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔ اہلِ سنّت والجماعت کے نزدیک امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ غیر مسلمین تک اسلامی دعوت وفکر کو پہونچائیں۔ اور حق کے قیام کے لئے منظم کوشش کریں لیکن معتزلہ کے نزدیک حق کے قیام کے لئے یہی بات کافی نہیں کہ دین کی دعوتِ عام کریں بلکہ اگر قدرت

حامل ہو تو بزور شمشیر دین کو برپا کرنا ضروری ہے۔ اُن کے نزدیک اس طرح کے قتال میں کفار اور فاسق مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے۔ علامہ زمخشریؒ بھی اس مسلک سے مکمل طور سے متفق ہیں قرآن کی آیت یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ۔ اے نبی کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور اُن کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ آخر کار ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے[1]۔ کے تحت لکھتے ہیں کہ کفار سے تلوار کے ذریعہ جنگ کرو۔ منافقین سے حجت کے ذریعہ اور ان دونوں جہادوں میں سختی سے کام لو اور اُن سے ذرا بھی نہ گھبراؤ اور ہر وہ شخص جس کے عقیدے میں کسی خرابی کی اطلاع ملے اس کے سلسلے میں قرآن کا یہ حکم ثابت ہے کہ اُن سے حجت کے ذریعہ جہاد کیا جائے گا۔ اور اس میں جہاں تک ممکن ہو سختی سے کام لیا جائے گا[2]۔ غرض یہ کہ علامہ زمخشریؒ نے الکشاف کی تفسیر معتزلہ کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی ہے اور ان عقائد کے ثبوت میں پوری صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔

علامہ زمخشریؒ نے اپنی شہرت یافتہ تفسیر میں دو مقاصد کو سامنے رکھا ہے سب سے پہلا اور غالباً اہم ترمقصد یہ ہے کہ اس تفسیر کے ذریعہ مسلک اعتزال کی خدمت کی ہے۔ مثال کے طور پر اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ آخرت میں دیدار خداوندی ضرور ہوگا۔ آخرت میں رویت کا نہ صرف وقوع بلکہ وجوب، اُن کے نزدیک قرآن وسنت صحیحہ سے ثابت ہے صحیح بخاری کے الفاظ ہیں:۔ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ کَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِیْ رُؤْیَتِهٖ ۔ بدر کی رات رسول اللہؐ ہمارے پاس آئے اور فرمایا تم اپنے رب کو قیامت کے دن ایسا ہی دیکھو گے جیسے کہ اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ اس کی رویت میں کچھ بھی شک نہیں کرو گے[3]۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔ اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں[4]۔ لیکن معتزلیوں نے حدیث اور آیت دونوں کی تاویل کر دی اور آخرت میں رویت باری تعالیٰ کا انکار کر دیا۔ معتزلہ نے حدیث کے راویوں کی تکذیب

کی اور اسناد پر طعن کیا۔ حدیث کے رواۃ پر تو صحیح یا غلط کی جرح کی جا سکتی ہے مگر راویوں کی تکذیب کا حربہ قرآنی آیات میں نہیں چل سکتا تھا لیکن قرآن میں تاویل کا ہتھیار استعمال کیا اور ناظرۃ کی تاویل کرتے ہوئے اس کا مفہوم نظر رویت کے بجائے نظر انتظار کر دیا۔ علامہ زمخشریؒ نے بھی اُن تمام آیات کی جس سے رویت کا اثبات ہوتا ہے معتزلی نقطۂ نظر سے تاویل کر دی۔ سورۃ اعراف میں آتا ہے وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ جب وہ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر پہونچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ اے رب مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا جب ہوش آیا تو بولا پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے ایمان لانے والا میں ہوں[۱] علامہ زمخشریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر رویت مستحیل ہے تو حضرت موسیٰ جیسی ہستی کی طرف سے رویت کا مطالبہ کیسے ہوا، علامہ زمخشری نے اس کا جواب دیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی درخواست درحقیقت یہ تھی ہی نہیں کہ وہ بطور خود اپنے لئے دیدار چاہتے تھے طلب دیدار کے ذریعہ وہ صرف ان لوگوں پر ان کی غلطی واضح کرنا چاہتے تھے جو رویت رب کا مطالبہ کر رہے تھے اور اس کے بغیر ایمان لانے پر آمادہ نہ تھے[۲] اسی طرح علامہ زمخشریؒ رویت کا انکار کر کے مسلک اعتزال کے مطابق قرآن کی تاویل کی ہے۔

الکشاف کی تالیف کا دوسرا اہم ترین مقصد یہ تھا کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے دقائق کو منظر عام پر لایا جائے اور اس طرح قرآنی اعجاز کی بنیادوں کو استوار کرتے ہوئے اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کے جمال کو بے نقاب کیا جائے۔ علامہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کی تفسیر

میں لکھتے ہیں کہ آدمی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ھدًی لِلضّالّین کیوں نہیں کہا گیا۔ زمخشری لکھتے ہیں کہ قرآن نے یہاں ایجاز سے کام لیا ہے۔ ضالین میں دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں، ایک وہ جن کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے کہ روشِ گمراہی ترک نہیں کریں گے قرآن کی اصطلاح میں یہ مطبوع علی قلوبھم ہیں۔ قرآن ان کے لئے ہدایت نہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو سیدھے راستے کو اختیار کرلیں گے۔ ان لوگوں کے لئے قرآن یقیناً ہدایت ہے۔ اس پورے مفہوم کو اگر تفصیل سے ادا کیا جاتا تو کہنا پڑتا ھدًی للصائرین الی الھدیٰ بعد الضلال۔ اس تطویل کے بجائے قرآن نے ایجاز سے کام لیتے ہوئے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ سے اس مفہوم کو ادا کر دیا ۱۹؎ علامہ زمخشریؒ کی تفسیر انھیں دونوں مقاصد کے گرد گھومتی نظر آتی ہے اور حق تو یہ ہے کہ علامہ نے ان دونوں مقاصد کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔

زمخشری کی تفسیر الکشاف عالمِ اسلام میں اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے کافی مقبول اور متداول ہے عربی زبان و ادب کے ادا شناس ہر دور میں علامہ کی اس تفسیر سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ الکشاف کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے اپنی تفسیر میں فنِ بلاغت کے اصولوں کا عملی انطباق کیا ہے۔ علامہ زمخشریؒ نے اعجازِ قرآنی کے اثبات و اظہار کے لئے بلاغت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک ایسی تفسیر لکھی ہے جو اپنی خصوصیات کے لئے پوری دُنیا میں مشہور ہے۔ اور قرآن کا ہر طالبِ علم قرآنی بلاغت کا علم حاصل کرنے کے لئے بلا اختلاف مذاق و مسلک الکشاف کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ لقمان کی مندرجہ ذیل آیت دیکھئے:- یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا۔ لوگو بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہو گا ۲۰؎ اس آیت میں ولا مولود ھو جاز عن والدہ شیئاً۔ جملہ اسمیہ ہے اور اس کا معطوف علیہ جملہ فعلیہ طرزِ ادا میں یہ فرق کیوں ہے اور اس کا کیا مقصد ہے۔ زمخشریؒ بتاتے ہیں کہ اس جملہ کو اسمیہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ جملہ اسمیہ میں تاکید جملہ فعلیہ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں اس تاکید میں مزید اضافہ

"مولود" اور "ہو" کے الفاظ کے ذریعہ کیا گیا ہے یعنی ایک جملہ کو دوسرے سے زیادہ موکد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں روئے خطاب دراصل مومنین کی طرف ہے جن کے آباء واجداد دین جاہلیت پر اور حالت کفر میں ختم ہوئے قرآن نہایت صاف طریقے سے یہ بات بتا دینا چاہتا ہے کہ مومنین آخرت میں اپنے ان آباء واجداد کے کام نہ آ سکیں گے اور نہ ان کی سفارش کر سکیں گے۔ چنانچہ قرآن نے اس اسلوب کو اختیار کیا جس میں تاکید زیادہ پائی جاتی ہے مولود کے لفظ کے ذریعہ تاکید کا مفہوم یہ ہے کہ ولد کا لفظ تو بیٹے پوتے وغیرہ سب کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر مولود صرف صلبی اولاد کو کہہ سکتے ہیں۔ مولود کا لفظ لا کر اس بات کی وضاحت اور تاکید کر دی گئی کہ صلبی اولاد جس سے قریب ترین رشتہ ہوتا ہے وہ بھی آخرت میں اپنے باپ کے کسی کام نہ آ سکے گی چہ جائیکہ دادا اور پردادا کے جو باپ سے بہر حال دور ہیں [لہ]

قرآن کا یہ اسلوب بہت زیادہ نمایاں ہے کہ قرآن نے احکام، قصص اور پند و نصائح کو مختلف پیرایوں میں مختلف اوقات میں دہرایا ہے اس تکرار کی حکمت، اس کی بلاغت اور نفس انسانی پر اس کی اثر انگیزی کی وضاحت کے لئے علامہ زمخشری سوال اٹھاتے ہیں کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا [لله] اس آیت کو بار بار لانے کا مقصد کیا ہے؟ پھر اس کا خود ہی جواب دیتے ہیں کہ قرآن صرف بتانا نہیں چاہتا ہے کہ اس کی تعلیمات یہ ہیں بلکہ ان تعلیمات کو انسانوں کے دلوں میں جاگزیں کرنا چاہتا ہے قلب و نظر کی گہرائیوں میں قرآن کی تعلیمات کو پیوست کرنے کی یہی صورت ہے کہ مختلف پیرایوں میں بار بار انھیں پیش کیا جائے تاکہ دل میں اس طرح رچ بس جائیں کہ انسان اس کو کوشش کے باوجود نہ بھولے [۲۳]۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ نفسیاتی اعتبار سے وعظ و نصیحت ہے ہی ایسی چیز کہ آدمی کی طبیعت ادھر آنا نہیں چاہتی نفس کو بندشیں اور پابندیاں اس کو بہت گراں گذرتی ہیں۔ نفس انسانی کی یہ خصوصیت تکرار کی داعی ہوتی ہے [۲۴] بلاغت کا تقاضہ ہے کہ اہم بات کو ابھار کر پیش کیا جائے اور مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ قرآن تکرار کے ذریعہ بلاغت کے اس اہم بات کو ابھار کر پیش کیا جائے اور

مخاطب کی نفسیاتی کیفیت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ قرآن تکرار کے ذریعہ بلاغت کے
اس اہم تقاضے کو کیسے پورا کرتا ہے اس بات کو علامہ زمخشریؒ سورہ شعراء میں وارد شدہ
قصص پر گفتگو کرتے وقت واضح کرتے ہیں کہ اس سورہ میں پچھلی بہت سی قوموں کے واقعات
بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ہر واقعے کی ہلاکت اور تباہی کے انجام کو واضح کرکے اس طرح
ختم کیا وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ[29] علامہ زمخشریؒ بتاتے ہیں کہ شروع اور آخر کے
جملوں کی تکرار اس وجہ سے ہوئی ہے کہ مذکورہ واقعات میں سے ہر واقعہ اپنی اہمیت کے اعتبار
سے اور اپنی عبرت انگیزی کی خصوصیت کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے اس لئے
ضروری تھا کہ ہر واقعہ کو علیحدہ علیحدہ اس طرح ابھار کر پیش کیا جائے کہ اس کی انفرادی شان
برقرار رہے۔ یہ نفسیاتی غایت اس اسلوب تکرار کے علاوہ کسی دوسری طرح سے حاصل نہیں ہوگی۔
اس کے علاوہ وہ بتاتے ہیں کہ یہ واقعات ان لوگوں کے سامنے پیش کئے جارہے ہیں۔
جو حق بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور تکذیب پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ ضروری
تھا کہ ہر واقعے کے ساتھ پوری وضاحت سے یہ بات بار بار بتائی جائے کہ تکذیب کا انجام
ہلاکت و بربادی ہے۔ اور باری تعالیٰ رحیم ہونے کے ساتھ مجرموں کو سزا دینے پر بھی قادر ہے
اس طرح علامہ زمخشریؒ نے اپنی تفسیر الکشاف میں اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ
قرآن کے بلاغتی و ادبی نکات کو مکمل طور سے واضح کیا جائے چنانچہ علامہ اپنے اس مقصد میں
ایک حد تک کامیاب ہیں۔ اور علوم دینیہ کے شیدائی، عربی زبان وادب کے اداشناس اس
تفسیر سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں۔ پروفیسر فضل الرحمٰن اپنی کتاب "زمخشریؒ کی تفسیر الکشاف
ایک تحلیلی جائزہ" میں رقمطراز ہیں کہ قرآن کی زبان اور اس کے بیان کی بلاغت، حسن ادا،
بدیع الاسلوبی نظم قرآنی کی فنی لطافتیں اور اس کے اسالیب کی ادبی نزاکتیں زمخشری کی
تفسیر کے خاص موضوع ہیں۔ وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کے ادبی حسن وجمال کا کوئی نکتہ
اور کوئی دقیقہ ایسا نہ رہنے پائے جسے ان کا قلم ثبت نہ کردے لیکن ایسے مواقع بھی آتے
ہیں جب معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے خیرہ کن جمال کی تنویر ان کی زبان
توصیف کو گنگ کر دیتی ہے اور وہ مبہوت و ہوش رفتہ ہو کر رہ جاتے ہیں: ۔ ترجمہ

الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ. مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ. وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑتے ہوں گے۔ یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہوگا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ جو شخص بھلائی لیکر آئے گا اُسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے اور جو برائی لئے ہوئے آئیگا ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو[۲۶]۔ ان آیات قرآنی کی معنوی لطافتیں زمخشری پر اسی طرح کی کیفیات طاری کر دیتی ہیں اور وہ پکار اُٹھتے ہیں فانظر الی بلاغۃ ھذا الکلام وحسن نظمہ و ترتیبہ ومکانۃ اضمارہ ورصافۃ تفسیرہ واخذ بعضہ بحجز بعض کانما افرغ افراغا واحدا ولامرما اعجز القوی واخرس الشقاشق منصف مزاج جاننے والے کے نزدیک یہ قوی استدلال اور نادر اسلوب خود اپنی زبان سے بول رہا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں علامہ زمخشریؒ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار و دقائق میں وہ لطافتیں پنہاں اور ان میں وہ باریکیاں پوشیدہ ہیں کہ اچھے پڑھے لکھے بھی ان کے ادراک سے اپنے آپ کو عاجز پاتے ہیں[۲۷]۔ غرض یہ کہ قرآنی بلاغت کے علم کے میدان میں علامہ زمخشریؒ یکہ و تنہا شہسوار ہیں۔ تفسیر الکشاف قرآنی بلاغت کا واضح ثبوت ہے۔

الکشاف کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنے کو ترجیح دی ہے سورۃ ہود کی آیت۔ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ۔ اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے"۔ کی تفسیر دیکھئے۔ زمخشری لکھتے ہیں القرآن یفسر بعضہ

بعضہ قرآن خود اپنی تفسیر آپ کرتا ہے ۲۸ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ علامہ کا اس بات پر عقیدہ ہے بلکہ علامہ کا ایک بنیادی تفسیری اصول ہے کہ قرآن کے ایک حصے کی تشریح قرآن کے دوسرے مقامات سے کی جانی چاہیے۔ تارکین زکوٰۃ کے بارے میں قرآن کہتا ہے :-

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ وَالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔ ۲۹ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن تارکینِ زکوٰۃ کو کافر ٹھہرا رہا ہے فرائض کا تارک اور گناہ کبیرہ کا مرتکب معتزلہ کے نزدیک کافر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے جس کو معتزلہ کی اصطلاح میں المنزلة بین المنزلتین کہتے ہیں۔ علامہ زمخشریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ معتزلہ کا خیال ہے کہ زکوٰۃ کے تارکین ہی ظالم ہیں۔ اور آیت میں "الکافرون" معنی میں شدت پیدا کرنے کے لئے لایا گیا ہے جیسا کہ حج کے متعلق جو آیت سورۃ آل عمران میں بیان ہوئی ہے اس کے آخر میں ولم یحج کی جگہ من کفر کہا گیا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ انھوں نے زکوٰۃ کے نہ دینے کو اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ویل للمشرکین الذین لا یؤتون الزکوٰۃ کفار کی صفات میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ حج کا چھوڑنے والا ویسا ہی کافر ہوا جیسا زکوٰۃ کا چھوڑنے والا کافر ہوتا ہے۔ اور ان دونوں آیتوں میں جو صفت بیان کی گئی ہے اس سے شدت مقصود ہے ۳۰ ۔ علامہ زمخشری رح کے نزدیک سب سے بہترین اور قابلِ ترجیح تفسیر وہ ہے جو خود قرآن سے کی گئی ہو۔ علامہ الکشاف میں رقمطراز ہیں اسد المعانی ما دل علیہ القرآن ۳۱ چنانچہ آپ نے قرآن کی تفسیر قرآن سے کی ہے لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ مؤمنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں ۳۲ ۔ اس آیت میں کافرین سے دوستی اور ان سے قربت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ علامہ اس مفہوم کی تائید میں قرآن مجید کی دوسری آیات کو بھی

پیش کرتے ہیں۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اَوْلِیَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَتَوَلَّهُمْ مِنْکُمْ فَاِنَّهُ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ ۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہیں میں ہے یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے[۳۳] اس طرح سے علامہ نے پوری کوشش کی ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کریں۔ قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملنے کی صورت میں علامہ نے دوسرے ماخذ کی طرف رجوع کیا ہے۔

علامہ زمخشری کی تفسیر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے اپنی تفسیر میں تفسیر بالماثور کے میلان کو نمایاں جگہ دی ہے جو علامہ کے سنت کو ماخذ دین سمجھنے کی ایک بڑی دلیل ہے۔ علامہ زمخشری کے نزدیک قرآن کے بعد سنت، اجماع، عمل صحابہ، اجتہاد و قیاس سب کے سب دین کے ماخذ ہیں۔ چنانچہ وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کی تفسیر میں سنت کے ماخذ دین ہونے اور بیان قرآن ہونے پر گفتگو کرتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ تبیانًا لکل شیءٍ ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ قرآن میں دین کے سارے احکام اپنی پوری تفصیلات و جزئیات کے ساتھ موجود ہیں بلکہ سارے دینی امور کو بیان کرنے کی صورت قرآن نے یہ اختیار کی ہے کہ بعض امور پر نصوص قائم کر کے بعض دیگر امور کو سنت کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ اجماع پر رغبت دلائی ہے اور خود حضورؐ نے صحابۂ کرام کے اتباع و اقتدار کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ ان صحابہ کا طریقہ اجتہاد و قیاس رہا ہے اور ان حضرات نے ان دونوں کے اصولوں کو مدون کیا ہے۔ چنانچہ سنت اجماع، قیاس اور اجتہاد یہ سب تبیان کتاب کی مختلف شکلیں ہیں اور ان سب کے اجتماع سے قرآن تبیانا لکل شیءٍ کا مصداق بنتا ہے[۳۴]۔ کشاف میں آیات کی توضیح و تشریح کے لئے رسول اللہ کی احادیث کے علاوہ صحابہ کی تفسیری روایات و اقوال اور تابعین کی تشریحات قدم قدم پر ملتی ہیں۔ علامہ زمخشری کی تفسیر کی ایک خامی یہ ہے کہ انھوں نے تفسیری روایات کو اپنی تفسیر میں جگہ تو دی لیکن تفسیری روایات کو بغیر چھان پھٹک کے اور تنقید سے بالاتر سمجھتے ہوئے

(باقی صفحہ پر)

قبول کرلیا ہے۔ ایسے مواقع شاذو نادر ہی ملتے ہیں جہاں علامہ نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا جوہر دکھایا ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ جہاں بھی تنقید کی ہے اُن کی تنقید بہت ہی وزن دار رہی ہے۔ اذ یریکم اللہ فی منامک قلیلاً ۳۵ کی تفسیر میں حسن بصری کی رائے لکھتے ہیں کہ امام حسن سے مروی ہے کہ فی منامک کا مطلب فی عینک ہے۔ کیونکہ نیند کی جگہ آنکھ ہی ہے جیسا کہ قطیفہ کو آرام گاہ کہا گیا ہے کیونکہ اس میں سویا جاتا ہے۔ علامہ زمخشریؒ نے حسن بصری کی تفسیری روایت پر تنقید کرتے ہوئے اپنے ادبی ذوق اور قرائن کی شہادت کو استعمال کرکے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس روایت کے حسن بصری سے انتساب میں کوئی کمزوری ہے۔ کیونکہ حسن بصری کی اس تفسیر میں کلام عرب اور اس کی فصاحت کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا گیا ہے ۳۶۔

(آخری قسط آئندہ)

مصر میں عربی صحافت کی ابتداء

امتیاز احمد اعظمی ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۳)

چوتھا دور

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزوں کے خلاف شدید قسم کی شورش بپا تھی اور آزادی کی صدائے بازگشت چہار جانب سے بلند ہو رہی تھی مختلف وطنی و قومی تحریکیں قائم ہو رہی تھیں چنانچہ ایسے دور میں اخبارات و رسائل کو غیر معمولی اہمیت و مقبولیت حاصل ہوئی خاص و عام کو صحافت سے دلچسپی پیدا ہوئی ۔ تمام لوگوں کو صحافت کی اقادیت کا احساس ہوا ۔ خود فن صحافت میں تفنن و تنوع پیدا ہوا ۔ حالات حاضرہ پر خاص طور پر بحث شروع ہوئی کثرت سے تبصرے بھی شائع ہونے لگے ۔ اس طرح متعدد نئے گوشے صحافت کی دنیا میں نظر آنے لگے ۔ اخبار "اللواء" نے "حدیث الیوم" کے نام سے ایک نیا کالم شروع کیا جس میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات پر تفصیلی و تحقیقی نظر ڈالی جاتی ۔ اس کے علاوہ غیر ملکی خطوط اور یورپ کی ڈاک بھی شائع ہونے لگی ۔

ایک دوسری اہم شتی یہ نظر آئی کہ روساء و امراء کو بھی اس فن سے دلچسپی پیدا ہوئی ۔ اخبارات کے اجراء و اشاعت میں مختلف کمپنیوں نے اہم رول ادا کیا ۔ اس طرح صحافت کو ارتقائی مراحل طے کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا ۔ سب سے قبل "اللواء" کو ایک کمپنی کی سرپرستی حاصل ہوئی ۔ ۱۹[illegible]ء میں "الجریدۃ" کو بھی ایک کمپنی کا تعاون حاصل ہوا ۔

اس دور کی تیسری اہم بات یہ تھی کہ ابھی تک تو شامی ولبنانی لوگ میدانِ صحافت میں پیش پیش تھے لیکن اب صحافت کی باگڈور مصریوں کے ہاتھوں میں آگئی اور انھوں نے اس میدان میں غیر معمولی کرشمہ دکھایا اور اس فن کے ذریعہ اپنے وطنِ عزیز کی بہترین خدمت کی۔ اس سے قبل عام طور پر روزنامے چار صفحات پر مشتمل ہوتے تھے، لیکن نئے وجدید قسم کے پریس کی آمد سے اکثر اخبارات آٹھ صفحات میں نکلنے لگے۔ ۱۸۹۹ء میں علی یوسف نے یورپ سے جدید قسم کا پریس منگایا۔ اس کی آمد سے صحافت کی دوڑ میں تیزی اور نئی زندگی پیدا ہوئی۔ متعدد اخبارات کی چھپائی جدید قسم کے پریس سے ہونے لگی۔ "الاہرام"۔ "المقطم"۔ اور "اللواء"۔ بھی نئے قسم کے آلاتِ طباعت سے شائع ہونے لگے۔

صحافت کی نشر و اشاعت میں اس قدر تیزی اور صحافیوں کا اس جانب غیر معمولی انہماک عام اہلِ وطن کے لئے باعثِ تعجب بنا ہوا تھا، کیونکہ اس وقت صحافت کی یہ تجارت مادی اعتبار سے غیر نفع بخش تھی۔ مدیروں اور اخباری عملے کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ مقالہ نگاروں کا تو معاوضہ تھا ہی نہیں لیکن اس کے باوجود اخبارات وجرائد اتنی کثیر تعداد میں شائع ہوتے تھے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں اُن کی تعداد ایک سو ستر تک پہنچ گئی۔ اور ایساکوئی مہینہ نہ گذرتا جس میں ایک دو اخبار نہ نکلتے ہوں۔

مادی اور اقتصادی پریشانی کے باوجود اخبارات وجرائد کی کثیر تعداد میں اشاعت کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس وقت تحریر وتقریر کی مکمل آزادی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اخبارات نکالنے کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ قانونی طور پر کوئی پابندی عائد نہ تھی۔ خود مصری بھی صحافت کی افادیت سے آشنا ہو چکے تھے، اس لئے انھوں نے معاشی پریشانی کو نظرانداز کر کے قومی ووطنی افادیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صحافت کی جانب توجہ دی جس کے باعث بے شمار اخبارات منظرِ عام پر آئے۔

۱۹۰۷ء میں احمد لطفی السید کی نگرانی میں جریدہ "الجریدۃ" نکلنا شروع ہوا یہ اخبار اپنی شہرت ومقبولیت، مباحث کی وسعت، باریک مسائل پر گفتگو کرنے اہلِ وطن سے متعلق تمام خبروں کو زیرِ بحث لانے کے اعتبار سے نمایاں وممتاز ہے۔ اس

متعلق یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ ایک جماعت کے خیالات اور افکار و نظریات کی ترجمانی کرتا اور اس کی حمایت کرتا تھا۔ یہ اخبار اسی جماعت کے زیرِ نگرانی چھپتا تھا۔ خاص طور پر یہ اخبار جماعت "حزب الامۃ" کا حامی تھا۔ یہ پارٹی مصر کو مغربی تہذیب و تمدن سے آراستہ کرنا، جدید کلچر کا آئینہ دار اور اقتصادی اعتبار سے خوشحال دیکھنا چاہتی تھی۔ سیاست و حکومت کی زمام کار چاہے کسی کے ہاتھ میں ہو، گویا کہ یہ پارٹی انگریزی استعمار کی حمایت کرتی اور لارڈ کرومر کا دفاع کرتی تھی۔ اسلام، مسلمان اور دُنیائے اسلام کی اس کے نزدیک کوئی خاص حیثیت و مقام نہ تھا اور ملک میں کسی عربی و اسلامی طاقت کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی تھی، چنانچہ اخبار "الجریدہ" اسی دعوت کو عام کر رہا تھا۔ یہ ان مغرب نواز لوگوں کی آواز کو پھیلاتا اور لوگوں کو فرنگی تہذیب و کلچر کو اختیار کرنے اور انگریز حکومت کی حمایت کرنے پر ابھارتا۔ گویا کہ یہ اخبار انگریزی تسلط و احتلال کو حقیقت کی صورت میں پیش کرتا تھا۔ اس میں یہاں تک لکھا جانے لگا کہ "مصری قوم امن چاہتی ہے، انگریز سے اسے مخلصانہ محبت ہے۔ حکومت قانوناً خدیو مصر کے ہاتھ میں ہے اور عملاً کرومر کے ہاتھ میں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ دونوں قسم کے اختیارات یکجا ہو جائیں یعنی قانونی حکومت بھی خدیو مصر کے بجائے کرومر کو دیدی جائے۔" [1]

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ "حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا سیاسی اتحاد ختم ہوگیا اور حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ان کا مذہبی اتحاد بھی ختم ہوگیا۔ تیرہ سو سال سے جس اتحاد و اتفاق کی بُنیاد مِٹ چکی ہے اسے کیوں کر زندہ کیا جائے۔" [2]

الغرض اس اخبار نے حکومتِ برطانیہ اور مغربی تہذیب و تمدن کے گُن گائے۔ اور اسلام کی سیاسی بنیادوں کو منہدم کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر مصر کو تمام اسلامی دُنیا سے الگ تھلگ کرنے کی جدوجہد کی۔ اس کا کہنا تھا کہ حکومت کسی کے ہاتھ میں ہو حکمرانی

[1] حسن البنّا شہید کی ڈائری، مترجم خلیل حامدی۔ ص ۱۸۔
[2] حسن البنّا شہید کی ڈائری، مترجم خلیل حامدی۔ ص ۱۸

خدیوی خاندان کرے یا انگریز کرے اس سے کوئی فرق نہیں واقع ہوتا ہے اور ہمیں کسی حکومت کے خلاف آواز نہیں اٹھانا چاہیے اگر وہ عدل وانصاف سے کام لیتی ہے اہلِ وطن کو عزت وتکریم کی نظر سے دیکھتی ہو، سیاسی و اقتصادی اور ثقافتی برابری رکھتی ہو اور ملک وقوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ چنانچہ جہاں یہ اخبار انگریز کے تعمیری اور اصلاحی کاموں کی تعریف کرتا اور حکومتِ برطانیہ کی مدح وستائش کرتا تھا وہیں پر دوسری جانب جب انگریزوں کی طرف سے کوئی ایسی چیز سامنے آتی جس سے اہلِ وطن ناخوش ہوئے تو یہ حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا۔ لارڈ کرومر اور دوسرے حکمرانوں کے ملک دشمن کاموں پر سخت انداز میں نکتہ چینی کرتا۔ انگریزوں سے آزادی تعلیم، آزادی تحریر اور مصریوں کے لیے اظہارِ رائے کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا، تمام قانونی سختیوں کو ختم کرنے کے لئے برطانوی حکومت پر زور ڈالتا تاکہ اہلِ وطن سکون واطمینان سے رہ سکیں۔ یہ اخبار مصر کے اندرونی معاملات میں اسلامی ممالک اور دولتِ عثمانیہ کی دخل اندازی کا سخت مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مصری خود اپنے تمام مسائل حل کرسکتے ہیں۔ چنانچہ یہ واضح انداز میں لکھتا ہے:-

انّ علینا نحن المصریین ان نترك فرنسا وانجلترہ والدولة العلیه وعلینا الا لغیر سیاسة الخلاف اوسیاسة الوفاق ایة اهمیة، وعلینا ان نعمة علی انفسنا فقط فی الحصول علی حقنا فی الدستور وحقنا فی الحریة لا بدمن ذالك۔ ومن عزة ترباء بنا ان نطلب من غیرنا ان یاتی لتحریر انفسنا من الرق وقلوبنا من عبادة القوی کأننا۔ کما ظنوا خطأ بنا ینبغی اَنّ یاتینا الاستقلال ونحن نیام[1]

سردست یہ کہا جاسکتا ہے کہ اخبارُ "الجریدة" نے مصر کی سیاست میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے

[1] الصحافة المصریة فی مأة عام۔ ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ۔ ص ۱۱۸۸۔

صفحات پر مختلف سیاسی مسائل زیر بحث آتے اور مصری سماج و سیاست پر کافی حد تک اثر انداز ہوا۔ سیاسی اور تحریکی موضوعات کے ماسوا تجارت و صنعت اور زراعت سے متعلق چیزیں بھی شائع ہوتیں۔

اکتوبر ۱۹۱۰ء میں اخبار "العلم" نکلا۔ یہ اخبار جماعت "الحزب الوطنی" کا حامی تھا۔ وطنی آزادی اور قومی بے داری کا علمبردار تھا یہی وجہ ہے کہ یہ انگریزی استعماری حکومت کی نذر ہوگیا۔ "الاعتدال" نامی اخبار بھی نکلا۔ یہ بھی وطن پرست اور قوم نواز اخبار تھا جس کے باعث یہ اخبار بھی زیادہ دنوں تک نہ نکل سکا۔

۱۹۱۰ء ہی میں روزنامہ جریدۃ "الاھالی" عبدالقادر حمزہ نے نکالا۔ یہ اسکندریہ سے نکلا اور ۱۹۲۰ء تک اسکندریہ ہی سے نکلتا رہا۔ ۱۹۲۱ء سے اس کی طباعت قاہرہ سے ہونے لگی۔ یہ جریدہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا اور شام میں نکلتا تھا۔ اس میں ملکی و غیر ملکی خبریں چھپتی تھیں اس کے چاروں صفحات پر الگ الگ چیزیں شائع ہوتیں۔ پہلے صفحہ پر خاص طور پر مقالات شائع ہوتے اور کبھی کبھی بیرونی خبریں بھی چھپتی تھیں۔ دوسرا صفحہ اندرون ملک کی خبروں کے لئے خاص تھا تیسرے صفحہ پر اعلانات و اشتہارات اور کچھ دوسری چیزیں بھی شائع ہوتیں۔ اور آخری صفحہ پر صرف مختلف قسم کے اعلانات ہوتے تھے۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء تک کا وہ زمانہ تھا جب وفد پارٹی اور قومی تحریکیں شباب پر تھیں، پورے ملک میں انقلابی اور احتجاجی صورت حال تھی۔ وفد پارٹی کے لیڈر سعد زغلول آزادئ وطن کے لئے کوشاں تھے۔ نہایت ہی سنگین و مہیب زمانہ تھا۔ انگریزوں کے ظلم و ستم کی بھٹی شعلہ زن ہوچکی تھی۔ آزادئ تحریر و تقریر پر سخت پابندی تھی۔ اخبارات پر سخت سنسرشپ لاگو تھا۔ ایسے سنگین دور میں عبدالقادر حمزہ کی کوشش سے جریدۃ "الاھالی" نکلا۔ ان کی شخصیت ملک و قوم کی وفادار تھی۔ وہ اہل وطن کی نظروں میں نہایت محبوب ترین شخص تھے۔ غیر معمولی ذہین بردبار اور لوگوں کے خیرخواہ تھے۔ وطن کی آزادی اور قوم کی بے داری کے لئے کوشش کرتے، چنانچہ اس جریدہ کے ذریعہ قوم و وطن کی بہترین خدمت کی چنانچہ محب وطن اور قوم پرور ہونے کے باعث اس کی راہ میں متعدد رکاوٹیں کھڑی کی گئیں اور بالآخر ۱۹۲۱ء میں بند ہوگیا۔

۱۹۱۳ء میں امین الرافعی کی ادارت میں جریدہ "الشعب" نکلا۔ یہ آٹھ صفحات کا تھا۔ اس میں اسلامی، علمی اور فکری مضامین شائع ہوتے۔ یہ جریدہ ملک و وطن اور اسلام کی بہترین خدمت انجام دیتا۔ انگریزی استعمار اور فرنگی سامراج کے خلاف مضامین و تبصرے اس کی مقبولیت و شہرت کے باعث تھے۔

پہلے چار صفحات پر داخلی اور خارجی خبریں ہوتیں۔ یورپ کی خبریں "اخبار بریدا وربا" کے عنوان سے شائع ہوتی تھیں۔ یورپ کی خبروں کے علاوہ عالم اسلام اور مشرقی ممالک کی خبریں بھی چھپتی تھیں۔ اسلامیات سے متعلق بھی مختلف چیزیں نظر آتی تھیں۔ آخری چار صفحات بہت معلوم افزا اور علمی چیزوں کے لئے خاص تھے۔ یہ علم و فن کے زیورات سے مزین ہوتے سائنس زراعت و تجارت اور تاریخ و جغرافیہ سے متعلق نہایت مفید اور علمی بحثیں ہوتیں۔

چونکہ یہ اخبار وطن عزیز کی آزادی کا علمبردار، اہل وطن کا حامی اور برطانوی سامراج کا مخالف تھا اس لئے اسے حکومت کی شخصیتوں اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا اور بہت جلد بند ہوگیا۔

۲۱ جولائی ۱۹۱۵ء میں عبدالحمید حمدی کی ادارت میں جریدہ "السفور" نکلا۔ اس میں مقالہ نگاری کا کام محمد حسین ہیکل، احمد امین، منصور فہمی اور مصطفیٰ عبدالرزاق جیسی مایہ ناز شخصیات انجام دے رہی تھیں۔ احمد لطفی السید جو اخبار "الجریدہ" کے بانی تھے، ان کے شاگرد "السفور" کے روح رواں تھے اور ۱۹۱۵ء میں جب "الجریدہ" بند ہوگیا تو ان کے شاگردوں نے "السفور" نکالا۔

۱۹۱۹ء میں احمد فرید کی ادارت میں ہفت روزہ جریدہ "الحقائق" نکلا۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر پورے مصر میں انقلابی صورت حال تھی۔ اہل وطن انگریز کو ملک سے نکالنے اور حصول آزادی کے لئے متحد ہوگئے۔ چہار جانب سیاسی و انقلابی ماحول تھا آزادی تحریر و تقریر پر پابندی عائد تھی اور جو اخبارات بند ہوگئے تھے انھیں دوبارہ نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم اخبار جاری رہ سکے اور پابندی کے ساتھ نکلے۔

۲۲ فروری ۱۹۲۰ء کو جریدہ "الاخبار" نکلا۔ اس کے ایڈیٹر اخبار "الشعب" کے ایڈیٹر

الرافعی تھے۔ اس کا اجرا اس وقت ہوا جب مصر پہلی عالمی جنگ کے باعث ناگفتہ بہ حالت میں پہنچ گیا تھا۔ انگریزی ظلم و ستم سے اہلِ وطن درد و کرب کی زندگی بسر کر رہے تھے اور مصری انقلاب اپنے جوبن پر تھا۔ وفد پارٹی کی سرگرمیاں تیز تر ہو چکی تھیں۔

امین الرافعی نے اِس انقلابی اور سخت ترین دور میں صحافت کی جانب دوبارہ قدم اُٹھایا اور "الأخبار" کو نکال کر ملک و وطن کی بہترین خدمت کی۔ اس میں اکثر مضامین سیاسی امور سے متعلق ہوتے اور ملک کی آزادی کے پیامبر ہوتے۔ الرافعی اہلِ وطن کی ترجمانی نہایت پُرجوش انداز میں کرتے۔

"ہمیں صرف آزادی چاہیئے اور ہماری اس آزادی میں رخنہ انداز ہونے کا کسی کو حق نہیں۔ یہ وہ لوگ مفاد پرست ہیں جو مصریوں کے اندر اختلاف کی خلیج پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اندر حق و انصاف نام کی کوئی شئی نہیں ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو خوش کرنے اور چاپلوسی کرنے میں لگے رہتے ہیں، اس طرح ہماری طاقت کا حقیقی مظاہرہ نہیں ہو سکا اور نامرادی و مایوسی ہمارے ساتھ رہی۔ اگر آج بھی ہم کمر بستہ ہو کر اپنے مقصد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں تو آزادی ہمارا قدم چومے گی اور غلامی ہم سے دُور بھاگے گی۔" ؎۱

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے انقلابی دَور میں اہلِ وطن کی عظیم خدمت کی۔ یہ کسی طرح کی گروہ بندی اور تعصب کا قائل نہ تھا اور نہ یہ کسی پارٹی کی تحویل میں ہو کر شائع ہوتا تھا۔ نہایت صاف کھرے انداز میں وطن کے تمام مسائل کو زیر بحث لاتا۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں جریدہ "السیاسۃ" جاری ہوا۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے لی۔ یہ اخبار حزب الاحرار الدستوریین کی حمایت کرتا۔ جب ۲۲ فروری ۱۹۲۲ء کو مصر کو دستوری آزادی حاصل ہوئی تو اس وقت سعد زغلول جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے اور اسی وقت اس پارٹی کا قیام رو بہ عمل آیا تھا۔

؎۱ الصحافۃ المصریۃ فی مأۃ عام - ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ ص ۱۰۱

جدیدۃ السیاسۃ" نے اہل وطن کی تمناؤں، آرزوؤں اور خواہشوں کی ترجمانی کی، آزادیٔ نفس اور آزادیٔ وطن کی تعظیم و توقیر کی۔ قوم کو وحدت و یگانگت کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین، محمود عزمی، سید کامل، عبدالقادر المازنی، عبدالعزیز البشری اور عبداللہ العنان جیسی مایۂ ناز شخصیات اس میں مقالہ نگاری کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اخبار" الجریدۃ" کے اسلوب و اندازِ بیان سے واقف اور اس کے حامل تھے۔

اس وقت اس کی مقبولیت و شہرت میں کمی واقع ہوئی جب وہ قوم کے مسائل کو مرکزِ گفتگو بنانے اور اہلِ وطن کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھنے کے بجائے زیادہ تر دستور پارٹی کی مدح و ستائش کرنے لگا اور وفد پارٹی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

مجموعی طور پر اس اخبار نے صحافتی ذمہ داریاں ادا کیں اور فن کے مقاصد کو ملحوظِ خاطر رکھا اس کا اسلوب و اندازِ بیان بھی نہایت پیارا تھا اور قوم و وطن کے جذبات و خواہشات کی ترجمانی بھی کرتا تھا۔ اس میں بعض خامیاں بھی تھیں جو صحافت کے منافی تھیں۔

۲۸ جنوری ۱۹۲۳ء میں عبدالقادر حمزہ کی ادارت میں اخبار" البلاغ" نکلا۔ یہ اخبار چار صفحات پر مشتمل ہوتا اور ہر صفحہ میں چھ کالم ہوتے۔ چند مہینہ کے بعد چھ صفحوں میں نکلنے لگا۔ بعد میں آٹھ صفحات کا ہو گیا۔ فرنٹ صفحہ پر قوم کے لیڈر سید زغلول کا قول" یعجبنی الصدق فی القول والاخلاص فی العمل وانہ تقوم المحبتی بین الناس مقام القانون" لکھا ہوتا۔

اس اخبار میں خاص طور پر سیاسی مسائل کا تذکرہ ہوتا اور مصر کی سیاسی صورتِ حال پر تفصیلی بحث ہوتی اور مصری سیاست سے متعلق بعض کتابوں سے اقتباسات بھی شائع ہوتے۔

عباس محمود عقاد اور" کوکب الشرق" کے ایڈیٹر حافظ عوض جیسے علماء و ادباء کے مضامین شائع ہوتے۔ اس میں عقاد کو غیر معمولی مقام حاصل تھا چنانچہ ان کا مقالہ اخبار کے صفحۂ اول پر شائع ہوتا۔ ان کے اکثر مضامین سیاسی امور سے متعلق ہوتے تھے۔ وہ اس کی ادارت اور تزئین و تحسین میں عبدالقادر حمزہ کے ساتھ رہے۔ مورخین نے اس کی ادارت میں دونو کا تذکرہ کیا ہے۔

اس میں سینوت حنا کا قسط وار مضمون" الوطنیۃ دیننا والاستقلال حیاتنا" کے زیرِ عنوان

شائع ہوتا تھا۔ اُن کے ماسوا قندیل رحمانی، عبدالمجید نافع، عزیز مرہم، عبدالحمید سعید، محمد غالب مہندس، محمد احمد العوامری اور توفیق دیاب کے مضامین بھی شائع ہوتے۔ علی عبدالرزاق کی کتاب "الاسلام و اصول الحکم" کے جواب میں مختلف مضامین شائع ہوتے اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "فی الادب الجاہلی" کے رد میں مقالے لکھے جاتے۔

اخبار "البلاغ" نے قوم و وطن کی آزادی اور سیاسی و سماجی برتری کے لئے اہم کارنامے انجام دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ وفد پارٹی کی تحریک آزادی شباب پر تھی، آزادیٔ وطن کے نعروں سے پوری وادی گونج رہی تھی۔ سعد زغلول کی شخصیت وطن کی آزادی اور استعماری طاقت سے نجات دلانے میں پیش پیش تھی۔ چنانچہ جب یہ اخبار نکلا اور آزادی کی صدا بلند کی تو وفد پارٹی خوشی و مسرت سے جھوم اٹھی اور عبدالقادر حمزہ کو مبارکباد پیش کی۔ خاص طور پر سعد زغلول نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ یہ اخبار ملک کی آزادی اور اہلِ وطن کی آرزوؤں و تمناؤں کی تکمیل کرے گا۔

چنانچہ اس اخبار نے قوم و ملک کی سربلندی اور سرخروئی کے لئے آواز اٹھائی، عدل و انصاف کا نعرہ بلند کیا، سیاسی و سماجی مساوات کا علم اونچا کیا۔ اور ملک کو انگریزی استعمار سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اہلِ وطن کو آزادی کی اہمیت و حقیقت سے روشناس کیا۔ اخبار کی اس قدر حب الوطنی اور آزادیٔ قوم سے لگاؤ کو دیکھ کر انگریز خوفزدہ ہوگئے اور اس کو بند کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۶ر مارچ ۱۹۲۳ء میں اس کے اجراء پر پابندی لگ گئی۔ ۸ر جولائی کو دوبارہ نکلنا شروع ہوا۔ پھر بھی اس نے اپنے مشن اور نصب العین کو باقی رکھا اور قوم و ملت کے ترجمان اور آرگن کی حیثیت سے اہلِ وطن کی آزادی کے لئے کوشاں رہا۔

۱۵ر ستمبر ۱۹۲۸ء میں دوبارہ اس پر پابندی عائد ہوگئی۔ اس کے بعد پھر سہ بارہ نکلا اور اپنے مشن کو انجام دیتا رہا۔ بالآخر ۱۵ر جون ۱۹۳۰ء کو ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

۱۹۲۵ء میں امین الرافعی نے "اللواء المصری والاخبار" کے نام سے ایک جریدہ اور نکالا۔ یہ اخبار "اللواء" اور "الاخبار" دونوں اخبار کی بہترین ترجمانی کرتا۔ اس کے پہلے صفحہ پر "صحیفۃ الحزب الوطنی" لکھا

ہوتا اور اس کے نیچے مصطفیٰ کامل کا قول "ان من یتساہل فی حقوق بلادہ ولو مرۃ واحدۃ یبقی ابدا لہ متزعزع العقیدۃ سقیم الیمان" درج ہوتا ٹھیک اس کے نیچے "اننا نعرف کیف نصبر علی المکارہ، ولکننا لا نعرف التسلیم لاعدائنا والتنازل من مطالبنا" جیسا زریں کلام ہوتا۔

یہ چھ صفحات پر مشتمل تھا جس میں علمی ادبی فنی، سماجی اور سیاسی مباحث ہوتے اس نے مصر کی سیاسی حالت کو سانچا ر مناسب بنانے میں اہل وطن کی غیر معمولی خدمت کی اس میں رافعی کا مقالہ "العقائد السیاسیہ الیوم" کے عنوان سے شائع ہوتا جس میں ملک کی سیاسی صورت حال کی پستی و غلامی کا نہایت جامع انداز میں تجزیہ کرتے۔ رافعی واضح انداز میں کہتے کہ جس طرح اہل اسلام کے لئے مذہبی عقیدہ لازم ہے اسی طرح سیاسی عقیدہ بھی ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"العقیدۃ السیاسیۃ للمرء تشبہ العقیدۃ الدینیۃ فی کثیر من الوجوہ واہم اوجہ الشبہ ان صاحب العقیدۃ الثابتۃ فی کلتا الحالتین یلاصنوف المتاعب فی سبیل التمسک بعقیدتہ والاحتفاظ بہا وعدم مخالفتہ لتعالیمہا الصحیحۃ۔

وکلما ضعف شان العقیدۃ فی وسط من الاوساط او زمن من الازمان، اصبح موقف اصحاب العقائد الثابتۃ صعبًا وعملہم شاقا، واذا کان من الثابت، ان القابض علی دینہ یاتی علیہ یوم یکون فیہ کالقابض علی الجمر، فان القابض علی عقیدتہ السیاسیۃ لابد ان یقع فی مثل ہذہ المحنۃ ای لابد ان یصطدم فی طریق جہادہ بکثیر من العقاب، وان تصادفہ طائفۃ من الاھوال والارزاء، وان یتنزل بہ مختلف النکبات والکارثات"[1]

الغرض اس اخبار نے اہل وطن کے اندر جذبۂ آزادی اور اسلامی روح پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اور قوم وملک کی عظیم خدمت کی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عربی صحافت نے وادیٔ نیل میں قدم رکھتے ہی جس برق رفتاری کے ساتھ ترقی و شہرت حاصل کی اور اہل وطن نے جس قسم کے انہماک و دلچسپی کا اظہار کیا اپنی مثال آپ ہے، مصر کی عربی صحافت اپنے کمال وجمال کے اعتبار سے تمام اسلامی ممالک سے فائق تر ہے اور نہایت کم مدت میں ارتقاء کے اس مقام پر پہنچ گئی کہ فن کے اعتبار سے مغرب کی صحافت سے مقابلہ کرنے لگی اور انگشت جرائد ورسائل منظر عام پر آئے۔*

[1] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر۔ ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ ج ۷ ص ۱۵۱ -

کتابیات

(۱) ادب المقالة الصحفية في مصر — ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ — دار الفکر العربی ۱۹۵۷ء

(۲) اسرار الصحافة — محمد السید شوشہ — دار المعارف مصر

(۳) اعلام الصحافة العربية — ڈاکٹر ابراہیم عبدہ — المطبعة النموذجية

(۴) تاریخ آداب اللغة العربية (ج ۴) — ڈاکٹر جرجی زیدان — مطبعة الهلال ۱۹۳۵ء

(۵) تاریخ الترجمة والحركة الثقافية في عصر محمد علی — ڈاکٹر جمال الدین الشیال — مطبعة الاعتماد بمصر ۱۹۵۱ء

(۶) تاریخ التعلیم في عصر محمد علی — احمد عزت عبدالکریم — مکتبة النهضة المصرية ۱۹۳۸ء

(۷) تاریخ الحركة القومية — عبدالرحمن الرافعی بک — مکتبة السعادة بمصر ۱۹۵۱ء

(۸) تاریخ الصحافة العربية (نشأتها وتطورها) — ادیب ابو صفلی — دار الکاتب العربی ۱۹۳۸ء

(۹) تاریخ الصحافة العربية — فیلیپ دی طرازی — المطبعة الادبية بیروت ۱۹۱۳ء

(۱۰) تراجم مشاهير الشرق في القرن التاسع عشر — ڈاکٹر جرجی زیدان — مطبعة الهلال بمصر ۱۹۲۲ء

(۱۱) زعماء الاصلاح في العصر الحديث — ڈاکٹر احمد امین — مکتبة النهضة المصرية ۱۹۴۸ء

(۱۲) شارع الصحافة — ی۔ شاہین — دار المعارف

(۱۳) الصحافة "حرفة ورسالة" — سلامہ موسیٰ — قاہرہ ۱۹۶۳ء

(۱۴) الصحافة المصرية في مائة عام — ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ — الادارة العامة للثقافة

(۱۵) الصحافة والادب — " " — ۱۹۵۵ء

(۱۶) عصر محمد علی — عبدالرحمن الرافعی بک — مطبعة النهضة المصرية ۱۹۵۱ء

(۱۷) في الادب الحديث — عمر الدسوقی — بیروت ۱۹۶۶ء

(۱۸) فن الصحافة — رفیق المقدسی — الفن الحديث العالمي

(۱۹) مستقبل الثقافة في مصر — ڈاکٹر طہ حسین — مصر ۱۹۴۴ء

(۲۰) مستقبل الصحافة في مصر — ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ — دار الفکر العربی ۱۹۵۷ء

(۲۱) مصر کی عربی صحافت — ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی — گلی قاسم جان ۱۹۸۹ء

وزیر مملکت برائے ٹکسٹائلس
حکومت ہند
نئی دہلی

[illegible]
भारत
नई दिल्ली-110011
MINISTER OF STATE FOR TEXTILES
INDIA
NEW DELHI-110011

مورخہ 19/ دسمبر 1988

محترمی ، سلام و رحمت

آپ کا خط ملا ۔ شکریہ ۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کی جانب سے میں حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانیؒ کی شخصیت سے متعلق سیمینار میں انشاء اللہ 21/ جنوری 1989 کو پہلی نشست میں، غالب اکیڈمی ، نئی دہلی میں شرکت کروں گا ۔

امید کہ مزاج بخیر ہوں گے ۔

مخلص

رفیق عالم

Mr. Amidur-Rahman Usmani,
General Manager,
Nadwatul Musannifin,
Maktaba Burhan,
4136 Urdu Bazar, Jama Masjid,
Delhi-110006

برہان دہلی

NIAZ AHMAD

अतिरिक्त निजी सचिव
पर्यावरण एवं वन मंत्री
लोदी रोड, नई दिल्ली-११०००३
ADDITIONAL PRIVATE SECRETARY
MINISTER FOR ENVIRONMENT & FORESTS
PARYAVARAN BHAWAN, CGO COMPLEX
LODI ROAD, NEW DELHI-110003

۱۴ جنوری ۸۹ء

محترم عمید الرحمٰن صاحب - السلام مسنون!

آپکا عنایت کردہ نوازش نامہ ہمارے وزیر محترم جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب کو دستیاب ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ مولانا مجھے یہ عرض کرنے کی ہدایت ہوئی کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں آپ حضرات مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۸۹ء کو جو سیمینار منعقد فرما رہے ہیں ان شاء اللہ وزیر موصوف اسمیں شرکت فرمائیں گے۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند
نیاز احمد

Mr. Ameedur-Rehman Usmani
Editor Monthly "BURHAN."
4136, Urdu Bazar
Jama Masjid, DELHI-110006

Dear Shri Usmani,

Thank you very much for your invitation requesting me to join you on the occasion of celebrating a one day seminar on 21st January, 1989 in the memory of Mufikkere-e-Millat, Late Hazarat Maulana Mufti Atique Rehman Usmani, a personality of international fame at Ghalib Academy, Nizamuddin, New Delhi.

I very sincerely regret my inability to join you on this occasion due to pre-engagements. However, I wish a success of the seminar

With regards,

Yours sincerely,

(MAHINDER SINGH SATHI)

Sh. Amidur-Rahman Usmani,
4136, Urdu Bazar,
Jama Masjid,
Delhi-110006

November December 1991 Phone : 3262815

Regd. No. D (DN) 74 R. No. 965-57

Subs. 66/- Per Copy Rs 20/-

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006